مہم جوئی، حیرت ناک اور پُراسرار واقعات سے لبریز کہانیوں کا مجموعہ
مقدس عہد
ایم اے راحت

فہرست

اسے اپنی موت کا شدت سے انتظار تھا۔

اس نے کسی سے ایک عہد کیا تھا......مقدس عہد۔

اس عہد کی وجہ سے دنیا اس پر آسان ہوگئی مگر......

ایک پُراسرار اور حیرت انگیز کہانی۔

احسان علی کی کمر ٹوٹ گئی۔ زندگی بھر کی کمائی گھڑیوں میں لٹی جارہی تھی اور وہ اس کمائی کو لٹنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ بیوی اور بیٹی کی بھی بری حالت تھی۔ دونوں نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن منصور کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی تھی۔ اس کے بے ہنگم قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے۔

"میری مانو احسان بھیا تو چُولیں نکال کر دروازہ اتار لو اپنی جان کو کچھ کر بیٹھا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" کرم خان نے ہمدردی سے احسان علی کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اس ہمدردی سے احسان علی کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور وہ کرم خان کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

"کچھ کرو بھیا۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔ میرے تو جسم سے جان نکل گئی ہے۔ میری تو آنکھوں کی روشنی چھن گئی ہے بھیا' میں نے زندگی میں کبھی سُکھ نہیں دیکھا۔ سُکھ کے خواب ضرور دیکھے تھے لیکن ان خوابوں کی تعبیر بھیانک دیکھی ہے بھیا۔" احسان علی سسکتا رہا اور کرم خان اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دیتا رہا۔ پھر وہ نوجوان لڑکوں کو کواڑوں کی چُولیں نکالنے کی ہدایت دینے لگا اور لڑکے مستعد ہوگئے۔ محلے بھر کے بچے' عورتیں اور لڑکیاں جمع تھیں۔ اپنی ہمدردی ذہانت اور مستعدی دکھانے کا بہترین موقع تھا۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی مہارت سے دونوں کواڑ نکال کر ایک طرف رکھ دیئے۔

احسان علی کمرے کی طرف دوڑا لیکن کرم خان نے اسے روک لیا۔ نہ جانے احسان علی کی بدحواسی کیا کردیتی۔ کرم خان اسے دوسرے بزرگوں کے حوالے کرکے خود کمرے کی طرف بڑھا اور اندر داخل ہوگیا۔ منصور اپنی چھوٹی سی پرانی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل تھی اور سامنے کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔

"آؤ چاچا۔ دیکھو بلتاریوں کو شکست ہوگئی۔ میں نے ایسا نقشۂ جنگ ترتیب دیا تھا کہ ان کے فرار کے راستے ہی مسدود ہوگئے۔ دیکھو چاچا۔ بلتاریوں کی بے کسی کی موت دیکھو۔ یہ وہی ظالم بلتاری ہیں جو ظلم کے دیوتا کہلاتے تھے۔ جنھوں نے ظلم خانے بنا رکھے تھے۔ ایسے ظلم خانے جہاں جہنم کے فرشتے بھی کان پکڑتے تھے۔ ان ظلم خانوں کے تصور سے روحیں سلب ہوجاتی تھیں۔ ہاہاہا۔ چاچا' بلتاری اس تصور کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوئے تھے کہ اپنی کثرت سے ہمیں پیس ڈالیں گے۔ تم نے بلتاریوں کا مکتوب پڑھا تھا چاچا تم نے ان کے مغرور قاصد کو دیکھا تھا' کیسے سینہ اکڑا اکڑا کر کہہ رہا تھا کہ آکاشیہ کے باشندو! تم نے بلتاریہ کے ظلم خانوں کے متعلق سنا ہوگا ڈرو ان کے تصور سے' ڈرو تاغان کے غصے سے اور بلتاریہ کی اطاعت قبول کرلو۔ اپنی حسین لڑکیاں انہیں پیش کرو۔ اپنا مال و زر ان کے سامنے ڈال دو۔ ممکن ہے تاغان تم سے خوش ہو کر تمہیں معاف کردے۔ اور پھر دربار کے ایک جیالے سے برداشت نہ ہوسکا۔ اس کی تیز دھار تلوار نے بلتاریہ کے قاصد کا سر اس کے جسم سے پندرہ فٹ دور اچھال دیا۔

اور تاغان اپنی پوری قوت لے کر چڑھ دوڑا لیکن چاچا میں نے نقشۂ جنگ ترتیب دیا ہے۔ اب دیکھو کیا ایک بھی بلتاری زندہ واپس جاسکتا ہے۔ ہاہاہا' تاغان کو دیکھو چاچا' یہ وہی مغرور سردار ہے جس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں آئی دیکھو' کیسا لاشوں کے نیچے چھپتا پھر رہا ہے۔"

"منصور' منصور بیٹا' کیا کہہ رہے ہو' ہوش میں آؤ۔" کرم خان نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لیکن وہ کن اکھیوں سے میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ اور لوہے کے اسکیل کو بھی دیکھ رہے تھے اور منصور کے ہاتھ پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ پاگل کا کہاں بھروسہ ہوسکتا ہے۔ پیپر ویٹ کھینچ کر ان پر دے مارے وہ یا اسکیل اٹھا کر ہی ان پر پل پڑے۔

"منصور۔ منصور۔ کون منصور۔ ہاں میں منصور ہوں۔ مجھے ہی بلتاریوں پر نصرت حاصل ہوئی ہے۔ شکریہ چاچا۔ میں کس قابل ہوں۔ وہ ظالم تھے۔ انہیں ظلم کی سزا ملی یہ سزا قدرت نے میرے ہاتھوں مقرر کی تھی۔" منصور نے کہا۔

"اٹھو۔ آؤ باہر آؤ......... دیکھو تمہارے باپ کی کیا حالت ہے۔ بیٹے ہوش میں

آؤ۔ کیا کہہ رہے ہو۔ آؤ بیٹے۔" کرم خان کی ہمت کچھ اور بڑھی تو اس نے منصور کا بازو پکڑ لیا اور تھوڑی سی طاقت لگانے سے منصور اٹھ گیا۔ اس کے حسین چہرے پر وحشت بکھری ہوئی تھی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ محلے کی چند ضعیف الاعتقاد عورتیں تو اس کی شکل دیکھتے ہی کھسک گئیں۔ ان کے خیال میں منصور پر سایہ ہوگیا تھا اور ایسی شکل میں اس کے سامنے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ ممکن ہے منصور کے کرم فرما ان میں سے کسی کو پسند کرلیں۔

"منصور' منصور میرے لعل کیا ہوگیا تجھے۔" منصور کی ماں اس کی طرف جھپٹی اور اسے بانہوں میں لے لیا۔

"بھائی جان!" اس کی بہن بلک کر بولی اور منصور ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دوسرے لوگوں کو دیکھا اور پُرمسرت لہجے میں بولا۔

"اوہ۔ شاید تم لوگ مجھے مبارک باد دینے آئے ہو۔ شاید تم میرا جلوس نکالنا چاہتے ہو لیکن افسوس کہ میں تمہاری خواہش پوری نہیں کرسکتا۔ مجھے نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے۔ بلتاریوں کی قسمت میں تباہی تھی سو وہ ان پر نازل ہوگئی۔ حالانکہ میں ان بیواؤں کے لئے مغموم ہوں جن کے سہاگ اجڑ گئے۔ میں ان بچوں کے لئے رنجیدہ ہوں جو یتیم ہوگئے لیکن ان بلتاریوں کے لئے سزا ناگزیر تھی۔ وہ ظالم تھے۔" منصور نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوش میں آ منصور۔ ہوش میں آ منصور۔ کیا کہہ رہا ہے......... ہماری دنیا برباد نہ کر۔ ہوش میں آ بیٹے۔" احسان علی نے رندھی آواز میں کہا۔

"تم سب بلتاریوں کے ستائے ہوئے معلوم ہوتے ہو لیکن ظلم اب مٹ چکا ہے جو کچھ گذر گیا ہے اس پر صبر کرو میں شہنشاہ سے کہہ کر تمہارے غموں کا مداوا کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں آپ سب کے لئے وظیفے جاری کرا دوں گا تاکہ تم لوگوں کو زندگی گذارنے میں دقت نہ ہو۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"جاؤ بھیا۔ سب لوگ جاؤ اور آرام کرنے دو۔ ماں باپ کو اپنا غم ظاہر کرنے دو۔ ممکن ہے اللہ کرم کردے۔" کرم خان نے دوسرے لوگوں سے کہا اور سب ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ احسان علی کے لئے پورا محلہ مغموم تھا۔ سب اس کے بڑھاپے کے

سہارے کی صحت یابی کی دعا کر رہے تھے۔

احسان علی بوڑھا ہوچکا تھا۔ پوری عمر کی کمائی دو بچے تھے ایک لڑکا ایک لڑکی۔ احسان علی پوسٹ مین تھا۔ زندگی کا طویل عرصہ خط اور منی آرڈر بانٹتے گزرا تھا۔ دال چٹنی میں عمر گزری تھی اس کی بیوی سلائی کرتی تھی اور منصور اس کا واحد سہارا تھا۔ بڑھاپے کے لئے ایک ہی کمائی تھی اور وہ تھا منصور۔ احسان علی کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے منصور اور لبنٰی کو کس طرح تعلیم دلائی تھی۔ منصور بی۔ اے کرچکا تھا اور لبنٰی کو میٹرک کے بعد اسکول سے اٹھالیا تھا۔ لڑکی ذات کو زیادہ تعلیم دلانا احسان علی کے بس کی بات نہ تھی۔ لوگوں کی انگلیوں کو کون روک سکتا ہے اور اب سب کی نگاہیں منصور کی طرف تھیں۔

منصور شروع ہی سے سنجیدہ اور کم گو تھا۔ وہ خاموش رہتا تھا اور نوجوانوں کی سی کوئی بات اس میں نہیں تھی۔ قصبہ سے میٹرک کرکے وہ شہر چلا آیا تھا اور وہیں اس نے بی اے کیا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے احسان علی سے کہہ دیا کہ وہ اب زیادہ نہیں پڑھنا چاہتا کیونکہ بہن جوان ہوچکی ہے۔ اس کی شادی کے لئے دولت کی ضرورت ہے اور وہ اپنا مستقبل بنانے کے لئے بہن کی زندگی نہیں برباد کرسکتا۔

اس کی اس بات سے احسان علی کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اسے اپنی پشت پر ایک دیوار کا احساس ہوا تھا اور اس کی جھک جانے والی کمر پھر سیدھی ہوگئی تھی۔ آخر اس کا سہارا قدم جما چکا تھا۔ چنانچہ منصور نے ملازمت کی جدوجہد شروع کردی لیکن ملازمت کی تلاش میں اسے دانتوں پسینے آگئے۔ اسے احساس ہوا کہ تعلیم حاصل کرنے کے چکر میں زندگی کے قیمتی سال گنوا کر اس نے دنیا کی بدترین غلطی کی ہے۔ اس نے اپنی ماں اور باپ کو تکلیف دے کر ان پر ظلم کیا تھا۔ جب بی۔ اے کرنے کے بعد ملازمت نہیں ملنی تھی تو بی اے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ ابتدا سے ہی باپ کے ساتھ کام پر لگ جاتا کم از کم پوسٹ مین تو بن ہی سکتا تھا اور دوہری تنخواہ اب تک بہن کے جہیز کا بندوبست تو کرہی سکتی تھی۔

وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہا اور اپنی ناکامی کے بارے میں والدین کو نہیں بتاتا تھا۔ وہ ان سے شرمندہ تھا۔ کس منہ سے ان سے کہے کہ انہوں نے جس امید پر تکلیفیں اٹھائی

تھیں۔ وہ سراب تھیں ڈگریاں دولت نہیں اگلتیں' ہاں انسان کے غم بڑھا دیتی ہیں۔ جاہل انسان اپنی بساط کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے جبکہ تعلیم غم کے احساس کو شدید کردیتی ہے۔ وہ ملازمت کے لئے بھٹکتا رہا قصبے سے شہر آگیا اور پھر شہر شہر گھومتا رہا لیکن بے مقصد بے سود۔ ملازمت اس کے لئے نہیں تھی۔ نہ جانے اس نے کتنے فاقے کئے۔ نہ جانے کہاں کہاں گیا اور اب صرف ایک دن قبل وہ قصبہ واپس آیا تھا۔ ناکامیاں اس کی پیشانی پر تحریر تھیں۔ ماں باپ نے وہ تحریر پڑھ لی اور اسے تسلیاں دینے لگے۔ باپ نے کہا کہ وہ فکر نہ کرے ابھی کچھ اور آزمائش باقی ہے۔ وقت پورا ہونے پر بگڑے کام خودبخود بنتے چلے جائیں گے لیکن اس بار منصور کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ دودھ جیسا چہرہ زرد تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے اور زبان خاموش تھی۔ اس نے کسی سے ایک لفظ نہ کہا۔ ہاں بہن نے تنہائی میں اسے بڑبڑاتے ضرور سنا' لیکن وہ کیا الفاظ تھے' اس کی سمجھ میں نہ آسکے تھے۔

شام کو اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا اور سرِ شام ہی سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماں اور باپ کو بیٹے کی پریشانی کا احساس تھا لیکن وہ بھی مجبور تھے کیا کرتے۔ نہ جانے کتنی رات گئے تک وہ دونوں خاموشی سے دعا کرتے رہے۔ گاڑی جس طرح چل رہی تھی ٹھیک تھی' لیکن بیٹے کی پریشانی نے ان کے لئے نئی الجھن پیدا کردی تھی۔

اور پھر صبح کو جب کافی دن چڑھ آیا تب بھی منصور نہیں جاگا۔ لبنٰی نے اسے جگانے کے لئے پوچھا تو ماں نے کہہ دیا کہ سونے دے بیٹی' ممکن ہے وہ بھی پریشانی کی وجہ سے رات کو دیر سے سویا ہوگا اور اس وقت گہری نیند میں ہو۔ سورج چڑھتا رہا اور جب زیادہ دیر ہوگئی تو ان لوگوں کو تشویش ہونے لگی۔

اتوار کا دن تھا' احسان علی کو بھی پوسٹ آفس نہیں جانا تھا۔ اس لئے وہ بھی گھر میں تھا جب زیادہ دیر گزر گئی تو وہی بیٹے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے منصور کو آوازیں دیں تو اندر سے آواز سنائی دی۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ اس وقت میں کسی سے نہیں مل سکتا بلتاریوں کے لشکر نے آخر یورش کردی۔ مجھے خطرہ تھا لیکن میں انہیں ایسا سبق دوں گا کہ رہتی دنیا تک یاد

رکھیں گے۔ میں نقشۂ جنگ ترتیب دے رہا ہوں' چلے جاؤ............ اس وقت چلے جاؤ۔"

احسان علی نے حیرت سے اس کی گفتگو سنی۔ منصور اور شرارت دو متضاد چیزیں تھیں۔ اس نے تو آج تک ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ پھر یہ الفاظ.......... احسان علی کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس نے واپس آکر بیوی کو ماجرا سنایا اور وہ پریشان ہوگئی۔

"الٰہی خیر۔ کیا کہہ رہے ہو؟" پھر دونوں ہانپتے کانپتے دوبارہ منصور کے دروازے پر پہنچے تب انہوں نے منصور کا قہقہہ سنا اور پھر مسلسل قہقہے۔

"میں فتح کا جشن منا رہا ہوں۔ میں نے بلتاریوں کو عبرت ناک شکست دی ہے۔ جاؤ تم بھی جشن مناؤ۔" قہقہوں کے دوران اس کی آواز سنائی دی اور ماں دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ باپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ ہوش کی باتیں تو نہیں تھیں۔ ضرور منصور کے دماغ پر اثر ہوگیا تھا اور اس روح فرسا تصور سے ان کے حواس گنگ ہوگئے تھے اور پھر وہ دروازہ پیٹتے رہے۔ روتے رہے' چلاتے رہے اور منصور کے قہقہے گونجتے رہے۔ اس کے بعد پورا محلہ اکٹھا ہوگیا اور اب بمشکل تمام منصور کو اس کے کمرے سے باہر نکالا گیا تھا۔

محلے کے لوگ جاچکے۔ کرم خان چونکہ بالکل برابر والے مکان میں رہتا تھا۔ احسان علی کے اس سے تیس سال پرانے تعلقات تھے۔ اس لئے وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے احسان علی کو ڈھارس دینے کے لئے وہ رک گیا۔ منصور اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"الٰہی میرے بچے پر رحم کر۔" ماں نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

"بتاؤ کرم بھیا! میں کیا کروں۔ میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔ میرے بڑھاپے کی لکڑی ٹوٹ گئی۔ بتاؤ اب میں کس کے سہارے بڑھاپا گزار دوں۔" احسان علی روتے ہوئے بولا۔

"خدا سے مایوس نہ ہو احسان علی! وہ ضرور رحم کرے گا۔ اس کی دل جوئی کرو۔ اگر روتے پیٹتے رہے تو اس کے ذہن پر اور بار ہوگا۔ میرا خیال ہے پریشانیوں کی وجہ سے دماغ الٹ گیا ہے۔" کرم خان نے کہا اور منصور کو سہارا دے کر اندر لے گیا۔ پھر انہوں نے اسے چارپائی پر لٹایا اور اس کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔

"منصور۔" باپ نے اسے پکارا اور منصور نے وحشت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کیا بات ہے فریادی!"

"میں تمہارا باپ ہوں بیٹے! ہوش میں آؤ۔ دیکھو تمہاری بہن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ تمہاری ماں پریشان ہے۔ کسی بات کی فکر نہ کرو بیٹے' پریشانیاں تو وقتی ہوتی ہیں۔ انسان اگر مضبوط عزم رکھے تو پریشانیوں کے بادل خود بخود چھٹ جاتے ہیں۔"

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں محترم بزرگ۔ مجھے ان دونوں خواتین سے بھی ہمدردی ہے۔ آپ کا کہنا درست ہے' شہنشاہ کا خیال تھا کہ بلتاری ہماری سلطنت کو تہس نہس کردیں گے لیکن اولوالعزمی کی اس سے شاندار مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ بالآخر ہم نے ان پر فتح حاصل کرلی۔" منصور نے کہا۔

اور احسان علی کرم خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہ جانے یہ بلتاریہ کیا بلا ہے۔ آخر یہ اس کے ذہن پر کیوں سوار ہے۔" کرم خان نے کہا۔

"آپ بلتاریہ سے واقف نہیں ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ خیر ایک دن میں بتاؤں گا کہ بلتاریہ کیا ہے اور آکاشیہ کی دلیر فوجیں دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی ہیں اور ناچیز ان فوجوں کا سردار ہے۔ میری ہی رہنمائی میں آکاشیہ کے نوجوانوں نے بلتاریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور آپ آکاشیہ کو نہیں جانتے.......... ہونہہ۔" اس نے حقارت سے ہونٹ سکوڑ لئے۔

کرم خان جھینپتے ہوئے انداز میں احسان علی کی طرف دیکھنے لگا۔ احسان علی نے کہا۔

"بتاؤ کرم بھیا' اب میں کیا کروں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میرے پاس تو اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ اسے کسی اچھے ہسپتال میں داخل کرادوں۔"

"بھیا تم اسے شہر لے جاؤ۔ فکر مت کرو۔ میرے پاس جو کچھ ہے تمہارا ہے۔ بچی اور بھابی کی دیکھ بھال میں کروں گا۔ میرے پاس دو سو روپے موجود ہیں۔ وہ لے جاؤ۔ جاؤ بھیا خدا کے بھروسے پر جاؤ۔ خدا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔"

"میں تمہاری پائی پائی چکادوں گا کرم بھیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو احسان علی۔ ہماری دوستی تیس سال پرانی ہے۔ کیا دوستوں کا بھی ایک دوسرے پر احسان ہوتا ہے۔ کیا میرا بیٹا بیمار ہوتا تو تم اپنا سب کچھ مجھے نہ دے

دیتے۔" کرم خان نے کہا اور احسان علی اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

احسان علی کی خوش قسمتی تھی ہسپتال میں اسے ڈاکٹر راشد مل گیا۔ ڈاکٹر راشد منصور کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ جنرل وارڈ کے ایک بستر پر اس نے منصور کو پڑے دیکھا اور چونک پڑا۔ یہ لاوارث مریض اس کا گہرا دوست تھا۔ اس کا سب سے پیارا ساتھی، سنجیدہ اور متین کالج کا ذہین ترین طالب علم۔ راشد اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ گو حالات نے ایک طویل عرصہ تک ان دونوں کو جدا رکھا تھا لیکن راشد آج تک منصور کو نہیں بھول سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی منصور کو دیکھا، فوراً پہچان لیا۔ منصور اس وقت سو رہا تھا۔

"یہ مریض کب آیا ہے؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"چار روز ہو گئے ہیں جناب؟"

"کیا بات ہے چارٹ دکھاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا اور نرس نے منصور کا چارٹ اس کے حوالے کر دیا۔ راشد بغور چارٹ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ پھر اس کے منہ سے بڑبڑاتی آواز میں نکلا۔

"تو میرا خیال درست تھا۔ میری پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔"

"جی؟" نرس نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کے ساتھ کوئی شخص ہے؟" اس نے نرس کی بات کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

"ہاں۔ اس کا باپ ہے۔"

"اوہ کہاں ہے؟" راشد نے بے قراری سے پوچھا۔

اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

"بلاؤں جناب۔ باہر گھاس پر ہوگا۔ یہ وقت مریضوں کے پاس رہنے کا نہیں ہے۔"

"نہیں، مجھے اس کے پاس لے چلو۔ یہ میرا عزیز دوست ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں نرس یہ کیسا انسان تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی کہ اگر یہ کوئی بہت بڑا انسان نہ بن سکا تو پاگل ضرور ہو جائے گا۔" راشد نے کہا اور نرس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہسپتال کے لان میں آگئی اور پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک ضعیف انسان ایک درخت کے نیچے سجدے میں پڑا تھا۔ راشد اس کے پاس پہنچ گیا

اور جب ضعیف انسان سجدے سے اٹھا تو راشد نے اسے سلام کیا۔

"اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے بیٹے۔ میرا خیال ہے آپ ڈاکٹر ہیں۔"

"آپ منصور کے والد ہیں؟" راشد نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے، میں ہی وہ بدنصیب انسان ہوں۔"

"میں بھی آپ کا بیٹا ہوں جناب۔ میں منصور کا دوست ہوں، اس کے ساتھ کالج میں پڑھ چکا ہوں۔ میری بدقسمتی تھی کہ میں چند روز کی رخصت پر تھا ورنہ آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔ میں یہاں ڈاکٹر ہوں۔ میرا نام راشد ہے۔"

"راشد!" ضعیف آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "راشد میرے بیٹے کو بچالو۔ اپنے دوست کو بچالو۔ میں ایک غریب انسان ہوں۔ بیٹے ایک ضعیف باپ کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میری دعائیں لے لو بیٹے۔ ایک خاندان پر تمہارا احسان ہوگا۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں بزرگ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ منصور میرا دوست ہے۔ پھر آپ پر احسان کیسا۔ مجھے تھوڑی دیر اجازت دیں۔ میں اسے جنرل وارڈ سے پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کرادوں۔ آپ بزرگ کو لے کر میرے دفتر میں جائیں۔"

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں ڈاکٹر راشد احسان علی سے گفتگو کر رہا تھا۔

"تب مجھے کہنے دیجئے محترم، کہ آپ اپنے بیٹے کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔"

"میں سمجھا نہیں راشد میاں!"

"منصور کی دوہری شخصیت کے بارے میں تو پورے کالج کو معلوم ہے۔ اکثر وہ ہفتوں خود کو آکاشیہ کی فوج کا سالار سمجھتا رہتا تھا۔ جس نے بلتاریہ کو شکست دی تھی لیکن پھر وہ خود بخود ٹھیک ہو جاتا تھا۔ میرا خیال ہے یہ دورہ بھی وقتی ہے میں نے بغور اس پر نگاہ رکھی ہے میرا خیال ہے یہ ان دنوں کچھ پریشان ہوگا۔"

"تم سے کیا چھپاؤں راشد میاں، میں پوسٹ مین ہوں۔ میری زندگی کی کمائی یہی بیٹا اور بیٹی ہیں۔ منصور میری امیدوں کا واحد سہارا تھا۔ بی اے کے بعد اس نے تعلیم چھوڑ دی اور ملازمت تلاش کرنے لگا لیکن چاروں طرف سے مایوسی ہوئی۔ اسے کوئی ملازمت

نہیں ملی۔ ہمارا خیال تھا کہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے اس کی دماغی حالت خراب ہوگئی ہے۔"

"گویا یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ پریشان تھا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ کئی دنوں تک کھویا کھویا رہتا اور پھر کسی صبح وہ خود کو آکاشیہ کا سالار بتاتا۔ میرا خیال ہے اس نے گھر میں اپنی اس کیفیت کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔"

"وہ بہت کم گو ہے بیٹے۔ اس نے زندگی میں صرف پریشانیاں دیکھی ہیں۔ اسے شدت سے اس بات کا دکھ ہے کہ اس کی زندگی سے اس کے والدین کو بہت تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹے۔ والدین تو ہوتے ہی تکلیف اٹھانے کے لئے ہیں۔ اس نے کبھی اپنی کیفیت کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"اس کی کیفیت ایسی اس وقت سے ہوئی.........." راشد پرُخیال لہجے میں بولا۔

"جب ہم کالج کی تین دن کی چھٹیوں میں راکاپور کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ منصور بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کھنڈرات سے کچھ دور ہمارا کیمپ لگا ہوا تھا۔ ہم سب ٹولیاں بنا کر سیر وتفریح کررہے تھے اور منصور حسبِ معمول تنہا تھا۔ اسے تنہائی بہت پسند تھی۔ پھر وہ تنہا ہی کسی طرف نکل گیا اور شام کو واپس نہ آیا۔ آدھی رات تک تمام لڑکے پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کرتے رہے پھر وہ صبح ان کھنڈرات میں گئے تو وہ ایک ٹوٹے چبوترے پر سو رہا تھا۔ ہم نے اسے جگایا تو وہ چونک کر اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگا جیسے کسی اجنبی دنیا میں آیا ہو۔ اس نے ہم میں سے کسی کو نہیں پہچانا تھا۔ دوسرے لڑکے اسے اس کا سنجیدہ مذاق سمجھتے رہے لیکن اس کی حالت بدلی ہوئی تھی۔ یہ کیفیت چند گھنٹے رہی۔ پھر وہ ٹھیک ہوگیا لیکن پورے چار دن کالج اٹینڈ نہ کرسکا۔ وہ کھویا کھویا سا تھا پھر ایک شام بہت کریدنے پر اس نے کہا۔

"میں کچھ بھول گیا ہوں راشد۔ میں نے کسی سے کوئی عہد کیا تھا ایک مقدس عہد لیکن میں ابھی تک وہ عہد پورا نہیں کرسکا۔ میں وہ وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے یا نہیں آتا۔ میں نے وہ وعدہ کس سے کیا تھا وہ کیا عہد تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ محترم میر اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ میں نے اس کی دل جوئی کی۔ اسے سیر وتفریح کرائی او آخر اس کی یہ کیفیت بھلانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر کئی ماہ تک وہ ٹھیک رہا۔ ایک شام د

پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ والد کا خط آیا ہے۔ مگر وہ جا نہیں سکتا۔ میں نے اسے کہا بھی کالج سے چھٹی لے کر چلا جائے لیکن بہت خود دار تھا۔ شاید اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لئے وہ جانے سے انکار کررہا تھا ہم اسے مجبور نہ کرسکے۔

"لیکن دوسرے دن وہ جب صبح کو اٹھا تو اس کی کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ اس نے پہلی بار کہا کہ وہ آکاشیہ کا نوجوان سپہ سالار ہے اور اس نے بلتاریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد سوگیا اور جب جاگا تو ٹھیک تھا۔" راشد نے بتایا اور احسان علی حیرت سے گفتگو سنتے رہے۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹے۔ اس کی یہ کیفیت وقتی ہو اور جب یہ جاگے تو ٹھیک ہوجائے۔ اس کے بغیر ہم سب اندھے ہوجائیں گے۔ میرے بچے ہم سب اندھے ہوجائیں گے۔ یہ تو ہماری آنکھوں کا نور ہے۔" احسان علی نے روتے ہوئے کہا اور راشد انہیں دلاسہ دینے لگا۔

"اسے مارفیا کے انجکشن دیئے گئے ہیں تاکہ یہ سوتا رہے آپ اسے آرام سے سونے دیں۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ میں بھی آپ کا منصور ہوں۔ میری موجودگی میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں اس کا بھرپور علاج کروں گا۔ آپ کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھائیں۔ اگر آپ نے کسی قسم کی تکلیف اٹھائی تو مجھے دکھ ہوگا۔ اور ہاں مجھے اپنے مکان کا پتہ دے دیں تاکہ خیریت کا تار ارسال کردوں۔" راشد نے کہا اور سادہ دل احسان علی نے سے گھر کا پتہ دے دیا۔

راشد نے دوسرے دن معقول رقم احسان علی کے بتائے ہوئے پتہ پر احسان علی کی طرف سے ارسال کردی۔ وہ بے حد ہمدرد انسان تھا اور قدرت نے اسے ایک حساس دل بخشا تھا۔ ایک ذہین ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس کی کافی شہرت تھی اور پرائیوٹ طور پر بھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔ گھر سے بھی آسودہ حال تھا اس لئے روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

احسان علی کو اس نے پیش کش کی کہ وہ اس کے گھر چل کر رہیں لیکن احسان علی نے کہا کہ وہ بیٹے کے پاس رہنا پسند کریں گے ویسے ان کا رواں رواں راشد کا احسان مند

تھا۔ منصور کی بہترین نگہداشت ہو رہی تھی۔ دو نرسیں اس پر تعینات تھیں اور راشد کے دوست ڈاکٹر پوری محنت اور توجہ سے اس کا علاج کر رہے تھے۔

اس شام منصور کی حالت بہتر تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی سنبھلی ہوئی حالت کے پیشِ نگاہ اسے مارفیا نہیں دیا اور وہ جاگ رہا تھا لیکن اس دوران اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ خاموش لیٹا رہتا تھا۔ اول تو اسے بے ہوش رکھا جاتا تھا۔ اگر ہوش آتا تو خاموشی اختیار کئے رہتا۔ راشد نے احسان علی سے بھی کہا تھا کہ اسے مخاطب نہ کریں۔ حالانکہ احسان علی کا دل تڑپتا رہا کہ اس سے گفتگو کریں۔ اس کی آواز سنیں لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت بھی پیشِ نگاہ تھی۔

اس وقت بھی وہ آنکھیں کھولے لیٹے ہوا تھا۔ اس کی نظریں چھت سے لگی ہوئی تھیں۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ نرس نے اس کی بہتر حالت دیکھی اور مسکراتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

"چائے پئیں گے مسٹر منصور۔" اس نے دلنواز آواز میں پوچھا اور احسان علی جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ منصور نے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"تم کون۔"

"میں نرس ہوں منصور صاحب کیسی طبیعت ہے؟"

"میرا نام الناش ہے۔ آکاشیہ کا باشندہ ہوں۔ ایک طویل عرصہ تک اپنی دنیا سے دور رہنے کے بعد وہ دنیا مجھے پھر یاد آ گئی ہے۔ میں اس دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ تم لوگ مجھے مریض نہ سمجھو۔ میں درست کہہ رہا ہوں۔ تمہاری دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مجھے میری دنیا میں جانے دو۔ میں نے آشیش کے معبد میں کسی سے عہد کیا تھا۔ ایک مقدس عہد۔ میں نے کہا تھا کہ میں واپس آؤں گا۔ میں ضرور واپس آؤں گا۔ نرگس سے چھلکتی ہوئی شبنم نے مجھے الوداع کہا تھا۔ مجھے ان آنسوؤں کی زبان پکار رہی ہے۔ میری راہ کے تمام پتھر ہٹا دو۔ مجھے میری دنیا میں جانے دو تمہاری دنیا میں' میں ایک ناکارہ روح ہوں جس کا کوئی مصرف نہیں ہے لیکن آکاشیہ کے لئے میں نے بہت سے کارنامے انجام دیئے تھے جن میں بلتاریوں کی شکست سرفہرست ہے۔ آکاشیہ کے لوگ مجھ سے محبت

کرتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں میں واپس چلا جانے دو میں یہاں مرجاؤں گا میں یہاں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔"

"منصور بیٹے۔ میرے بچے میں تیرا باپ ہوں۔ تُو کہاں جانا چاہتا ہے میرے لعل۔ اگر تُو چلا گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ تیری ماں رو رو کر اندھی ہو جائے گی۔ تیری بہن بے سہارا ہو جائے گی۔ میری بوڑھی ہڈیاں کب تک جوان لڑکی کا بوجھ اٹھائیں گی۔ ہوش میں آجا میرے بچے تُو ہم سب کی امید ہے۔" احسان علی نے دل سوز لہجے میں کہا اور نرس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

منصور نے گردن گھما کر احسان علی کی طرف دیکھا۔ چند منٹ دیکھتا رہا پھر بولا۔

"میں آپ کو نہیں جانتا محترم بزرگ! تاہم آپ میرے لئے باعثِ عزت ہیں میں نے بزرگوں کی ہمیشہ عزت کی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لئے جو کچھ ہو سکا' ضرور کروں گا لیکن مجھے میری دنیا میں واپس جانے دیں مجھے اپنی دنیا سے بے حد محبت ہے.......... میری روح پیاسی ہے۔ میں جنم جنم کا پیاسا ہوں۔ آپ لوگ مجھے روح کی پیاس بجھانے سے کیوں روکتے ہیں۔ کیوں مجھے میرے وطن سے علیحدہ کر رہے ہیں۔ مجھے میری دنیا میں جانے دیں.......... میرے لئے ایک ایک پل بھاری ہے۔ مجھے جانے دیں' مجھے جانے دیں۔"

وہ جنونی انداز میں بستر سے اٹھ گیا اور نرس گھبرا گئی۔ اس نے منصور کو لٹانے کی کوشش کی لیکن اس نے نرس کو دھکا دے دیا.......... نرس چیخنے لگی اور کئی وارڈوں کے آدمی گھس آئے اور بمشکل اسے قابو میں کیا۔ ڈاکٹر راشد کو بھی اطلاع ہو گئی اور وہ بھی جلدی سے پہنچ گیا۔ منصور بدستور چیخ رہا تھا۔ جدوجہد کر رہا تھا۔ مجبوراً اسے پھر بے ہوشی کا انجکشن دینا پڑا۔

راشد بھی پریشان نظر آ رہا تھا اور احسان علی ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کیا قصہ ہے۔" راشد نے پریشان لہجے میں کہا۔ "تمام ذرائع استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کا سسٹم بالکل درست ہے کوئی ذہنی عارضہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن کو راہِ راست پر لانے کے تمام اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ سب ہی حیران ہیں۔ اس دورے کی طوالت بھی سب کو حیران کئے ہوئے ہے۔" وہ خود سے کہہ رہا تھا پھر

اس نے چونک کر احسان علی کو دیکھا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اسے وہ جلدی سے بولا۔

"تاہم ہم مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹروں کا بورڈ مشورہ کر رہا ہے۔ اس بار ہم کوئی ایسا قدم اٹھانے والے ہیں جو فیصلہ کن ہو اور مجھے یقین ہے کہ ہم اسے ٹھیک کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"اس کی زندگی کو تو خطرہ نہیں ہوگا راشد میاں؟" احسان علی نے پوچھا۔

"آپ کی دعائیں شامل رہیں تو ہم سو فیصد کامیاب رہیں گے اور پھر جو علاج ہم کریں گے۔ اس سے زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔" راشد نے جلدی سے کہا اور احسان علی کی ڈھارس بندھ گئی۔

منصور بے ہوشی کے انجکشن کے زیر اثر سوتا رہا۔ شام ہوگئی۔ نلکیوں کے ذریعے اسے غذا دی گئی۔ بے ہوشی کے دوسرے انجکشن کی فی الحال ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ ہاں ڈاکٹر راشد نے نرس کو ہدایت کردی کہ ہوش میں آنے کے بعد اگر وہ کوئی گڑبڑ کرے تو اسے دوسرا انجکشن دے دیا جائے۔

لیکن رات کو تین بجے تک نرس جاگتی رہی اور منصور کو ہوش نہ آیا۔ احسان علی بے چارے مسلسل جاگتے رہتے تھے کبھی ان کی آنکھ لگ جاتی اور پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔ ڈھائی بجے تک وہ سجدے کرتے رہے اور ان سجدوں سے ان کے دل کو سکون آگیا تھا۔ اس لئے پونے تین بجے کے قریب وہ سوگئے۔

اس وقت ساڑھے تین بجے تھے جب منصور کی آنکھ کھل گئی۔ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے اپنے سامنے سایہ نظر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس سائے کو دیکھنے لگا اور پھر اس نے اسے پہچان لیا۔

یہ ساشا تھی۔ شہزادی آبانا کی خاص کنیز۔ بڑی شوخ بڑی چنچل لیکن آج اس کی آنکھوں میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان میں غم کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ کہنیوں کے بل اٹھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے ساشا؟" اس نے کہا لیکن ساشا نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اشارے سے اسے چلنے کو کہا۔

"آؤ۔" ساشا نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور وہ چوروں کی طرح دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ساشا نے دروازہ کھولا اور دونوں باہر نکل آئے۔ ساشا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ان دونوں کو باہر جانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور دونوں باہر نکل آئے۔ ہسپتال کے لان میں روش پر چلنے کے بجائے انہوں نے درختوں کی آڑ پسند کی اور اس طرح ہسپتال کے گیٹ سے بھی باہر نکل آئے۔ اتنے دن تک ہسپتال میں رہنے اور صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے منصور کمزور ہوگیا تھا۔ ہسپتال سے تھوڑی دور جا کر وہ تھک گیا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو ساشا۔ میں تھک گیا ہوں۔"

"تھک گئے ہو؟" ساشا نے حیرانی سے پوچھا۔ "آکاشیہ کا سب سے بانکا جوان اتنی سی دور چلنے میں تھک گیا ہے۔ پھر وہ اپنے مقدس عہد کی تکمیل کیسے کرے گا جو اس نے آبانا کے ساتھ مقدس آشیش کے معبد میں کیا تھا۔"

"میں اس نئی دنیا میں تھک گیا ہوں۔ نہ جانے یہ کیسی دنیا ہے یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ وہ محبت تو کرتے ہیں لیکن میرا ذہن انہیں قبول نہیں کرتا۔ مجھے اس بوڑھے کے آنسوؤں پر رحم آتا ہے لیکن وہ مجھے منصور کہتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ساشا۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"یہ میرے بس سے باہر ہے التاش۔ مجھے حکم ملا تھا کہ تمہیں ایک بار پھر تمہارا عہد یاد دلادوں۔ مجھے اسی لئے یہاں بھیجا گیا ہے باقی سب کچھ تمہیں کرنا ہوگا۔ میں معذور ہوں۔" ساشا نے کہا اور اس کا وجود تاریکی میں غائب ہوگیا۔ چند لمحات کے بعد وہ تنہا کھڑا تھا۔ تنہا بے یار و مددگار۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔

"کہاں جاؤں میں کہاں جاؤں۔ میری مدد کرو مقدس آشیش۔ مجھے اپنے قدموں میں بلالو۔ میری منزل کہاں ہے میری رہنمائی کرو.......... میں اپنا عہد پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قوت دو۔ مجھے میرا عہد پورا کرنے کی طاقت دو۔" اس نے دکھی آواز میں کہا اور اس کے قدم ایک طرف بڑھنے لگے غیر اختیاری طور پر، اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔

دور کسی جگہ کلاک نے چھ بجائے اور نرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک طویل

انگڑائی لی۔ بے آرام ہونے کی وجہ سے اس کے جسم میں درد ہو رہا تھا لیکن ڈیوٹی بہرحال ڈیوٹی ہے۔ ڈیوٹی کے تصور کے ساتھ اس کی نگاہ مریض پر پڑی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ بستر خالی تھا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بدحواسی میں بڑے میاں کے بستر کی طرف دیکھا وہ بدستور کروٹ لئے سو رہے تھے۔

نرس نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا اور احسان علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سہمی آواز میں پوچھا۔

"منصور۔ منصور۔" نرس کے منہ سے بمشکل نکلا اور وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہسپتال کے کونے کونے میں منصور کی تلاش ہو رہی تھی لیکن اس کا نام ونشان نہیں تھا۔ احسان علی دل پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

ہسپتال میں منصور کو تلاش کرنے والے مایوس ہو کر باہر چاروں طرف دوڑ گئے تھے۔ نرس بھی بری طرح بدحواس تھی۔ ڈاکٹر راشد کو فون کیا جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آموجود ہوا۔ وہ بھی اس خبر سے پریشان تھا۔ اس نے فوری طور پر پولیس کو رِنگ کیا اور پوری تفصیل بتادی۔

چنانچہ پولیس بھی حرکت میں آگئی۔ شام ہوئی رات گزر گئی لیکن منصور کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ احسان علی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور اب راشد کی تسلیاں بھی ان کے لئے بے کار ہوگئی تھیں۔ تیسرے دن اخبارات میں منصور کی تصویر چھپادی اور اسے لانے والے کے لئے مناسب انعام بھی مقرر کیا گیا لیکن پورا ہفتہ گذر گیا اور کہیں سے اس کی خبر نہ ملی۔ احسان علی اب راشد کے ہاں مقیم تھے وہ اپنے قصبہ واپس جانا چاہتے تھے لیکن اس آس پر رکے ہوئے تھے کہ شاید منصور مل جائے اور وہ اسے ساتھ لے کر جائیں لیکن اب ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد وہ مایوس ہوگئے تھے۔ انہوں نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

"مجھے اب جانے دو راشد بیٹے۔ ابھی دو بدنصیب اور ہیں جنہیں اس غم میں شریک کرنا ہے۔ ان دونوں کو اس سانحے کی خبر نہ دینا ظلم ہے۔ ایک ماں بیٹے کی صحت یابی کے لئے بے چین ہوگی ایک بہن بھائی کی راہ تک رہی ہوگی۔ انہیں تو رونے کا موقع دیا جائے

تاکہ وقت انہیں صبر عطا کرے۔"

"اس قدر ناامید نہ ہوں چچا جان۔ منصور ایک نہ ایک دن ضرور مل جائے گا ہم اسے تلاش کر ہی لیں گے۔ ویسے اگر آپ قصبہ جانا چاہیں تو اب میں آپ کو نہیں روکوں گا۔ میں خود آپ کو وہاں چھوڑ کر آؤں گا۔"

"تم کہاں تک ہمارا ساتھ دو گے بیٹے۔ ہم تو سدا کے دکھے ہوئے ہیں۔ تمہارے ویسے بھی کیا کم احسانات ہیں بس تم تکلیف نہ کرو' میں خود چلا جاؤں گا۔" احسان علی آبدیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔

اور درحقیقت وہ منظر بے حد دلگداز تھا۔ ماں کی وحشیانہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ بہن کی دبی دبی سسکیاں اور احسان علی کے آنسو۔ راشد کے بھی آنسو نہ رک سکے۔ وہ ان سب کے لئے اجنبی تھا لیکن ایک حساس دل رکھنے کی وجہ سے وہ خود کو ان سے الگ نہ سمجھ رہا تھا۔ منصور کی ماں کی حالت سنبھالنے میں اسے پورا ایک ہفتہ لگ گیا تھا۔ شدتِ صدمہ سے وہ بے حال ہوگئی تھی لبنیٰ بھی ہر وقت آنسوؤں میں ڈوبی رہتی تھی اور راشد کو اس کا حسین سوگوار چہرہ دیکھ کر دلی اذیت ہوتی تھی۔

وہ ان لوگوں کے لئے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ اس نے ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ احسان علی کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ شہر سے ایک ہزار روپے کا منی آرڈر بھیجنے والا راشد ہی تھا لیکن تینوں کی زبان بند تھی۔ وہ راشد کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکتے تھے۔ وہ کس طرح اس کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے۔ اب تو وہ شکریہ کی حدود سے بھی نکل گیا تھا۔

راشد دس دن تک رہا اور پھر آتے رہنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا لیکن وہ اپنا بہت کچھ وہاں چھوڑ آیا تھا۔ لبنیٰ کا سوگوار لیکن بے پناہ حسین چہرہ اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا تھا اور اس کا تصور اس کی روح کی گہرائیوں میں جاگزین ہوگیا تھا۔

لیکن اس احساس کو وہ قبر کی تاریکیوں میں لے جانے کا عہد رکھتا تھا۔ وہ اس راز کو اپنی تنہائیوں پر آشکارا نہیں کر سکتا تھا۔ دوبارہ سوچ لیا جائے کہ وہ ایک پاگل بھائی' بوڑھے باپ اور بے کس ماں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے خلوص کی کوئی قیمت نہیں چاہتا تھا۔ محبت تو حوصلہ دیتی ہے۔ فراخ دلی عطا کرتی ہے۔ اس میں طلب اور

طمع کیا حیثیت رکھتی ہے لیکن اب اس کی ایک ہی دھن تھی اور وہ تھی منصور کی تلاش۔ وہ انہیں منصور کا تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا اور اگر اس نے صحت مند منصور کو ان کے حوالے کردیا تو وہ بلاشبہ انعام کا حقدار ہوگا اور اس کے بعد اگر اس سے اس کا انعام پوچھا گیا تو وہ لبنیٰ کو طلب کرے گا۔

دوسری طرف منصور تھا۔ خود سے بیگانہ۔ اسے صرف وہ حسین بستی یاد تھی جو تاریکی پھیلتے ہی خوابوں کی دنیا میں مل جاتی تھی اور پھر اس کے چاروں طرف دھاڑتے خوفناک درندے جو بستی والوں کو نہیں ستاتے تھے۔ وہ بستی سے دور ہرے بھرے جنگلوں کے انتہائی سرے پر شکار کرتے تھے۔ اسے وہ زمردیں میدان یاد تھے جن میں چوگان کھیلی جاتی تھی۔ اسے وہ چھوٹے چھوٹے مکان یاد تھے جن میں اس کی زندگی گذری تھی اور اسے اس بستی کے لوگ بھی یاد تھے۔ شہنشاہ زوران بھی یاد تھا جو رحم دل اور نیک تھا۔ جو اپنے عوام سے محبت کرتا تھا اور اس کی بیٹی آبانا بھی یاد تھی جو اس کو چاہتی تھی۔ پاگلوں کی طرح اور یہ شہزادی کی چاہت ہی تھی کہ بلتاریہ کو شکست دینے کے لئے اس نے اپنی ذہنی قوتوں کو آواز دی تھی اور ایک ایسا نقشۂ جنگ تیار کیا تھا جس کی زد میں آکر بلتاریہ کا ایک بھی جوان زندہ واپس نہیں جاسکا تھا۔ پھر رحمدل شہنشاہ نے بلتاریہ کو آکاشیہ میں ضم کردیا اور وہاں کے باشندوں کو امان دی، پناہ بھی دی اور ان کے مفادات کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔

اسے یہ سب کچھ یاد تھا۔ اسے اپنا خوبصورت چھوٹا سا محل بھی یاد تھا جو شہنشاہ زوران نے خوش ہوکر اسے دیا تھا اور پھر آشیش کا معبد جس سے وہ دل سے عقیدت رکھتا تھا اسے آشیش کے معبد میں آبانا سے کئے ہوئے وعدے اور اس مقدس عہد کا ایک ایک لفظ یاد تھا۔ یہ سب کچھ اسے یاد تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہ جانے کہاں کھوگیا تھا۔ وہ کہاں نکل آیا تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ کون سا راستہ اس کی بستی کی طرف جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور چلا جارہا تھا۔ کاش ساشا اس کی مدد کرتی۔ کاش۔

صبح کا جب اجالا ہوا تو وہ عجیب سی جگہ کھڑا تھا۔ یہ شاید ریلوے اسٹیشن تھا۔ مختلف راستوں پر جانے والی گاڑیاں یہاں کھڑی تھیں ایک گاڑی میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے

تھے وہ خود بھی اس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا اور دوسرے لوگوں کی طرح سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا وہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ انہیں دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ بس وہ بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس لئے۔

اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اسے اس کا بھی احساس نہیں ہوا وہ کھڑکی سے بھاگتے مناظر دیکھتا رہا۔ لوگ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے لیکن وہ سب سے بیگانہ تھا، بالکل خاموش، اور سفر طے ہوتا رہا۔ وقت گذرتا رہا۔ دوپہر ہوگئی۔ کھانے کے لئے بیرے شور مچاتے رہے لیکن وہ بھوک پیاس سے بیگانہ خاموش بیٹا رہا۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھا۔ آہستہ آہستہ شام ہونے لگی اور پھر تاریکی پھیل گئی۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے گذرتی رہی۔ اس وقت سات بجے تھے جب ایک ٹکٹ کلکٹر دوسرے ڈبوں سے گذر کر اس ڈبے میں داخل ہوگیا۔ وہ لوگوں کے ٹکٹ چیک کررہا تھا اور پھر وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ٹکٹ!" اس نے اسے اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے کہا۔ ہسپتال کے لباس کو پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ ٹکٹ کلکٹر کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ "ٹکٹ دکھایئے مسٹر!" کلکٹر نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے جناب اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ یہ تو صبح سے بھوکا پیاسا بھی ہے۔" قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا جو خود بھی پریشان حال تھا۔

"اور شاید ہسپتال کا بل بھی لے بھاگا ہے۔" ٹی ٹی نے کہا اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"فکر مت کرو بیٹے، تمہارے جیسے لوگوں کا علاج تو مجھ سے اچھا کوئی نہیں کرسکتا۔" اور دوسرے لوگوں کا ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ اس دوران وہ بار بار نظریں اٹھا کر اسے دیکھ لیتا لیکن وہ اسی طرح لاپرواہی سے بیٹھا ہوا تھا جیسے ٹی ٹی کی بکواس اس کے ذہن ہی میں نہ آئی ہو۔ پھر ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔

ٹکٹ کلکٹر نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اس کمپارٹمنٹ کے آخری آدمی کا ٹکٹ چیک کرنے کے بعد وہ دوبارہ اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ اسے معاف کرنے پر تیار

نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ٹرین کی رفتار سست تر ہوتی رہی اور پھر وہ ایک ویران سے اسٹیشن پر رک گئی۔ بہت چھوٹا اسٹیشن تھا لیکن ٹکٹ کلکٹر نے اس کا بازو پکڑا اور وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ ٹکٹ کلکٹر اسے نیچے اتار کر لے گیا۔ اسٹیشن ماسٹر جو چھوٹا سا اسٹیشن ہونے کی وجہ سے بہت سے عہدے سنبھالے ہوئے تھا۔ لالٹین لئے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"بغیر ٹکٹ ہے، تم اس سے نبٹ لینا۔" ٹکٹ کلکٹر نے اس کا ہاتھ اسٹیشن ماسٹر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور بوڑھے اسٹیشن ماسٹر کا سر ہلنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر تاریکی میں نظر نہ آسکتی تھی۔ ٹکٹ کلکٹر مطمئن ہو کر اوپر چڑھ گیا۔ گارڈ نے وسل دی اور ٹرین آگے بڑھ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر اس کا ہاتھ تھامے جاتی ہوئی ٹرین کو سبز جھنڈی دکھاتا رہا اور جب وہ پلیٹ فارم کی حدود سے نکل گئی تو اس نے ایک گہری سانس لے کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"بے وقوف کہیں کا۔ اپنی دانست میں اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر پُراحترام لہجے میں بولا۔

"میں بندہ ناچیز التاش کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ جھک گیا اور منصور نے پہلی بار چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر نہ جانے کیوں اس کی رگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"عقیدت کا نشان!" اسٹیشن ماسٹر نے اپنا داہنا ہاتھ سامنے کر دیا جس میں ایک انگوٹھی موجود تھی اور ایک خوبصورت پتھر اس میں لگا ہوا تھا جو جگنو کی طرح چمک رہا تھا۔

التاش کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور اس نے اپنے ہاتھ انگوٹھی والے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس کے مردہ جسم میں زندگی پیدا ہو گئی تھی۔

"تشریف لائیے۔" اسٹیشن ماسٹر نے کہا اور اس کی رہنمائی کرنے لگا۔ پورے اسٹیشن پر اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔

اسٹیشن ماسٹر اسے لئے ہوئے اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت میں پہنچ گیا۔ باہر کوئی روشنی نہ تھی لیکن اندر دن نکلا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے تین آدمی کھڑے ہوئے تھے جنہوں نے سفید لباس پہنے ہوئے تھے اسے دیکھ کر وہ تینوں جھک گئے۔

اور پھر انہوں نے ایک غیر مانوس آواز میں کہا۔

"آشیش کے پجاری آکاشیہ کے سب سے بڑے انسان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں آشیش کے معبد میں کئے ہوئے مقدس عہد کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہو گیا ہوں مقدس پجاریو!"

"تاہم بلتاریہ پر آشیش کو مکمل اعتماد تھا۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔" ان میں سے ایک نے کہا اور دوسری طرف مڑ گئے۔ سامنے ہی ایک لمبی میز بچھی ہوئی تھی جس پر مختلف النوع کھانے چنے ہوئے تھے۔ انہوں نے میز کی طرف اس کی رہنمائی کی اور وہ پُرتکلف قدموں سے میز پر پہنچ گیا۔ ایک کرسی اس کے لئے کھینچ دی گئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا پھر تینوں پجاری اس کی خاطر مدارت کرنے لگے۔ وہ ملازموں کی طرح کام کر رہے تھے اور وہ ان کے درمیان شہنشاہوں کی طرح بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

دن بھر کی بھوک کے بعد لذیذ کھانا ملا تھا۔ اس نے خوب ڈٹ کر کھایا اور پجاری خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اسے ایک عجیب سے سرور، ایک عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس کا جسم سست ہونے لگا اور اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"آرام گاہ تیار ہے التاش۔" ایک پجاری نے کہا۔

اسے سہارا دے کر اٹھایا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل پڑے۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور اگر وہ اسے سہارا نہ دیئے ہوتے تو شاید وہ گر پڑتا۔

باہر سے چھوٹی سی اور بوسیدہ نظر آنے والی یہ عمارت نہ جانے کیا تھی۔ اسے لے کر وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں پرانی طرز کی ایک آرام دہ مسہری بچھی ہوئی تھی۔ وہ اسے مسہری پر لے گئے اور پھر وہ مسہری پر گر کر آرام کی نیند سو گیا۔

نہ جانے کب تک وہ مست اور سکون کی نیند سوتا رہا جب آنکھ کھلی تو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہال میں بڑی خوشگوار خنکی تھی۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور اسے اپنے بائیں سمت............ ایک آہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک خوبصورت سی خادمہ سفید باریک لباس پہنے اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر خادمہ

نے جھک کر خرگوش کی کھال کے بنے ہوئے سلیپر نکال کر قرینے سے رکھ دیئے اور اپنا مرمریں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خادمہ کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ اٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا لباس تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب وہ نرم ریشمی لباس میں ملبوس تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور سلیپر پہن کر کھڑا ہو گیا۔ خادمہ اسے ایک خوبصورت اور صاف ستھرے باتھ روم میں لے گئی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اسکا لباس اتار دیا۔ نیم گرم پانی کے پھواروں کے ساتھ خادمہ کے نازک ہاتھ اسکے جسم پر گردش کرتے رہے اور وہ ایک عجیب سی دنیا میں گم ہو گیا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب خادمہ نے ایک موٹا تولیہ اسکے جسم کے گرد لپیٹ دیا پھر اس کا بازو پکڑ کر باتھ روم سے باہر نکل آئی۔

پھر اسے پہننے کے لئے ایک عجیب سا لباس دیا گیا اور اسے پہن کر وہ تیار ہو گیا۔ تب اسے اسی کمرے میں لے جایا گیا جہاں وہ رات کو کھانا کھا چکا تھا۔ وہی تینوں پجاری موجود تھے اور انہوں نے اسی احترام کے ساتھ اسے ناشتہ بھی کرایا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ اس جگہ سے اٹھ گیا۔ تب ان میں سے ایک پجاری نے آگے آکر کہا۔

"کیا محترم الناش آکاشیہ کے سفر کے لئے تیار ہیں؟"

"ہاں۔ میں آشیش کے معبد میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔" منصور نے جواب دیا اور تینوں پجاری مسکرانے لگے۔

"تب باہر تشریف لے چلیں۔ سواری تیار ہے۔" ایک پجاری نے کہا اور منصور گردن ہلا کر عمارت کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تینوں پجاری اپنی جگہ کھڑے تھے۔ منصور نے پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گیا لیکن باہر کا منظر عجیب تھا۔ نہ ریلوے اسٹیشن تھا نہ کوئی آبادی۔ ایک لق ودق جنگل پھیلا ہوا تھا ایک گھنے درخت کے نیچے سفید رنگ کا ایک قد آور گھوڑا کھڑا ہوا تھا جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر گھوڑا ہنہنایا اور وہ اپنے گھوڑے کو پہچان کر مسکرایا۔ گھوڑے نے بھی اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ گھوڑے کے نزدیک پہنچ کر اس نے پلٹ کر پجاریوں کو دیکھا۔

لیکن کیسے پجاری۔ کون سی عمارت؟ وہاں تو کچھ نہ تھا۔ سوائے سرسبز درختوں کے جن میں بعض میں خوبصورت پھل لٹکے ہوئے تھے لیکن اس بدلے ہوئے ماحول کو دیکھ کر

اسے حیرت نہ ہوئی۔ وہ اس علاقے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ درجنوں بار وہ یہاں شکار کھیلنے آچکا تھا۔ اس علاقے میں اس نے ایک بہت بڑا ریچھ شکار کیا تھا۔

اس نے گھوڑے کو ہاتھ مارا اور گھوڑا دوڑنے لگا۔ وہ بڑی شان سے اس پر بیٹھا ہوا تھا۔ خوبصورت راستے، گھنے جنگلات سبزے سے لدے ہوئے پہاڑی میدان یہ سب کچھ اس کے جانے پہچانے تھے۔ ایک عجیب سی خوشی، ایک انجانی سی مسرت اس کے ذہن میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ ایک بے خودی سے سرشار آگے اور آگے جا رہا تھا۔

اور سورج چڑھنے تک یہ سفر جاری رہا۔ دھوپ چلچلانے لگی۔ پھر دور سے اسے آشیش کے معبد کے سنہری عکس جگمگاتے نظر آئے۔ یہ عکس بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتے تھے۔ اس نے عکس کی سیدھ لی اور گھوڑے کو اس راستے پر ڈال دیا اور پھر وہ سورج کے ساتھ سفر کرتا رہا.......... لیکن سورج پیچھے رہ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد معبد کی عمارت نظر آنے لگی۔ سیاہ سنگی عمارت جس میں آشیش موجود تھا۔ ایک بہت بڑا ناہموار سنگی بت جسے ہواؤں نے تراشا تھا اور جو بے پناہ قوتوں کا مالک تھا۔ وہ ایک عجیب سی لگن کے ساتھ معبد کی طرف گھوڑا دوڑاتا رہا۔ اب معبد کا دروازہ نظر آنے لگا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ معبد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کی پیاسی آنکھیں معبد کا طواف کر رہی تھیں اور اس کی روح سکون کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا معبد کو دیکھتا رہا گھوڑے کو اس نے یونہی چھوڑ دیا۔

اور پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ کر دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے قدم والہانہ انداز میں آگے بڑھ رہے تھے اور پھر کئی دروازوں کو عبور کرتا ہوا وہ اس ہال میں پہنچ گیا جس کے اوپر سبزی مائل عکس تھا اور ہال کے درمیان ہواؤں کا بیٹا سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر جھکتا چلا گیا۔

"میں نے اپنا عہد پورا کر لیا ہے مقدس آشیش۔ میں واپس آچکا ہوں۔" اس نے کہا اور ایک نرم ہاتھ نے اس کی باہوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ ایک مانوس انداز، ایک حسین لمس۔ وہ آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر ایک مترنم آواز گونجی۔

"الناش۔" اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ آواز.......... یہ آواز اس کی زندگی کی تھی۔ اس کی روح تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ سفید ہوائی لباس میں آبانا مسکرا رہی

تھی۔ مقدس مسکراہٹ۔ آبانا کی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔

"تم آ گئے میرے محبوب۔ تم آ گئے۔" اس نے مسکراتی آواز میں کہا اور التاش کا سر سینے سے لگالیا۔ التاش اس سینے کے گداز میں ڈوب گیا اور وہ وقت یاد آ گیا جب وہ آبانا سے رخصت ہو رہا تھا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے شمار تصویریں رقص کرنے لگیں۔

معبد کے شمال میں کچے پکے بے شمار مکانات پر پھیلی ہوئی بستی جس کی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی۔ اسی بستی کا نام آکاشیہ تھا۔ چھوٹی سی سلطنت کے چھوٹے چھوٹے مسائل تھے جنہیں سلجھانے کے لئے زوران جیسا نیک دل اور ذہین شہنشاہ موجود تھا۔ پوری بستی خوشحال تھی۔ سرخ و سفید لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن چلچلاتے میدانوں کے درندے بلتاروی اس سکون کی بستی سے نفرت کرتے تھے۔ شدید نفرت۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ پہاڑوں کے غاروں اور میدانوں کے نیچے سوراخ بنا کر رہنے کے بجائے وہ آکاشیہ کے مرغزاروں پر قبضہ کرلیں۔ آکاشیہ کی حسین عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنالیں اور ان کے جوانوں کو ختم کر کے بچوں کو غلام بنالیں۔ بلتاریہ کا بزدل سردار تاغان رات دن یہی چالیں سوچتا رہتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی قوت بڑھاتا رہا تھا۔

اور پھر ایک مضبوط فوج بنا کر اس نے آکاشیہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ بلتاروی درندے میدانوں سے نکل کر آکاشیہ کی سرحدوں میں لوٹ مار کرنے لگے۔ وہ آکاشیہ کے باشندوں کو اغوا کر کے لے جاتے۔ انہیں اپنے ظلم خانوں میں رکھ کر اذیتیں دیتے اور پھر فرار ہونے کا موقع دیتے تاکہ آکاشیہ کے باشندے اپنی ریاست میں جا کر بلتاریوں کے عظیم لشکروں اور ان کے خونخوار انسانوں کی داستانیں سنائیں اور اس طرح آکاشیہ کا سردار زوران ان سے مرعوب ہو جائے' ان کی اطاعت قبول کرلے اور بالآخر وہ آکاشیہ پر قابض ہو جائیں۔

لیکن تاغان اپنی چال میں ناکام رہا۔ زوران ان سے مرعوب نہ ہوا بلکہ اس نے بلتاریہ کے خلاف خود بھی تیاریاں شروع کردیں۔ اسے احساس تھا کہ بلتاریہ کی قوت آکاشیہ سے کہیں زیادہ ہے۔ بلتاری درندے محنت و مشقت کے عادی ہیں۔ وہ جفاکش جنگجو اور خونخوار ہیں اور ان سے جنگ آسان نہ ہوگی۔

چنانچہ وہ پریشان بھی تھا اور پھر اس نے ہر شخص کو دعوت دی کہ وہ بلتاریوں سے نبٹنے کے لئے تجاویز پیش کرے! آکاشیہ کے باشندے بلتاریہ سے خوفزدہ تھے۔ التاش خود بلتاریہ کے عزائم سے سخت پریشان تھا لیکن اسے آکاشیہ سے محبت تھی وہ اسے بلتاریوں کے زیر نگیں نہیں جانے دینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے دن رات محنت کر کے ایک نقشۂ جنگ ترتیب دیا اور یہ نقشہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

وہ نقشۂ جنگ لے کر شہنشاہ کے حضور پہنچ گیا اور اس نے اپنی ناچیز تجاویز پیش کیں لیکن زوران اس عظیم پروگرام کو سن کر حیران رہ گیا۔ بے شک بلتاریہ کی تباہی کے لئے اس سے بہتر منصوبہ اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ شہنشاہ نے اسے پُرجوش مبارکباد دی اور شاہی محل میں وہ تین روز مہمان رہا وہاں اسی دوران اس کی ملاقات آبانا سے ہوئی تھی۔

آبانا جو آکاشیہ کی شہزادی تھی۔ حوروں کا مقدس حسن' فرشتوں کی سی پاکیزگی کا پیکر۔ آبانا اس کے دل میں اتر گئی اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا لیکن دوسری طرف آبانا بھی اس کے تیر نظر سے نہ بچ سکی وہ اس کے لئے دیوانی ہو گئی۔ وہ محل سے چلا آیا لیکن آبانا اس کے دل سے دور نہ ہوئی اور آبانا کو بھی چین نہ آیا۔

تب ایک تاریک رات میں وہ اس سے ملنے چلی آئی۔ اس نے اپنی نسوانیت کو بالائے طاق رکھ کر اس سے اظہار محبت کیا اور التاش کو جنت مل گئی۔ وہ آبانا کے مقدس حسن میں کھو گیا اور دونوں کو دنیا کی خبر نہ ہوئی۔ شہنشاہ اس کی بے حد عزت کرتا تھا اور اکثر اسے محل بلوا کر اس سے مشورہ لیتا رہتا تھا۔

پھر وہی ہوا۔ پروگرام کے مطابق بلتاریوں سے چھیڑ چھاڑ کی گئی اور بلتاریہ جو ابھی یورش کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ غضبناک ہو کر چڑھ آیا۔ التاش کی اسکیم قدم بہ قدم کامیابی کی منازل طے کر رہی تھی۔ وہ اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹاتے آئے اور تاغان کامیابی کے نشے میں چور آگے بڑھتا رہا۔

اور پھر اس مخصوص مقام پر لا کر جہاں وہ بلتاروی فوجوں کو لانا چاہتے تھے۔ زوران نے ان پر موت برسادی۔ آکاشیہ کے سپاہی بلتاروی فوجوں کا صفایا کرنے لگے اور آن کی آن میں نقشہ پلٹ گیا۔ بلتاریہ کو بدترین شکست ہوئی۔ وہ اس بُری طرح گھرے کہ بلتاریہ کا ایک بھی جوان زندہ واپس نہ جاسکا۔

خود التاش بھی اس جنگ میں شریک تھا۔ آکاشیہ کا بچہ بچہ شریک تھا۔ التاش کے پہلو میں ایک زہریلا تیر آلگا اور اسے نکالنے کی کوشش میں تیر کا پھل ٹوٹ کر اندر رہ گیا تھا۔ آکاشیہ کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور زوران کا سب سے بڑا دشمن ختم ہوگیا۔ اس فتح کا سہرا اس نے پورے خلوص سے التاش کے سرباندھ دیا۔

لیکن التاش زخم سے بہہ جانے والے خون سے نڈھال میدانِ جنگ میں گھوم رہا تھا۔ آکاشیہ کے سپاہی اسے لے کر شاہی محل میں آگئے اور شہنشاہ کے خاص معالج اس کا علاج کرنے لگے لیکن التاش کے جسم میں موت کا زہر پھیل گیا تھا۔ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ آبانا کی بے قراریاں انتہا کو پہنچ گئیں۔ اس کی کنیز ساشا ہر وقت التاش کے پاس رہتی اور اسے آبانا کے بارے میں بتاتی رہتی لیکن التاش کو اپنی موت کا یقین ہوچکا تھا۔ معالج کی تمام تر کوششیں ناکام ہوگئیں۔ شہنشاہ زوران پریشان ہوگیا۔

تب اسے آشیش کے معبد میں پہنچا دیا گیا۔ اب دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت تھی اور آشیش کے معبد میں شہزادی آبانا اس سے آملی۔ اس نے تمام پردے اتار دیئے تھے اور شہنشاہ کو بھی اس کی محبت کا علم ہوگیا تھا۔ آکاشیہ کے نجات دہندہ سے پورا آکاشیہ عشق کرنے لگا تھا۔ ایک شہزادی اس کے عشق میں دیوانی ہوگئی تو کیا ہوا۔

شہنشاہ نے اسے اجازت دے دی کہ وہ التاش کی تیمارداری کرے لیکن شہزادی کی محبت بھی التاش کی زندگی واپس نہ لاسکی اور ایک شام جب کہ تاریکی نے معبد کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ التاش کو موت کا پروانہ مل گیا۔ اس نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں عہد کرتا ہوں شہزادی آبانا! میں آشیش کے مقدس قدموں میں عہد کرتا ہوں کہ میں پھر واپس آؤں گا۔ التاش تمہاری دنیا میں واپس آئے گا۔ میرا انتظار کرنا......... اگر تم نے میرا انتظار نہ کیا تو......... تو.........!" اور یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

اس کے بعد وہ موت کی تاریکیوں میں کھوگیا اور آج وہ مقدس عہد پورا ہوگیا تھا۔ آبانا کے نرم و گداز سینے سے لپٹے لپٹے اسے پوری کہانی یاد آگئی اور اس نے گردن اٹھا کر آبانا کو دیکھا آبانا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے التاش کی آنکھوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"میں تمہارا انتظار کررہی تھی میرے محبوب۔ میں تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھی اور آخر تم آگئے۔"

"میں نے عہد کیا تھا آبانا! میں عہد شکن نہیں ہوں۔" اس نے آبانا کو آغوش میں لیتے ہوئے کہا اور آشیش کے بت سے محبت کی کرنوں کی بارش ہونے لگی۔

نہ جانے کب تک آبانا اس کے آغوش میں رہی۔ وقت کا احساس نہ رہا تھا پھر وہ سنبھلے اور آبانا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"چلیں التاش! سب تمہارے منتظر ہوں گے۔ آکاشیہ کے لوگ تمہارے استقبال کی زبردست تیاریاں کررہے تھے ان کا خیال تھا کہ تم ان میں آؤ گے لیکن میں جانتی ہوں کہ تم سیدھے آشیش کے معبد میں آؤ گے۔ اس لئے میں یہاں تمہاری منتظر تھی۔"

وہ مسکرا کر کھڑا ہوگیا اور پھر وہ دونوں معبد سے نکل آئے۔ آبانا کا چار گھوڑوں والا خوبصورت رتھ معبد کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اس رتھ میں بیٹھ کر چل پڑے اور رتھ معبد سے بستی تک کے علاقے کو عبور کرکے بستی میں داخل ہوگیا۔ پوری بستی خوشیاں منا رہی تھی۔ جگہ جگہ التاش کے مجسمے آویزاں تھے ان پر پھولوں کی بارش کی جانے لگی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کی آمد کے گیت گارہے تھے ناچ رہے تھے۔ خوشیاں منا رہے تھے۔

محل کے دروازے پر شہنشاہ زوران اور حکومت کے دوسرے ارکان نے اس کا استقبال کیا اور اسے عزت سے محل میں لے گئے۔ شہنشاہ زوران بہت خوش تھا اس نے اپنے برابر کے تخت پر اسے بٹھایا اور امراء اسے تحائف پیش کرنے لگے۔ سب سے آخر میں زوران نے اپنے ملازموں کو حکم دیا۔ اب زوران کو تحفہ پیش کیا جانے والا تھا اور غلام ایک طشت لے کر سامنے آگیا جس پر غلاف ڈھکا ہوا تھا۔

سب لوگ اس تحفے کو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ پھر شہنشاہ کے حکم سے طشت سے غلاف اٹھالیا گیا۔ طشت میں تاغان کا کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ اس عظیم تحفے کو دیکھ کر پورے دربار میں غلغلہ ہوگیا۔ دشمن کا سر سب سے بڑا تحفہ ہوتا تھا۔ التاش نے ممنونیت سے وہ تحفہ قبول کیا اور پھر دوسری رسومات ہونے لگیں۔

نہ جانے کب تک اس کی آمد کا جشن منایا گیا اور التاش عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا۔ آبانا اس سے روز ملاقات کرتی تھی اور اب اس کی ملاقات روزانہ ہوتی۔

تھی۔ شہنشاہ نے اسے اجازت دے دی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ کسی مناسب موقع پر ان دونوں کی شادی کا اعلان کردے گا۔ یہ دن بڑے پُرمسرت گذر رہے تھے۔ رات دن کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

ایک طویل عرصہ بیت گیا۔ پھر آشیش کے سالانہ جشن کے پُرمسرت موقع پر شہنشاہ زوران نے بھرے دربار میں الناش اور آبانا کی شادی کا اعلان کیا اور کہا۔

"بلتاریہ کی شکست کا سہرا الناش کے سر ہے اور بلاشبہ اسی شخص کو حکومت کا حق ہے جو بدترین دشمن کو شکست دے۔ میں یہ اعلان کرکے خوشی محسوس کررہا ہوں کہ میرے بعد آکاشیہ کا شہنشاہ الناش کے علاوہ اور کوئی نہ ہوگا اور شہنشاہ الناش سے میں اپنی بیٹی آبانا کی نسبت باعثِ فخر محسوس کروں گا میں اعلان کرتا ہوں کہ آج سے ٹھیک ایک چاند کے بعد الناش اور آبانا کو مقدس آشیش کے قدموں میں لے جاکر شادی کے مقدس بندھن میں باندھ دیا جائے گا۔"

دربار میں پُرجوش اور پُرمسرت نعرے گونجنے لگے لیکن ایک بوڑھی اور لرزتی ہوئی آواز ان نعروں پر بھاری تھی۔

"یہ ممکن نہیں ہے شہنشاہ زوران' یہ ممکن نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔"

اور اس آواز سے پورے دربار میں سناٹا چھاگیا۔ آشیش کے معبد کے سب سے قدیم اور معمر پجاری کی آواز معمولی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ شہنشاہ کی گھبرائی ہوئی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھ گئیں۔ پجاری آہستہ آہستہ آگے بڑھ کران کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے زوران۔ اس کے جسم پر خاک کا لباس ہے وہ فانی دنیا کا انسان ہے جبکہ ہم لافانی ہیں۔ کیا تم ایک بار پھروہی کہانی دوہرانا چاہتے ہو جو دوہرائی جاچکی ہے۔ بلاشبہ اس وقت ہم بھی خاکی تھے لیکن اب ہم روح کے لباس میں ہیں۔ ہم میں شامل ہونے کے لئے اسے بھی روح کا لباس درکار ہے کیا تم دو متضاد کیفیتوں کو آپس میں یکجا کردینا چاہتے ہو۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے تڑپتے رہیں گے۔ یہ ملاپ ناممکن ہے۔"

اور شہنشاہ زوران کے چہرے پر فکر وپریشانی کے آثار ابھر آئے اور بولا۔

"تم درست کہتے ہو مقدس پجاری۔ تم درست کہتے ہو اس کے لئے روح کا لباس

ضروری ہے۔ کیا ہم اسے یہ لباس مہیا کرسکتے ہیں............؟"

"ہم نہیں۔ اسے اس کی دنیا میں بھیج دو۔ جب یہ اس دنیا سے واپس آئے گا تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے اور وہی اس کی شادی کا دن ہوگا۔" پجاری نے کہا اور تمام سرجھک گئے پھر زوران کی آواز گونجی۔

"اسے اس کی دنیا میں بھیج دینا چاہئے۔" اور دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر الناش کے دونوں بازو پکڑ لئے۔

"نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

"تمہیں جانا ہوگا الناش! یہ درست بھی ہے۔ خاک کے لباس میں تم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہم سے بھول ہوئی تھی لیکن ہاں تمہاری دنیا تمہارے لئے آسان کردی جائے گی۔ آکاشیہ کا مقدس نشان رکھ لو۔" زوران نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور الناش کی انگلی میں پہنادی دُور............ محل کی ایک کھڑکی میں بیٹھی آبانا رو رہی تھی۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں آبانا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو میں کہتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔" اس نے دونوں آدمیوں سے بازو چھڑا لئے۔

"واہ بیٹا بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کرتے ہو اور پھر تھانے بھی نہیں جاؤ گے۔" اسے پکڑنے والوں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا اور وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ دونوں پولیس کے جوان تھے اور وردی میں تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور وہ بھونچکا ہوکر انہیں دیکھنے لگا۔

"میں............ میں بغیر ٹکٹ سفر کررہا؟" اس نے کھوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خوب............ خوب۔ اب اداکاری بھی کرے گا ارے تھانے چل۔ وہاں پہنچ کر سب دماغ درست ہوجائے گا۔" ایک کانسٹیبل نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں اسے تھانے لے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے تھانے کے انچارج کے سامنے پیش کیا گیا۔ سپاہیوں نے انچارج کو بتایا کہ ریلوے والوں نے اسے پولیس کے حوالے کیا ہے۔ وہ بغیر ٹکٹ سفر کررہا تھا۔

"ہوں۔" انچارج نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "صورت سے تو شریف آدمی

معلوم ہوتے ہو۔ شرم نہیں آتی بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے۔" پھر وہ کانسٹیبلوں کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تلاشی لو اس کی جیب کی۔"

اور کانسٹیبلوں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا لیکن سب سے پہلے چیز جو اس کی جیب سے نکلی وہ ریل کا ٹکٹ تھا۔ جو ایک لمبے سفر کے لئے جاری ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟" انچارج نے کانسٹیبلوں کو گھورتے ہوئے ٹکٹ لے لیا اور اسے دیکھنے لگا۔ کانسٹیبل بھی حیران رہ گئے تھے۔

"کیا تم لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" اس نے کڑک کر کہا۔

"جج۔ جناب! وہ ریلوے والوں نے۔" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"ان کا بھی دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔" انچارج نے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"معاف کیجئے گا جناب! شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے آپ کا نام معلوم کرسکتا ہوں۔"

"جی، جی ہاں۔ منصور۔ میرا نام منصور ہے۔" اس کے منہ سے نکلا اور انچارج نے ایک مرتبہ پھر اس سے معذرت کرکے اسے رخصت کردیا۔

منصور کا دماغ گھوم رہا تھا۔ تھوڑی دیر قبل کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ تھے لیکن وہ کیا خواب تھا سب کچھ اور پھر وہ کہاں سے آرہا تھا اور ٹکٹ اس کی جیب میں کہاں سے آگیا۔ دفعتاً اس انگوٹھی کا خیال آیا جو اژدہے کے سر کی شکل رکھتی تھی اس نے چونک کر اپنی انگلی کی طرف دیکھا اور ششدر رہ گیا۔

تو کیا یہ سب کچھ خواب نہیں ہے۔ اس کا نام التاش بھی ہے۔ منصور بھی۔ اور پھر اس کا دل آبانا کے خیال سے دھڑکنے لگا۔ آبانا جسے وہ روتی چھوڑ آیا تھا۔ نہ جانے کب تک اس کے جسم کو خاک میں تڑپنا پڑے۔ اسے روح کا لباس چاہئے تھا۔ روح کا لباس اب کیا کرے۔ کہاں جائے؟ تب اسے احسان علی یاد آئے۔ اپنی ماں یاد آئی بہن یاد آئی وہ بے قرار ہوگیا۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہے۔ نہ جانے کتنے دن وہ ان سے جدا رہا۔ دوسرے لمحے بیقراری سے وہ آگے بڑھ گیا۔

احسان علی کو بیماری کی وجہ سے ریٹائر کردیا گیا تھا وہ بستر سے لگے ہوئے تھے۔

بیٹی رات دن روتے رہتے تھے پڑوس کے لوگ ہی ان کی مدد کرتے تھے۔ خود دار احسان علی نے راشد کے مزید احسانات قبول نہیں کئے تھے۔ وہ ایک جوان بیٹی کے باپ تھے اور کسی جوان لڑکے کے احسانات ان پر انگشت نمائی بھی کرسکتے تھے۔

راشد اس بات پر بہت کڑھتا تھا لیکن مجبور تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار ان لوگوں کے پاس ضرور آتا تھا۔ اس نے منصور کی ماں کو بھی بہت سمجھایا۔ انہیں یاد دلایا کہ وہ ان کے بیٹے کا دوست ہے لیکن وفا پرست بیوی شوہر کی مرضی کے خلاف کیسے کرسکتی تھی۔ وہ راشد سے بہت محبت کرتی تھی اس کی خواہش تھی کہ لبنیٰ کے ساتھ راشد کی شادی کردے لیکن موجودہ حالات میں یہ تصور بھی مضحکہ خیز تھا۔ ہاں ایک آس ضرور تھی۔ ممکن ہے گم شدہ بیٹا واپس آجائے اور یہی آس زندگی کا سہارا تھی۔

آج احسان علی کی حالت کچھ ٹھیک تھی وہ اٹھ کر بیٹھے تھے اس لئے سب کے چہروں پر رونق آگئی تھی۔

"نہ جانے کیا بات ہے عظمیٰ۔ آج دل کو ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہورہا ہے۔ کچھ عجیب سی امنگیں جاگ رہی ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے بیماری ہی نہ ہو۔ دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو موت نے آخری سنبھالا دیا ہے کہ دل کی حسرت نکال لو۔ یا .... زندگی لوٹ آئی ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کریں سرتاج! خدا میری زندگی آپ کو دے دے۔ آپ ہی کے دم سے تو ہم زندہ ہیں۔" بیوی نے کہا۔

"ارے میں تمہیں کیا دے رہا ہوں۔ کیا دیا ہے میں نے تمہیں، اور پھر اب زندگی بے مزہ ہے۔ منصور کی آس آنکھیں روشن کئے ہوئے ہے ورنہ.........!" اور منصور کے خیال سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور عظمیٰ نے آنسو پونچھ ڈالے۔

"شاید کرم خان کی بیوی دلیہ لائی ہیں۔ کہہ گئی تھیں کہ دلیہ پکا ہے لائیں گی بھیا کے لئے۔"

"کیا دن آگئے۔" احسان علی پھیکے انداز میں ہنستے ہوئے بولے۔ "ہم پڑوسیوں کی بھیک پر زندگی گزار رہے ہیں۔"

عظمیٰ نے کوئی جواب نہ دیا اور بیٹی کو پکار کر کہنے لگیں۔

"لبنیٰ! بیٹی دروازہ کھول دو۔ خالہ آئی ہیں۔" اور باورچی خانے سے لبنیٰ نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا.......... اور پھر اس کی چیخ سن کر احسان علی اور عظمیٰ چونک پڑے۔ "کیا ہوا' کیا ہوا؟" احسان علی اپنی بیماری بھول کر بستر سے اتر آئے۔ عظمیٰ بھی دروازے کی طرف دوڑیں اور پھر ان کی چیخ لبنیٰ سے بھی کہیں زیادہ بلند تھی۔ ان کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ "منصور!" اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ منصور تیزی سے ماں کی طرف لپکا۔

احسان علی کے گھر کی بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ ان کی تمام بیماری ختم ہو گئی تھی۔ آخر خدا نے ان بے کسوں کی فریاد سن لی تھی منصور بہ شکل منصور واپس آیا تھا اور احسان علی اس ہر شخص کے شکر گزار تھے جس نے ان کی مدد کی تھی۔ ان لوگوں میں راشد سرفہرست تھا۔ راشد کو منصور کی واپسی کا تار دیا گیا تھا اور تار ملنے کے چند گھنٹوں کے اندر وہ قصبہ پہنچ گیا۔

"احسان چچا نے تو مجھے قبول ہی نہیں کیا تھا اپنوں میں۔ کیا تم بھی مجھے کچھ حق نہ دو گے!" تمام ہنگاموں کے بعد راشد نے کہا۔

"کیا مطلب راشد؟" منصور نے کہا۔

"میں تم لوگوں کو شہر لے جاؤں گا۔ میں تمہارے لئے کسی ملازمت کا بندوبست کروں گا اور ہم سب مل کر رہیں گے۔"

"ہاں راشد! ان لوگوں کے لئے تمہارا سہارا ضروری ہے میں تو مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ نہ جانے کب واپس چلا جاؤں۔ میں سب کو تیار کروں گا۔ ہم شہر چلیں گے راشد! میں کوشش کر کے بہن کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا اور اس کے بعد.......... اس کے بعد..........!"

"مگر تم جاؤ گے کہاں؟" راشد نے حیرت سے پوچھا۔

"آکاشیہ۔ جو میرا وطن ہے۔ جہاں میری محبوبہ میرا انتظار کر رہی ہے۔" منصور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

راشد نے گھبرائے ہوئے انداز میں منصور کی شکل دیکھی کیا پھر اسے دورہ پڑنے والا

ہے لیکن منصور نارمل تھا۔

"کیا تم مذاق کر رہے ہو منصور؟" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"نہیں راشد! میں الناش ہوں۔ درحقیقت میں الناش ہوں۔ تم ہمیشہ مجھے جھٹلاتے رہے ہو۔ میں الناش ہوں راشد! میں اپنی دنیا میں لوٹ گیا تھا۔ میرے پرستاروں نے میرا استقبال کیا۔ آبانا نے میری راہ میں پلکیں بچھا دیں وہ میری آمد سے بے حد خوش تھے۔ میں خاکی لباس میں تھا جبکہ خاک کے لباس کو وہاں قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب میں روح کے لباس میں وہاں جاؤں گا اور آبانا کو ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گا اور.........."

"منصور.......... منصور ہوش میں آؤ.......... خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔"

"میری واپسی میں ابھی طویل مدت ہے راشد اور میں اس دنیا کا منصور ہی ہوں۔ فکر مت کرو۔ میرے اوپر پاگل پن کا دورہ نہیں پڑ رہا۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"مگر تم پھر وہی باتیں کر رہے ہو دوست! تم پھر..........!"

"میں نے غلط نہیں کہا۔ دیکھو یقین نہ آئے تو یہ نشان دیکھ لو۔ یہ آکاشیہ کا قومی نشان ہے۔" اس نے انگوٹھی سامنے کر دی اور پھر پُرخیال لہجے میں بولا۔

"شہنشاہ زوران نے کہا تھا۔ تمہاری دنیا تمہارے لئے آسان کر دی جائے گی۔ ابھی تو میری دنیا میرے لئے آسان نہیں ہے۔ کیا آسانی کی گئی ہے اس دنیا میں میرے لئے..........!"

راشد متحیرانہ نظروں سے انگوٹھی دیکھنے لگا۔ یہ انگوٹھی بلاشبہ اس نے پہلے کبھی منصور کے پاس نہ دیکھی تھی۔ بہرحال اسے اندازہ ہو گیا کہ منصور سنجیدہ ہے۔ وہ یہ سب کچھ مذاق میں نہیں کہہ رہا تھا۔

اور پھر منصور نے راشد کی پیشکش والدین کے سامنے دہرا دی۔ احسان علی بولے۔

"تم جیسا مناسب سمجھو کرو بیٹے۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال پرورش پا رہا ہے۔ راشد بلاشبہ ایک شریف اور نیک لڑکا ہے لبنیٰ کی شادی کے فرض سے بھی ہم سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اگر..........!"

"یہ سب کچھ شہر چل کر سوچیں گے ابا جان۔ ہمیں شہر جانا چاہئے۔" منصور نے کہا اور احسان علی کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

منصور بھی واپس اپنے کمرے میں آکر اسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب جبکہ لبنیٰ کی شادی راشد کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ راشد کا مزید احسان مناسب نہیں تھا۔ کیا شہر چل کر اس کے رحم و کرم پر رہنا مناسب تھا۔ ہرگز نہیں۔ اس طرح لبنیٰ ہمیشہ کے لئے زیر بار ہو جائے گی۔ پھر شہر جانے کے لئے رقم کہاں سے آئے۔

اور اسی وقت اسکے کانوں میں زوران کی آواز گونجی۔ "دنیا تمہارے لئے آسان کردی جائے گی۔" یہ آواز کمرے کے ایک کونے سے آئی تھی۔ منصور کی نگاہ اس طرف اٹھ گئی اور وہ اچھل پڑا۔ کمرے میں ایک سفید ہیولا سا نظر آرہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ ہیولا آہستہ آہستہ آگے بڑھ آیا اور منصور اسے پہچان گیا۔ یہ آشیش کے معبد کا ایک پجاری تھا اور اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی چیز ایک صندوق تھا جسے اس نے منصور کے سامنے کھول دیا صندوق میں اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے تھے پھر اس نے گردن جھکا کر کہا۔

"زوران کا مقدس نشان تمہارے پاس موجود ہے التاش جو طلب کرو گے اسی وقت مل جائے گا۔ دنیا کی چیزوں کی تمہیں کمی نہ ہوگی لیکن اپنا عہد یاد رکھنا۔"

آج منصور کی عمر ستر سال سے اوپر ہے۔ وہ شہر کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ لبنیٰ راشد کی شریکِ حیات ہے۔ اس کے بیٹے بیٹیاں۔ پوتے پوتیاں موجود ہیں سب عیش کی زندگی گذار رہے ہیں لیکن منصور اپنی عظیم الشان کوٹھی میں تنہا رہتا ہے۔ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا ہے کوٹھی میں بے شمار ملازم ہیں لیکن انہیں ایک مخصوص حصے تک آنے کی اجازت ہے۔ کوٹھی کا بقیہ علاقہ ایک سبزہ زار ہے۔ کوئی نہیں جا منصور وہاں کیا کرتا ہے۔ لبنیٰ کے بچوں سے وہ بے انتہا محبت کرتا ہے۔ اس کی کہانی بچوں کو بھی معلوم ہے اور کبھی کبھی شرارت سے اسے التاش ماموں یا التاش نانا کے نا سے بھی پکار لیتے ہیں۔ اس وقت منصور کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور پھر وہ کئی کئی دن کو کے اس پُراسرار حصے میں گزارتا ہے۔ شاید روتے ہوئے۔ گڑگڑاتے ہوئے کہ اس زندگی کے تار ٹوٹ جائیں اور روح کا لباس مل جائے تاکہ وہ اس کے انتظار میں آنکھ بچھائے' آبانا کو جاکر سینے سے لگائے۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جائے۔

لیکن.......... کون جانے اسے کتنی زندگی گذارنی ہے..........؟

☆======☆======☆

ساتویں قربانی

ایک ہندو لڑکی کی بدروح کی ہولناک کہانی
وہ اپنے محبوب کو زندہ کرنے کے لئے چھ
انسان کو بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ پھر جب
ساتویں قربانی کا وقت آیا تو......

ہمارا شجرہ نسب امین پور کے قدیم نوابی خاندان سے ملتا ہے۔ امین الدین احمد جنگ مجاہد میرے کسی پشت کے دادا لگتے تھے اور نوابوں کی شان تو نوابی ہی ہوتی ہے یا تو ذرا خدا پرست ہوئے یا پھر............

لیکن میں اپنے اجداد کے بارے میں کوئی نازیبا جملہ نہیں کہوں گا کیونکہ بہرحال ان کا خون میری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔ بہرحال امین پور اب مختلف ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے اور یہاں بہت سے لوگوں کی جائیدادیں ہیں۔ اگر ایک مالک ہوتا تو شاید امین پور کا نام اب امین پور بھی نہ ہوتا لیکن چونکہ اب وہ کسی ایک شخص کی جائیداد نہیں ہے اس لئے اس کا نام امین پور ہی رہنے دیا گیا ہے۔ امین پور کی عظیم الشان حویلی اب بھی میرے قبضے میں ہے اور میرا پورا خاندان وہیں رہتا ہے۔ ممکن ہے یہ حویلی بھی فروخت ہو کر نوابیت کی بھینٹ چڑھ گئی ہوتی لیکن میرے والد صاحب بلکہ یوں کہنا چاہئے دادا حضور اپنے اجداد کے نقش قدم پر نہیں چلے اور انہوں نے تھوڑے بچے کو بہت جانا۔ جانتے تھے کہ بیٹے کو ورثے میں نوابیت نہیں دے سکتے۔ انہوں نے اطمینان سے میرے والد کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلائی اور میرے والد نے ڈاکٹر بن کر اس حویلی کی عزت بچالی۔ لکھنؤ میں انہوں نے مطب کھولا اور سترہ سال تک بہترین ڈاکٹروں میں شمار ہوتے رہے۔ باقی افراد امین پور ہی میں تھے۔ والد صاحب ہفتے میں ایک دن امین پور آتے تھے۔ دوسرا دن رہتے تھے اور تیسرے دن صبح صبح ہی لکھنؤ چلے جاتے تھے۔

بہرحال والد صاحب کے ہاتھ نسخہ آگیا تھا اس لئے انہوں نے مجھے ڈاکٹر ہی بنانے

کی ٹھانی تاکہ ان کے بعد اس خاندان کی عزت کا رکھوالا میں بن جاؤں اور دس بیس چاند میں بھی اس حویلی میں لگادوں۔

چنانچہ میں چاند کی تلاش میں لندن چلا گیا اور پھر بہت سے چاند لے کر وطن واپس آگیا۔

ڈاکٹری کی اعلیٰ ترین سند والد صاحب کے سامنے ڈال دی۔ والد صاحب اس دوران لکھنؤ چھوڑ چکے تھے اور اب انہوں نے امین پور میں ہی اپنا کلینک کھول لیا تھا۔ میرے وطن پہنچنے کی خوشی سے سب کے چہرے کھل اٹھے تھے' والدہ صاحبہ خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں بہنیں نثار ہو رہی تھیں ابا جان کی خوشی کا اظہار ان کے کھلے ہوئے چہرے سے ہو رہا تھا۔

انہوں نے ایک نشست میں مجھ سے کہا۔ "بیٹے نعمان میں نے ساری عمر کوشش کر کے اس خاندان کی عزت برقرار رکھی ہے اور اب یہ ذمہ داری تمہارے کاندھے پر آپڑی ہے' دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب تم یہ ذمہ داری کس انداز میں پوری کرتے ہو۔"

"آپ کے مشورے میرے لئے مشعل راہ ہوں گے ابا جان۔ فرمایئے۔" میں نے سعادتمندی سے کہا۔

"بیٹے یوں تو انسان کو زندگی گزارنے کے لئے دولت کی بے پناہ ضرورت پڑتی ہے اور اس کے بغیر صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ انسانی اقدار بھی ذہن میں رکھنا ہوتی ہیں۔"

"یقیناً ابا جان انسانی اقدار تو بہرصورت زندگی کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن میں اب بھی آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔"

"بیٹے میں جانتا ہوں کہ بہرصورت تم نے بھی اپنی زندگی کے لئے راستے متعین کئے ہوں گے' یقیناً کچھ خیالات تمہارے ذہن میں بھی ہوں گے۔ تم اگر چاہو تو مجھے بتادو اس کے بعد اگر کوئی ترمیم ہوئی تو تمہارے گوش گزار کردوں گا۔"

"آپ مجھے شرمندہ نہ کریں ابا جان میں صرف آپ کی راہنمائی چاہتا ہوں۔"

"اس کے باوجود تم نے کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"ہاں بس اسی حد تک کہ اپنے وطن جاکر اپنا ایک کلینک کھولوں گا اور اباجان بخل سے کام نہ لوں گا نہ ہی اپنے الفاظ میں غنی بننے کی کوشش کروں گا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ دولت بھی کماؤں گا اور اپنے ہم وطنوں کی خدمت بھی کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں دولت کمانے کا تصور برا نہیں ہے' ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ایک مکمل اسٹیج پر پہنچنے کے بعد اپنے حالات کو بہتر بنائے' اپنے خوش آئند حالات کو برقرار رکھے۔ اللہ کا شکر ہے بیٹے کہ ہمارے آباؤ اجداد جو کچھ کھو چکے تھے میں نے اس میں سے بہت کچھ حاصل کرلیا ہے اور تمہارے لئے کم از کم وہ کیفیت نہیں ہے جو میرے لئے پیدا ہوگئی تھی۔

لکھنؤ میں کلینک بنانے کا خیال میرے ذہن میں یوں آیا تھا کہ مجھے اپنے خاندان کے لئے' تمہارے لئے اور خود اپنے لئے بہت کچھ کرنا تھا' چنانچہ میں تمہیں اپنی کارکردگی سے متاثر نہیں کرنا چاہتا البتہ میں یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ میں نے نہ صرف اپنے خاندان کی عزت بحال کی بلکہ جس خدمت کا تصور میرے ذہن میں تھا میں نے اسے بھی انجام دینے کی کوشش کی۔

اب میری کوششیں کس حد تک کامیاب ہوئیں' اس کے بارے میں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جہاں میری کوتاہیاں ہیں وہاں میں اس سے معافی کا طالب ہوں لیکن بیٹے میرے اپنے خیال کے مطابق اس کلینک سے میں نے اچھی خاصی دولت جمع کی اور وقت بچا اس سے ان نادار لوگوں کی خدمت کی جو دولت خرچ نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے لکھنؤ کے قرب وجوار میں چھوٹے چھوٹے کلینک کھولے ہوئے تھے جن میں کچھ وقت میں وہاں بھی دیا کرتا تھا۔ اور یہ میری روح کے سکون کا باعث تھا۔ بیٹے دولت بے شک اچھی چیز ہے لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔"

"جی اباجان۔" میں نے ادب سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم کسی ایسے چھوٹے علاقے میں اپنا کلینک قائم کرو جہاں قرب وجوار کے لوگ تم سے استفادہ حاصل کرسکیں' بے شک میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا علاج مفت کرو۔ ہاں جو جس قابل ہو اس سے اتنا ہی طلب کرو۔ میرا خیال ہے

چھوٹا چھوٹا سلسلہ بھی کافی ہوسکتا ہے اور تمہیں ان غریب لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے پر اللہ بھی جزا دے گا۔ باقی میں تم سے کسی اور چیز کا طالب نہیں ہوں۔"

میرے ذہن میں ہمیشہ اپنے وطن کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے دلچسپی تھی۔ میں اس کلاسیکی زندگی کو والہانہ انداز میں چاہتا تھا جو ہمارے وطن کے دیہاتیوں کی تھی۔ میں ان دیہاتیوں کے مسائل سے بھی خوب واقف تھا' غیر ملک میں رہ کر اپنے وطن کی بہت سی باتیں یاد آتی تھیں اور دل ہی دل میں یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ نے مجھے کسی قابل کردیا تو اس کے دیئے ہوئے عطیہ کو میں ان لوگوں پر ضرور خرچ کروں گا جو میرے وطن کے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور جن کے پاس وسائل نہیں ہیں..........

میرے دل میں یہ بھی خواہش تھی کہ میرے والد صاحب نے جتنا کچھ میرے اوپر خرچ کیا ہے' انہوں نے جو محنت کی ہے اس کا صلہ کم از کم انہیں اسی شکل میں ملنا چاہئے کہ وہ جس مشن کو لے کر آگے بڑھے ہیں میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں اور اپنے خاندان کی وہ عزت بحال کردوں جو کسی زمانہ میں تھی۔ ٹھیک ہے نوابی دور ختم ہوگیا تھا لیکن نوابوں کی آن بان اب بھی باقی تھی۔ ہمارے خاندان کو اسی خاندان کے نام ہی سے یاد کیا جاتا تھا چنانچہ اس کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ ہم اپنی روایات کا تقدس رکھنے کی کوشش کریں جو ہمارے خاندان سے منسلک تھیں۔

اس لئے میرے لئے بھی ضروری تھا کہ میں بھی دولت کماؤں لیکن والد صاحب کی خواہش سے میری ہی خواہش کی تکمیل ہورہی تھی چنانچہ میں نے ان کی خواہش کو قبول کرلیا اور کہا۔

"درست اباجان۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کے ان لوگوں کی خدمت کروں جو مکمل طور پر دنیاوی سہولتوں سے بہت دور ہیں۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی' اگر یہ آپ کی خواہش ہے تو سمجھ لیں کہ یہ میری بھی خواہش ہے اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے میں آپ کا دل وجان سے احسان مند ہوں میں آپ کے دیئے ہوئے علم کو اتنا آگے بڑھانا چاہتا ہوں کہ لوگ ہمیں یاد کریں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" اباجان نے کہا اور ہم نے تیاریاں شروع کردیں۔

اباجان نے قرب وجوار کو چھانا اور پھر عظیم پورہ نامی بستی میں کلینک کھولنے کا

فیصلہ کیا گیا۔

اس بستی سے بہت ساری بستیاں منسلک تھیں۔ عظیم پورہ کو ایک چھوٹا سا قصبہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

خوبصورت سرسبز علاقہ مجھے بھی بے حد پسند آیا تھا' سادہ لوح دیہاتیوں کی زی جن کے بے شمار مسائل تھے لیکن انہیں حل کرنے کے وسائل ان معصوم لوگوں کے پاس نہیں تھے۔

چھوٹے چھوٹے کچے مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ بعض مکا خوبصورت بھی تھے۔ پھر ہم نے جلد ہی ایک جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں کلینک کی تعمیر شروع ہو گئی۔

بستی کے لوگوں نے ہمارے اس خیال کو بہت سراہا تھا اتنے بڑے قصبے اور ا کی آبادی کے لئے کسی ڈسپنسری کا بندوبست نہیں تھا اور جو ڈسپنسری موجود تھی' ا کے بارے میں تذکرہ فضول تھا۔ بس یوں کہنا چاہئے کہ ڈسپنسری منتظمین کی ناکردگی شاہکار تھی' اس میں ڈاکٹرز کی بجائے صرف کمپاؤڈر تھے۔ مریضوں کے لئے کوئی بند نہیں تھا اور خیر دواؤں کا ہونا تو ضروری ہوتا نہیں۔ وہاں کی کسمپرسی دیکھ کر مجھے ب پناہ دکھ ہوا' ظاہر ہے میں ان تمام مسائل سے نمٹ نہیں سکتا تھا لیکن اپنا فرض تو ا کر سکتا تھا۔

چنانچہ وہاں کے لوگ علاج کرانے کے لئے کافی کافی دور جایا کرتے تھے اور ا بیچاروں کو علاج کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا.........

بستی کے سربر آوردہ لوگوں نے ہم سے تعاون کی پیش کش کی اور جس شخص سے جو کام نکل سکتا تھا ہم نے بھی اس میں تعرض نہیں کیا۔ اب میرا اور والد صاحب کا زیادہ وقت اس کلینک کی تعمیر میں صرف ہو رہا تھا۔

بڑی خوبصورت عمارت بنوائی تھی ہم نے ایسی عمارت پورے علاقے میں تھی۔

پھر جب کلینک کی تعمیر ہو گئی تو میری درخواست پر میرے والد صاحب نے ہی ا کا افتتاح کیا اور اس کے بعد ہم نے اس میں اسٹاف مہیا کیا' چند افراد مقامی بھی تھے

یوں یہ کلینک شروع ہو گیا۔

ابتدا ہی میں بہت سارے مریض جو بے چارے شہر جانے کے قابل نہیں تھے اور کافی دنوں سے بیماریوں کو بھگت رہے تھے۔ آنا شروع ہو گئے۔ سب کے سب بڑے ممنون و مشکور تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنا شروع کر دیا اور ابتدا ہی میں کلینک بہت اچھا چل پڑا۔

میرے ملاقاتیوں میں تحصیلدار صاحب بھی تھے' زمیندار بھی اور کرشن لال بزاز بھی۔ سب ہی لوگوں سے میں یکساں طور پر پیش آتا تھا۔ سب ہی مجھ سے خوش تھے۔ خدائی مدد بھی شامل تھی۔ کیونکہ میں ان لوگوں سے مخلص تھا۔ اس لئے میرے علاج سے آج تک کسی مریض کو مایوسی نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر ان غریبوں سے اچھا سلوک ہو تو یہ بے دام غلام بن جاتے ہیں جسے دیکھو میرا شیدائی' جسے دیکھو میرا دیوانہ۔ جس کی جو استطاعت تھی میرے لئے لیے چلا آتا تھا۔

والد صاحب' والدہ' بہنیں بھی کبھی کبھی آ جاتی تھیں اور میرے ساتھ رہتی تھیں۔ قصبے کی عورتیں ان کے سامنے بچھ جاتی تھیں۔ غرض میں نہایت پرسکون اور مسرور زندگی گزار رہا تھا۔ آمدنی بھی بری نہیں تھی۔ گو میں علاج کے عوض بہت معمولی رقم وصول کرتا تھا لیکن مریضوں کی تعداد کافی تھی اور دور دور سے مریض آیا کرتے تھے۔

پھر کرشن لال بزاز نے اپنی بیٹی کی شادی کی تو بڑے خلوص سے مجھے بلایا اور میں بھی پورے خلوص سے اس کے ہاں گیا اور اس کی بیٹی کے لئے کنیادان کیا۔

ایسی زندگی سے کب اکتاہٹ ہوتی ہے میں سب کی آنکھوں کا تارا تھا والد صاحب اور والدہ بہت خوش تھے۔ اکثر پندرھویں دن ان سے ملاقات کے لئے جاتا تھا۔

ایک بار جب میں گیا تو والدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"نعمان بیٹے۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تم سے بات کروں' لیکن بس اتفاق نہیں ہو سکا!"

"فرمائیے امی جان؟"

"تم نے بے شک ہماری ہر بات سعادت مندی سے قبول کی ہے اور ان بیٹوں میں سے ہو جن پر ناز کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ کا شکریہ امی.......... میں خوش نصیب ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے خوش ہیں۔"

"ہمارے ذہن میں اور بھی بہت سی آرزوئیں ہیں نعمان۔"

"فرمائیے امی۔"

"نعمان.......... انسان کی زندگی ایک مخصوص انداز کی حامل ہوتی ہے۔ یوں سمجھو زندگی کے مراحل اور فرائض یکساں ہوتے ہیں.........."

"جی امی!"

"تمہاری زندگی بھی قدم بہ قدم وہی منازل طے کرتی رہی ہے اور اس میں کوئی تحریک ممکن نہیں ہے۔"

"آپ پس و پیش کیوں کر رہی ہیں امی جان۔ فرمائیے میرے لئے کیا حکم ہے۔ بے تکلفی سے کہہ دیں۔"

"ہم اب تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"شادی؟" میں چونک پڑا۔

"ہاں۔ زندگی کی ایک اور منزل، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں امی لیکن.........."

"لیکن کیا؟"

"میں آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتا لیکن میرے اپنے ذہن میں اور خیالات تھے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"کیا؟"

"میں چاہتا تھا امی.........." میں نے ہچکچاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں کہو؟"

"دراصل مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں ہے امی کہ زندگی کو مختلف منا

درکار ہوتی ہیں لیکن ایک منزل پر مضبوطی سے قدم جمانے کے بعد ہی دوسری منزل کا انتخاب بہتر ہوتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی؟" امی نے کہا۔

"میں ابھی اپنی لائن.......... کو مکمل نہیں پاتا۔"

"کیوں؟"

"دیکھئے نا امی۔ ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ شہر کے مختلف علاقوں میں اور کلینک کھولے جائیں۔"

"ضرور کھولو۔" امی نے کہا۔

"اس کے لئے وقت درکار ہے امی۔"

"ہاں یقیناً۔"

"کیا شادی اس کی اجازت دے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے سے پہلے دوسری ذمہ داری کو قبول کر لینا مناسب نہیں ہوتا۔"

"بالکل ٹھیک کہا لیکن بعض ذمہ داریاں زندگی کا اہم حصہ ہوتی ہیں اور انہیں قبول کر کے پھر زندگی کو اور بہت سی سہولتیں مل جاتی ہیں اور انسان زیادہ سکون سے زندگی بسر کرتا ہے۔" امی نے کہا۔

"بے شک امی لیکن.........."

"دیکھو نعمان.......... وقت پرانی روایات کو پیچھے دھکیل کر بہت آگے بڑھ گیا ہے ہمارے خاندان میں لڑکے اور لڑکیاں یکساں حیثیت رکھتے تھے اور ان کے والدین ہی ان کی قسمتوں کے فیصلے کرتے تھے لیکن اب ہم نے بھی سوچ کا انداز بدل دیا ہے اور اسے وقت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"جی!"

"اس لئے تمہاری شریک زندگی کے انتخاب میں تمہاری پسند کا پورا خیال رکھا

جائے گا۔"

"اوہ امی آپ۔"

"ہاں۔ اگر خود تمہارے ذہن میں کوئی تصور ہے اور اگر تم زبانی نہ کہہ سکو پرچا لکھ کر دے دو۔"

"اوہ۔ امی آپ کے خیال میں.........."

"ہاں کوئی بری بات نہیں ہے زندگی کا ساتھی حسب پسند ہونا چاہئے۔ یہ اجازت نہ صرف میں نے بلکہ تمہارے اباجان نے بھی تمہیں دی ہے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تو اباجان کی بھی یہی خواہش ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"لیکن امی میری یہ درخواست آپ منظور نہیں کر سکتیں۔ میں ابھی ایک منزل پر خود کو مضبوط نہیں پاتا۔ یہاں سے نمٹ لوں تو آگے کی زندگی کے بارے میں سوچوں گا مجھے تھوڑی مہلت درکار ہے۔"

"ٹھیک ہے وہی ہو گا جو تم چاہو گے لیکن کچھ تو ہمیں بھی کرنے دو۔"

"مثلاً امی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ذہن میں اگر کوئی لڑکی ہے تو اس کے بارے میں بتاؤ۔" امی جان نے کہا اور میں ہنس پڑا۔

"آپ کے خیال میں مَیں اسی وجہ سے پس و پیش کر رہا ہوں۔"

"اور میں اسے برا بھی نہیں سمجھتی۔"

"بس آپ سمجھ لیں کہ ابھی اس طرف ذہن ہی نہیں گیا۔ چنانچہ یہ خیال آپ ذہن سے نکال دیں۔"

"گویا کوئی لڑکی نہیں؟"

"جی۔ کوئی نہیں۔"

"مجھے تم پر فخر ہے نعمان ورنہ لوگ ملک سے باہر رہ کر بہت بدل جاتے ہیں۔"

"میں نہیں بدلا امی۔"

"تب ہمیں اجازت دو کہ ہم اپنے طور پر کچھ کریں۔"

"وہ کیا؟"

"تمہارے لئے رشتے کی تلاش۔"

"آپ مجھ سے اجازت طلب کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں لیکن مجھے کچھ وقت درکار ہو گا۔"

"ایسے کام بھی چٹ پٹ نہیں ہوتے وقت لگے گا۔ بہرحال اب یہ کام ہمارا ہے کہ تمہارے لئے زندگی کے ساتھی کا انتخاب کریں۔ ایسے ساتھی کا جو حقیقی معنوں میں ساتھی ہو۔"

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے امی۔" میں نے کہا۔ بہرحال میں واپس آ گیا لیکن امی نے میرے ذہن میں ایک تصور پیدا کر دیا تھا اور اب اکثر تنہا اوقات میں' میرے ذہن میں اس حسین ساتھی کا تصور ابھر آتا۔

لیکن میں اپنے ذہن کو سنبھال لیا کرتا تھا کیونکہ ابھی یہ تصور میرے لئے زیادہ اچھا نہیں تھا' مجھے تو اپنی زندگی میں بہت سارے کام انجام دینے تھے۔

وقت یونہی گزرتا رہا' میرے کلینک میں توسیع ہوتی چلی گئی جتنی بڑی عمارت ہم نے بنوائی تھی اس میں ساری ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ عمارت سے ملحقہ ایک جگہ کو دیکھ کر میں نے ہسپتال کی عمارت کو وسیع کرنے کا پروگرام بنایا۔ جلد ہی مزدوروں نے کام کر دیا۔

اسی دوران ہمارے علاقے کے ایک قریبی زمیندار محمد حسین کے لڑکے کی شادی ہوئی۔

زمیندار محمد حسین نے مجھ سے علاج کرایا تھا اور انہیں مکمل شفا ہوئی تھی۔ وہ عظیم پورہ سے آگے تقریباً پانچ میل ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ وہ گاؤں ان کا اپنا تھا۔ اچھی خاصی حیثیت تھی۔ مالدار آدمی تھے اور مجھ سے پورا پورا وعدہ لیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ شادی میں ضرور شرکت کریں گے' ورنہ آپ سوچ لیں

کہ میں پھر کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔

محمد حسین کے اس اصرار سے میں بہت متاثر ہوا تھا' چنانچہ میں نے وعدہ کرلیا کہ ان کے بیٹے کی شادی میں ضرور شریک ہوں گا۔

☆======☆======☆

وقتِ مقررہ پر شادی میں شرکت کے لئے چل پڑا اور اپنی خوبصورت کار میں محمد حسین کی بستی میں پہنچ گیا۔

پورا گاؤں اس شادی میں شریک تھا' ہر سُو خوشیاں منائی جارہی تھیں' دیہاتی سادہ لوح قسم کے لوگ سفید سفید لباس میں بڑے بھلے نظر آرہے تھے۔ لڑکیاں رنگین جوڑے پہنے' ہاتھوں میں مہدی رچائے' چہرے پر زیورات سجائے' ہنستی کلکتی پھر رہی تھیں۔ ظاہر ہے زمندار کے بیٹے کی شادی تھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

زمیندار کی حویلی کے سامنے ہی میں نے چند کاریں دیکھیں یقیناً یہ لوگ شہر سے آئے ہوں گے۔

محمد حسین نے جس طرح آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا تھا اس سے اس کے تپاک اور پُرجوش انداز کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا جس کی شادی تھی وہ بھی میرے پاس آیا اور اس نے نہایت پُر تکلف انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے یہاں آکر ہماری عزت بڑھائی ہے۔"

میں مسکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ تب محمد حسین آگے بڑھ کر مجھے مہمانوں میں لے چلا۔

باہر سے آنے والوں میں چند معزز لوگ نظر آرہے تھے' ان میں ایک وجیہہ اور دراز قامت نوجوان نے مجھے امپرس کیا۔ میرا اس سے تعارف محمد حسین نے ہی کرایا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ان سے ملئے یہ بہزاد صاحب ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بہزاد صاحب۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے

ہوئے کہا۔

اور بہزاد نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب ہیں بہزاد صاحب' ڈاکٹر نعمان۔ بہت عرصے سے یہاں دھوم مچا رکھی ہے۔"

"اوہ ڈاکٹر نعمان۔ بڑی تعریفیں سن رکھی ہیں بھئی آپ کی' آج آپ سے ملاقات بھی ہو گئی۔" بہزاد نہایت پُرتپاک انداز میں آگے بڑھا اور بہرحال میں اس شخص کے خلوص سے متاثر ہوا تھا۔

"ویسے اللہ کا شکر ہے نعمان صاحب میں تندرست ہوں وگرنہ کبھی بیمار ہوتا تو ان لوگوں کی زبان سے آپ کی تعریفیں سن سن کر اتنا اشتیاق تو ہو چکا تھا کہ یقیناً آپ ہی کے پاس آتا۔ بہرحال نہ جانے کس کی بدقسمتی ہے' میری یا آپ کی۔ میں کبھی بیمار ہی نہیں ہوا۔"

"اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے بہزاد صاحب' آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا' پھر بہزاد میرے ساتھ بیٹھا رہا۔

"بڑی شاندار شخصیت ہے آپ کی ڈاکٹر صاحب' بلاشبہ آپ سے لوگ غلط متاثر نہیں ہوتے۔" بہزاد نے کہا۔

"بہرصورت مسٹر بہزاد شخصیت کی بات آ ہی گئی ہے تو میں یہ کہے بغیر نہ رہوں گا اس معاملے میں آپ بھی بھرپور ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آپ نے تو مجھے بھی متاثر کیا ہے' ہم ڈاکٹر لوگ عام طور پر جذباتی نہیں ہوتے لیکن آپ کے معاملے میں' میں بے حد جذباتی ہو گیا ہوں۔ کیا آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی؟" میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں.........." بہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسی وقت کسی نے بہزاد کو آواز دی۔

"بہزاد.........!" نسوانی آواز تھی اور میں چونک کر اس نسوانی آواز پر غور کرنے لگا۔ بے حد خوبصورت آواز تھی۔ غیر اختیاری طور پر میں نے اس طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر میری نگاہیں اس جگہ جم کر رہ گئیں' حالانکہ بداخلاقی کی بات تھی لیکن

وہ چہرہ وہ شکل ہی ایسی تھی کہ میری توجہ اس طرف سے نہ ہٹ سکی۔

تب بہزاد اٹھتے ہوئے بولا۔ "ارے اس سادہ سے ماحول میں ہم لوگ بھی دیہاتی ہو کر رہ گئے ہیں' آیئے میں آپ کو روشینہ سے ملاؤں۔ آیئے آیئے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور میں غیر اختیاری طور پر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

لڑکی جس کا نام روشینہ لیا گیا تھا جدید ترین لباس میں نہایت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت بھرپور اور مکمل شخصیت کی مالک تھی۔ بہرصورت اتنے مکمل چہرے کم ہی نظر آتے ہیں۔ لباس اس کی شخصیت سے اس قدر ہم آہنگ تھا کہ وہ انتہائی انوکھی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔

"مسز بہزاد.........." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہیں بھئی لیکن تمہارے منہ میں گھی شکر۔" بہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اگر آپ کی دعائیں شامل رہیں تو جلد ہی یہ مسز بہزاد بن جائیں گی۔"

بہزاد نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے ہمارے الفاظ سن لئے تھے اس کے ہونٹوں پر ایک شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"روشینہ ان سے ملو' مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی ان کا نام ضرور سنا ہو گا.........." بہزاد نے کہا۔

"جی آداب۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"یعنی بغیر تعارف کے ہی آداب۔" بہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تعارف کیسے حاصل کروں' آپ خود ہی اس سلسلے میں خاموش سے ہیں۔" لڑکی نے بہزاد سے کہا۔

"میں اپنا تعارف خود ہی کرائے دیتے ہوں' میرا نام نعمان ہے۔"

"اوہو۔ کیا کرتے ہیں آپ؟"

"میں ڈاکٹر ہوں۔"

"اوہ عظیم پورہ کے ڈاکٹر نعمان؟" اس نے کہا۔

"ہاں بھئی' اب تو میں خاصا فخر کرنے لگا ہوں اپنے آپ پر کہ میری شہرت ا
دور دور تک پھیل گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر' بڑا نام سنا ہے آپ کا۔" روشینہ نے گہر
نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میری نگاہیں بھی اتفاقیہ طور پر اس سے جاملیں۔

بڑی پُراسرار آنکھیں تھیں' حالانکہ اس کا چہرہ ایک سادہ سا دلکش چہرہ تھا لیک
آنکھیں' آنکھیں عجیب و غریب کہانیاں سناتی تھیں۔ ایک عجیب سی چمک ان آنکھو
میں تھی جو بری طرح ذہن پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں ذہن
ٹٹول رہی ہوں۔

دوسرے لمحے میں نے اس پر سے نگاہیں اٹھائیں۔ دوبارا اسے دیکھ چکا تھا' ممک
تھا بہزاد اس بات کو مائینڈ کرتا' یوں بھی غیر اخلاقی حرکت تھی یہ۔ ویسے بہزاد ظاہر
زمانہ شناس آدمی تھا۔ تہذیب یافتہ تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات ذہ
میں لائے۔ جس سے میری اپنی ذات کی تحقیر ہو۔ ایک اچھی شخصیت کا ملک تھا اور مجھ
پسند آیا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ میں فطرتاً عورتوں کو تاک جھانک
خواہش نہیں رکھتا تھا لیکن وہ کچھ اس قدر دلچسپ شخصیت کی مالک تھی کہ میں خو
مجبور پا رہا تھا' بہرحال میں نے خود کو سنبھالا دیا۔

"ہاں تو بات ہو رہی تھی مسٹر نعمان' مسز بہزاد کی میرا مطلب ہے ان خاتو
کی.......... روشینہ' خاتون میری منگیتر ہیں اور بہت جلد ہم لوگ یکجا ہو جائی
گے.........." بہزاد نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مسرت ہوئی بہزاد صاحب' لیکن آپ مجھے اس یکجائی میں شامل کرنا نہ بھو
گا۔"

"یعنی کیا مطلب؟"

"میرا مقصد ہے مجھے اپنی شادی میں شریک ضرور کریں۔"

"اوہو' یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' نعمان صاحب۔ آپ یوں سمجھیں کہ آ
کے بغیر شادی ہو ہی نہیں سکے گی۔" بہزاد نے جواب دیا اور میں مسکرانے لگا۔

ذرا سی دیر میں ہم خاصے بے تکلف ہو گئے تھے' روشینہ تھوڑی دیر تک ہمار

ساتھ بیٹھی رہی اور پھر بولی۔

"بہزاد میں ذرا اندر جا رہی ہوں' دلہن کو دیکھوں گی۔"

"ہاں۔ لڑکیوں کو ہمیشہ دلہن دیکھنے کا شوق ہوتا ہے اور اس شوق سے آپ بھی
کہاں پیچھے رہ سکتی ہیں۔" بہزاد نے کہا اور روشینہ چلی گئی۔

میں نے اس کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں سوچی تھی۔ ظاہر ہے وہ بہزاد
کی منگیتر تھی اور پھر وہ ایک دوسرے سے پیار بھی کرتے تھے اور پھر میری یہ عادت
بھی نہ تھی کہ ہر لڑکی کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچوں' بہرصورت وہ لڑکی
مجھے عجیب سی لگی تھی' اس کا چہرہ بے حد خوبصورت تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کی
آنکھیں دیکھنے کے بعد خوبصورتی کا یہ احساس زائل ہو جاتا تھا اور وہ کوئی پُراسرار
شخصیت نظر آنے لگتی تھی۔

بہرحال دوبارہ اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں جب بہزاد چلنے لگا تو اس نے مجھ
سے ہاتھ ملایا' سارے معاملات طے ہو چکے تھے تب محمد حسین سے میں نے بھی اجازت
طلب کی اور کار میں بیٹھ کر چلا آیا۔

کلینک پہنچ کر بھی بہزاد یاد آتا رہا' اچھی خاصی شخصیت کا مالک تھا لیکن نہ جانے
کیوں اس کی آنکھیں دیکھنے کے بعد یہ احساس زائل ہوتا تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس
سے جا کر مل سکتا تھا لیکن بہرحال میری مصروفیت مجھے کہاں اجازت دے سکتی تھی۔
بہرحال جب کبھی کلینک کے کاموں سے فرصت ملتی تھی تو گھر چلا جاتا تھا' وہاں ماں'
بہنیں ان کے علاوہ ابا جان میرا شدت سے انتظار کیا کرتے تھے اور جب میں وہاں پہنچ
جاتا تھا تو گویا ان کے لئے دن عید اور رات شب برات بن جایا کرتی تھی۔

پھر ایک دن تحصیلدار سے ملاقات ہوئی' شکار کا پروگرام تھا میرے پاس اس لئے
آئے تھے کہ میں شکار کھیلنے کے لئے چلوں۔

میں نے ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "تحصیل دار صاحب میرے پاس
فرصت کہاں ہے جو میں شکار کھیلنے چلوں۔"

"بھئی نعمان میرا دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ شکار کھیلا جائے اور تم کم از کم تو دو
دن ہمارے ساتھ رہو۔"

"تحصیلدار صاحب بڑی مشکل پیش آجائے گی؟"

"کیا مشکل پیش آجائے گی؟"

"یہاں کلینک کا مسئلہ ہے اس کے علاوہ مریضوں کی دیکھ بھال بھی ہے۔" میں نے کہا اور تحصیلدار صاحب چڑ گئے۔

"اور یہ جو آپ کے معاون ڈاکٹرز ہیں یہ کیا کریں گے؟" تحصیل دار صاحب نے کہا۔

اور میں سوچنے پر مجبور ہوگیا' نہ جانے کیوں میرے دل میں بھی یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ کیوں نہ گردو نواح کا جائزہ لوں' ذہن بٹے گا اور تھوڑا سا فریش بھی ہو جاؤں گا۔

چنانچہ میں نے اپنے ماتحت ڈاکٹرز سے بات کی اور وہ بخوشی اس بات پر تیار ہوگئے کہ وہ کلینک کا انتظام سنبھالیں گے۔

پہلی مرتبہ میں نے یہ جسارت کی تھی' چنانچہ میں نے تحصیلدار صاحب سے کہا اور تحصیلدار صاحب خوش ہوگئے۔

ایک جیپ میں ہم پانچ افراد سوار ہوئے تحصیلدار صاحب تھے ایک ان کے سالے تھے اور دو ان کے ماتحت تھے جن کے بارے میں تحصیلدار صاحب کا کہنا تھا کہ وہ بہت اچھے شکاری ہیں اور پانچواں میں تھا۔

بہرحال ہم چل پڑے میں پہلی بار عظیم پورہ کے گردو نواح دیکھ رہا تھا۔ بڑا خوبصورت علاقہ تھا۔ ورنہ میں نے تو یہاں آنے کے بعد زیادہ سے زیادہ محمد حسین کی بستی دیکھی تھی اس کے علاوہ میں نے یہاں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال ہم نے یہاں کافی لمبا سفر اختیار کیا تھا۔

تحصیل دار کو جب معلوم ہوا کہ میں چار پانچ روز کی چھٹی کرسکتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے پروگرام کو بڑھا دیا تھا۔ چنانچہ ہم بہت دور نکل گئے تھے۔

پھر ایک شام ہم نے ایک خوبصورت علاقے میں قیام کیا بہت خوبصورت علاقہ تھا سرسبز جنگل تھا اور یہاں شکار وغیرہ بھی کافی نظر آرہا تھا۔ ہم لوگ کافی دیر تک وہیں

رہے' تب تحصیلدار صاحب نے کہا۔

"بھئی نعمان صاحب یہاں سے تھوڑے فاصلے پر فارسٹ ہاؤس ہے' وہاں ہمارا یک دوست رہتا ہے کیوں نہ اس سے ملیں؟"

"فارسٹ ہاؤس میں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" تحصیلدار صاحب نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے آپ کے دوست کا؟"

"بہزاد.........." انہوں نے جواب دیا۔

"اوہ' تو بہزاد فارسٹ ہاؤس میں رہتے ہیں؟"

"ہاں.......... تو کیا تم اسے جانتے ہو۔" تحصیل دار صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"دوستی ہے کیا؟"

"نہیں' بہرحال ملاقات ضرور ہے' اور یہ ملاقات دوستی میں بھی بدل سکتی ہے' مد حسین کے بیٹے کی شادی پر ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد نہیں۔"

"اوہو.......... ہاں.......... میں بھول گیا تھا۔ یقینی طور پر وہ بھی وہاں موجود تھے اور یہ تو اچھی بات تھی' پھر کیوں نہ فارسٹ ہاؤس میں قیام کیا جائے اور بہزاد کو ی اس میں شریک کرلیا جائے۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے تحصیل دار صاحب سے کہا اور پھر ہم گ فارسٹ ہاؤس میں جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگے اس دوران ہم نے دو ہرن کار کئے تھے' شکار کئے ہوئے ہرن ہم نے جیپ میں رکھے اور جیپ میں سوار ہوگئے۔

ہمارا رخ فارسٹ ہاؤس کی طرف تھا۔ فارسٹ ہاؤس کی عمارت درختوں کے رمیان گھری ہوئی تھی بڑی ہی خوبصورت جگہ تھی وہ۔

ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ جیپ کی آواز سن کر فارسٹ ہاؤس کا چوکیدار باہر یا.......... اور جب ہم نے اس سے بہزاد صاحب کے بارے میں پوچھا تو وہ ہمیں ی عزت سے اندر لے گیا اور کچھ دیر کے بعد بہزاد ہم سب کے درمیان تھا۔

میرا خیال تھا کہ بہزاد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگا' لیکن نہ جانے کیوں بہزاد

تحصیل دار صاحب اور دوسرے لوگوں سے مل کر پلٹا تو اس کے چہرے کے تاثر
کچھ عجیب سے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری آمد سے خوش نہ ہوا ہو یا پھر
کوئی الجھن درپیش ہو۔

بہرصورت اخلاق نبھانے کی خاطر وہ میری طرف بڑھا۔ "اوہو ڈاکٹر صا
آپ بھی ہیں بھئی واہ۔ اچھی ملاقات ہوئی۔" میں نے بہزاد کے اس انداز کو
سے دیکھا تھا۔

جس طرح وہ مجھ سے شادی میں ملا تھا وہ انداز تو تھا ہی نہیں، تب میں نے مح
کیا کہ نہ جانے کیا بات ہے، بہزاد کا رویہ حد سے زیادہ سرد تھا۔ بہرحال میری اس
نہ تو زیادہ ملاقاتیں تھیں اور نہ ہی گہری دوستی، میں نے اس کے سرد رویے کو
دیا۔

اس دوران بہزاد نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ ہرن وغیرہ تیار کرلیں
نے خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال شام کو کھانے کے بعد نشست جمی اور چند ساعت کے بعد مجھے اور ب
تنہائی نصیب ہوئی اور میں نے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

"اور بہزاد کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔" بہزاد نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"شادی ہوگئی آپ کی؟" میں نے پوچھا۔

اور بہزاد چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "ابھی نہیں لیکن ہو
والی ہے۔"

نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا، مجھے لگ رہا تھا جیسے بہزا
آمد سے خوش نہ ہو لیکن اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن بہرحا
نے اس سلسلے میں زیادہ سوچنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کوئی رشتہ داری تو تھی
میں کسی بات کو محسوس کرتا میں نے خود کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ہنہ، نہیں
کرتا تو نہ سہی۔ حالانکہ اس کے سرد رویہ کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ بہر
نے وہ رات بہزاد کے ہاں گزاری، دوسرے دن تحصیلدار صاحب نے

پروگرام بنایا۔

بہزاد کو انہوں نے شکار کھیلنے کی پیش کش کی تھی لیکن بہزاد نے یہ کہہ کر انکار
کر دیا تھا۔

"نہیں تحصیل دار صاحب، میں مصروف انسان ہوں، میرے پاس وقت نہیں
ہے اور میں نکال بھی نہیں سکتا۔ میری معذرت قبول فرمایئے۔"

بہرحال ہم لوگ چل پڑے دوسرے علاقوں میں شکار کھیلا گیا اور پھر چوتھے روز
ہم واپس آگئے۔

کلینک کے معمولات حسبِ معمول چل رہے تھے، میری غیر موجودگی سے کوئی
خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ دوسرے ڈاکٹرز نے کام اچھی طرح سے سنبھال لیا تھا اس لئے
میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔ اس طرح میں گھر میں بھی دو چار دن رہ سکتا تھا۔ چنانچہ
چار پانچ روز کے لئے میں نے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔

میرے والدین سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ میں چار پانچ روز کے لئے بھی گھر آسکتا
ہوں چنانچہ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں چار پانچ روز تک گھر رہوں گا تو سارے گھر
میں خوشیاں اور مسرتیں پھیل گئیں۔

تب دوسری رات میری والدہ نے مجھ سے کہا........ "نعمان؟"

"جی امی!" میں مئودب ہوگیا.........

"میں آج پھر تمہارے کان کھانا چاہتی ہوں۔"

"ارے نہیں امی۔ ایسی کوئی بات نہیں، فرمایئے؟" میں نے مستعدی سے کہا۔

"ہم نے تمہارے لئے ایک رشتے کا سلسلہ کیا ہے؟"

"اوہ........" میں پریشان نگاہوں سے امی کو دیکھنے لگا۔

"فاروق احمد صاحب جاگیردار ہیں، شہر میں بھی کاروبار کافی کرتے ہیں اور زبیدہ
ان کی اکلوتی لڑکی ہے، تعلیم یافتہ ہے، سنا ہے سلیقہ شعار اور خوبصورت بھی ہے۔ سب
سے بڑی بات یہ ہے کہ........ فاروق احمد صاحب سے تمہارے ابو کے دیرینہ
تعلقات بھی تھے۔ یہ بات کسی ذریعے سے ان کے کانوں میں بھی پہنچ چکی ہے اور
اندازہ یہ ہوا ہے کہ وہ بخوشی اس پر آمادہ ہیں اور کیوں نہ ہوں، میرا بیٹا بھی تو کوئی

معمولی حیثیت نہیں رکھتا۔ آخر ڈاکٹر ہے' جس کی شہرت دور دور تک پھیلتی جا رہی
ہے۔" امی نے مجھے بھی مکھن لگایا۔

میں چند ساعت امی کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر میں نے خجل سے لہجے میں
کہا.........."لیکن امی آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"امی آپ نے کہا تھا کہ ابھی یہ سلسلہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کیا جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میں اب بھی یہ نہیں کہہ رہی کہ تم فوراً ہی شادی کرلو
ہمیں تو اجازت دے دو۔" امی نے کہا۔

"بھئی کیا گفتگو ہو رہی ہے ماں بیٹے کی۔ کیا ہم بھی اس میں شریک ہو سکتے ہیں"
اباجان اچانک اندر آ گئے۔

"آجائیں آپ بھی کیا کریں یاد گے۔" امی نے کہا اباجان بھی اندر آکر بیٹھ گئے۔

"ہاں تو ہم بھی تو سنیں کیا قصہ چھڑا ہے۔"

"نعمان کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔"

"واہ' اور ہمیں اس گفتگو سے محروم رکھا جا رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ بہرحال کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں..........؟"

"فوراً کرو۔"

"لیکن یہ نعمان ابھی نہیں کرنا چاہتے۔"

"کیوں بھئی ڈرتے ہو شادی سے؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے میں نے امی سے عرض کیا ہے کہ.........."

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن سلسلہ شروع کرنے میں کیا حرج ہے۔ یہ شادی کے
لئے کچھ مہلت چاہتے ہیں اور میں چاہتی ہوں اس میں حرج بھی کوئی نہیں ہے
فاروق احمد کی لڑکی ہمارے خیال میں بہت موزوں ہے۔"

"اور ان کے خیال میں؟" اباجان نے کہا۔

"انہیں اعتراض نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے اعتراض ہے۔" والد صاحب نے کہا اور امی تعجب سے ان کی

دیکھنے لگیں۔

"آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"صرف یہ کہ جب تک نعمان لڑکی کو دیکھ نہ لیں اور اسے پسند نہ کرلیں۔ ہم
کوئی کوشش نہیں کریں گے۔"

"اوہ لیکن اباجان۔" میں نے کہا۔

"یار مان لیا۔ تم بے حد نیک اور سعادتمند انسان ہو لیکن بس میں یہی چاہتا ہوں
کیا تم انکار کرو گے؟" اباجان بے تکلفی سے بولے۔ بے حد نفیس انسان تھے۔ میں دل
سے ان کی قدر کرتا تھا۔

"ٹھیک ہے جو حکم۔"

"اب پروگرام بتاؤ۔"

"میری مصروفیات؟"

"جی ہاں۔ اور آپ اس میں سے وقت نکالیں گے۔"

"اب تو ماشا اللہ نعمان کے ماتحت کلینک بخوبی سنبھال لیں گے۔ اس لئے اس
سلسلے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"لیکن اس سلسلہ میں کیا ہوگا؟" اباجان نے پوچھا۔

"سلسلہ یہ ہوگا کہ نعمان میاں دو چار روز کے لئے نواب آباد ہو آئیں گے۔
اس طرح ممکن ہے وہ زبیدہ کو دیکھ بھی لیں اور اس گھرانے سے بھی بخوبی واقف
ہو جائیں گے۔" امی نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن کب؟"

"اس کے لئے بھی تھوڑی سی مہلت دے دیں۔" میں جلدی سے بول پڑا۔

"کب تک؟" امی نے پوچھا۔

"بس تھوڑے سے انتظامات کرنے ہوں گے' ایک ماہ مل جائے تو بہتر ہے۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔" اباجان بولے امی بھی مان گئیں اور پھر دو تین روز گھر
رہ کر میں واپس عظیم پورہ آگیا۔

کلینک کے دن رات حسب معمول تھے۔ ایک شام میں دفتر میں تھا کہ ایک جیپ

کلینک میں داخل ہوئی۔ میرے دفتر سے بیرونی حصہ نظر آتا تھا۔ میں نے جیپ سے بہزاد کو اترتے دیکھا۔

ایک لمحے میں میرے ذہن میں کئی خیالات آئے۔ بہزاد کی سرد مہری یاد آئی۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اب وہ میرے پاس آیا ہے تو میں اس سے سرد مہری سے نہیں پیش آؤں گا۔ میں نے سوچا۔ بہزاد شاید میرے بارے میں ہی استفسار کر رہا تھا۔ پھر ایک ملازم اسے لے کر میرے پاس آگیا۔

"آخاہ بہزاد۔ آؤ۔ آؤ بھئی میاں کیسے ہو؟" میں کھڑے ہو کر اس سے بغل گیر ہوا اور بہزاد خجل سا نظر آنے لگا۔ پھر بولا۔

"ایک کام سے چمن گڑھ گیا تھا۔ وہاں سے واپس ہو رہا تھا کہ رات ہونے لگی۔ سوچا کہیں رک جاؤں۔ آپ یاد آگئے۔"

"واللہ۔ بڑا اچھا کیا تم نے' بڑی خوشی ہوئی۔ تھکے ہوئے ہو گے میں تمہارے لئے غسل وغیرہ کا بندوبست کر دوں۔" میں نے کہا اور ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی بجادی۔ میں نے محسوس کیا کہ بہزاد میرے تپاک سے شرمندہ ہے۔ بہرحال میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ دفتر سے اٹھ کر اسے رہائش گاہ میں لایا اور پھر غسل سے فارغ ہو کر میں نے کافی بنوائی۔ گرم گرم کافی کی دو پیالیاں لینے کے بعد بہزاد بالکل فریش ہو گیا۔

"شام میں جنگل کا سفر........"

"اللہ کی مہربانی' جو تمہیں یہاں لے آئی۔ میں تمہاری آمد سے بہت خوش ہوں۔ بہزاد میری تو خواہش ہے کہ تم دو تین دن یہاں رہو۔" میں نے درمیان سے اس کی بات کاٹ دی اور بہزاد ہنسنے لگا۔

رات کے کھانے کے بعد اس سے گپیں ہونے لگیں میں نے اس کی منگیتر روشینہ کے بارے میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔" بہزاد نے جواب دیا۔

"کیا وہ تمہاری کوئی عزیز ہے بہزاد؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' لیکن اب مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔"

"خوب' شادی کب کر رہے ہو؟"

"بہت جلد۔" بہزاد نے مسکرا کر کہا۔

"روشینہ کے والدین کیا کرتے ہیں؟"

"اوہ۔ اس کے والدین نہیں ہیں۔ بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہے لیکن اسے اس کے ماموں نے پرورش کیا ہے۔"

"بہت خوب' بہرحال اچھی لڑکی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں خوش رہو۔" میں نے پر خلوص لہجے میں کہا۔

دوسرے دن بہزاد رخصت ہو گیا لیکن اس نے اب بھی مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت نہیں دی تھی نہ جانے کیوں' بہرحال بات میرے ذہن سے نکل گئی اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ٹھیک ایک ماہ کے بعد میں نے ایک ہفتے کی مہلت نکال لی۔ ماتحتوں کو سارے کام سمجھا دیئے تھے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ میری غیر موجودگی میں بہتر طور پر کام سنبھال لیں گے۔ میں مطمئن ہو کر واپس امین پور چل پڑا اور جب میں نے امی کو بتایا کہ میں فاروق احمد کے ہاں جانے کو تیار ہوں تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ بہرحال میں نے کار ہی سے سفر کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس لئے میں چل پڑا۔

نواب آباد کا فاصلہ تقریباً پونے دو سو میل تھا۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ کار سے سفر نہ کروں لیکن میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا لیکن تنہا سفر اور طویل ڈرائیونگ۔ میں تھک گیا۔ یوں بھی مناسب وقت پر نہیں چلا تھا۔ اس لئے راستے ہی میں رات ہو گئی۔ میں بور ہو گیا تھا۔ سوچا راستے میں اب جو بستی نظر آئی وہاں قیام کروں گا اور دوسرے دن روانہ ہوں گا۔ چنانچہ اس وقت سورج بالکل چھپ چکا تھا جب مجھے چند ملگجی سی روشنیاں نظر آئیں۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ سولا نام کا ایک گاؤں تھا جہاں قیام کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک ڈاک بنگلے کا پتہ معلوم ہوا جو گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا۔ اللہ اللہ کر کے پہنچا۔ اس وقت کوئی دیہاتی بھی رہنمائی پر آمادہ نہیں تھا۔ اتنی دور کون جاتا۔

بہرحال ڈاک بنگلے پر پہنچ گیا۔ سرخ پتھروں کی عمارت تھی اور اس کے ایک کمرے میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ باہر ہی سے مجھے ڈاک بنگلے کا چوکیدار مل گیا۔

اس نے سلام کیا اور بولا۔ "کیا آپ یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔ ورنہ اس وقت میں یہاں کیوں آتا؟"

"کوئی بات نہیں ہے صاحب۔ ایک اور صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہاں بہت سے کمرے ہیں۔"

"مجھے ایک کمرہ دے دو۔" میں نے کہا۔ کمرہ کیا تھا۔ اچھا خاص بھوت خانہ تھا جھلنگا سا پلنگ جس پر چادر صاف بچھی ہوئی تھی۔ تکیے پر بھی نیا غلاف تھا۔ امین پور سے چلتے وقت کچھ فروٹ ساتھ لے لئے تھے وہی رات کے کھانے کے کام آئے۔ چوکیدار سے میں نے کار کی حفاظت کے لئے کہہ دیا تھا۔

اس کمرے میں نیند جیسی آسکتی تھی آئی۔ مچھروں نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ چارپائی کی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ سوچا کہ اس سے بہتر تو تھا کہ کار ہی میں سو جاتا۔ نہ جانے کن مصیبتوں کے ساتھ صبح ہوئی۔

روشنی دیکھ کر اسی طرح کمرے سے باہر نکلا جیسے قیدیوں کو طویل قید سے نجات ملتی ہے۔ جونہی کمرے سے باہر قدم رکھا۔ ایک خوش رو نوجوان نظر پڑا جو عمدہ لباس میں تھا۔ دوسرے لمحے میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ کیونکہ نوجوان کی شکل میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ بہزاد تھا جو خود بھی تعجب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ارے بہزاد؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب۔" وہ بھی متحیر سا میری طرف بڑھ گیا۔

"خیریت۔ تم کہاں؟"

"اوہ ڈاکٹر صاحب آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ پھر حالات کچھ اس طرح کہ میں آپ کو اطلاع بھی نہ دے سکا۔"

"کس بات کی؟"

"شادی کی۔"

"ارے۔ تو کیا تم نے شادی کر لی؟"

"ہاں۔"

"روشینہ سے؟"

"جی ہاں۔"

"بھئی واہ خوب چھپے رستم نکلے۔ بہرحال میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کرو لیکن یہاں کہاں آنکلے؟" میں نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

"اوہ روشینہ بھی میرے ساتھ ہے۔ بس ذرا جذباتی سی بات تھی لیکن شادی کے بعد اس نے کہا کہ وہ اپنی آبائی حویلی میں سہاگ رات منائے گی۔ جہاں اس کے والدین کی روحیں اس کی منتظر ہوں گی۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اس لئے آنا پڑا۔ رات ہو گئی اور مجبوراً سفر ملتوی کرنا پڑا۔" بہزاد نے جواب دیا۔

"واہ میرے بھائی۔ تو اس چکر میں بھاگتے پھر رہے ہو لیکن روشینہ کی آبائی حویلی کہاں ہے؟"

"انہی اطراف میں کہیں ہے۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں ہے۔ میں کبھی اس طرف نہیں آیا۔" بہزاد نے جواب دیا۔

"خوب تو یہ محترمہ ہیں کہاں۔ ذرا ان سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں میں نے کہا تھا کہ مجھے شادی میں شریک کرنا نہ بھولیں۔"

"آیئے۔ بس ہم بھی چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔" بہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ بولا۔

"روشینہ باہر تو آؤ۔ دیکھو کہ ایک صاحب تمہاری خبر لینے آئے ہیں۔" اور چند ساعت کے بعد ہی دلربا چہرہ میرے سامنے تھا۔ پُراسرار آنکھوں نے مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے لئے پھر وہی سحر میرے ذہن میں اتر گیا۔

لیکن صرف ایک لمحہ دوسرے لمحے میں نے مسکرا کر کہا۔ "بھابی آداب۔ کیوں غداری کر گئے نا آپ لوگ مجھے پوچھے بغیر۔"

اور روشینہ کے ہونٹوں پر روشن مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کچھ نہ بولی لیکن بہزاد نے ہی تفصیل بتائی۔ روشینہ صرف مسکراتی رہی تھی۔

"اچھا بھئی چلیں۔ میں تمہاری خوشیوں کے لمحات کو دور نہیں کرنا چاہتا۔ پھر ملاقات ہو گی۔" میں نے کہا اور ہم باہر نکل آئے۔ چوکیدار کو کچھ دے دلا کر ہم اپنی کاروں کے قریب پہنچ گئے۔

بہزاد اپنی جیپ اسٹارٹ کرنے لگا۔ میں نے بھی وین کار اسٹارٹ کی جو ایک سیلف ہی میں اسٹارٹ ہوگئی۔ پھر میں اپنی کار ریورس کر رہا تھا کہ بہزاد کی آواز سنائی دی۔

"نعمان صاحب براہ کرم ذرا۔" اور میں رک گیا۔ میں نے کار آگے بڑھا کر اس کی جیپ کے آگے کردی۔

"کیا بات ہے بہزاد؟"

"میرا خیال ہے گڑبڑ ہوگئی۔"

"کیا ہوا؟"

"راستے میں ڈائنمو کی سرخ بتی جل رہی تھی۔ ڈائنمو کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اب بیٹری بالکل ختم ہوگئی۔ سیلف گھوم ہی نہیں رہا۔"

"اوہ۔" میں کار سے نیچے اتر گیا۔ کافی کوشش کی۔ دھکے بھی لگائے لیکن جیپ اسٹارٹ نہ ہوئی۔

"اب کیا کیا جائے؟"

"جیپ یہاں چھوڑ کر چوکیدار سے کہہ دو۔ میں تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دوں گا۔ بعد میں کوئی بندوبست کرلینا۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں ہے۔" بہزاد نے کہا۔

"نعمان صاحب کو تکلیف ہوگی۔" روشینہ نے کہا۔

"میری تکلیف تنہا ہے' اس سے آپ بے فکر رہیں۔" میں نے کہا اور پھر ان دونوں کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ چوکیدار کو ہدایت کرکے ہم چل پڑے۔ روشینہ راستے میں مجھے گائیڈ کر رہی تھی۔ کافی دور پہنچ کر میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے نواب آباد بھی یہاں سے دور نہیں ہے۔"

"ہاں' لیکن اس کے لئے دائیں سمت چلنا پڑتا ہے۔"

"آپ فاروق احمد کو جانتی ہیں بھابی؟"

"نہیں۔ میں نہیں جانتی۔" روشینہ کا لہجہ کسی قدر تلخ تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد مجھے اس کی کوئی آواز نہ سنائی دی۔ میں سیدھا ہی چلتا

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے سے قصبے کے نزدیک پہنچ گیا۔ دور سے ایک ہی کھنڈر نما حویلی نظر آرہی تھی اور اس حویلی کے بڑے پھاٹک کے پاس روشینہ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"بس یہی ہماری منزل ہے۔"

"ارے۔ لیکن حویلی تو ویران ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اس سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ میں اس سے جذباتی تعلق رکھتی ہوں۔"

"اوہ یقیناً۔" نہ جانے کیوں میرے ذہن میں کرید پیدا ہوگئی۔ "کار اندر لے چلوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس شکریہ۔ آپ تکلیف نہ کریں۔" روشینہ نے جواب دیا۔

"ارے روشینہ یہ تم۔ میرا مطلب ہے نعمان صاحب نے........." بہزاد نے پریشان لہجے میں کہا۔

"بہزاد تم سوچو تو سہی' میں ایک جذباتی تعلق کے تحت یہاں آئی ہوں۔ کوئی اجنبی اس حویلی میں ساتھ ہوگا تو تم۔" روشینہ کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

"لیکن روشینہ یہ بھی تو بری بات........."

"بہزاد!" روشینہ نے تیز لہجے میں بہزاد کی بات کاٹ دی اور اس کی پُر سحر آنکھیں بہزاد پر جم گئیں اور بہزاد کی آواز بند ہوگئی۔

"بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں بہزاد۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے اجازت دو۔" میں نے کہا اور پھر زبردستی بہزاد سے ہاتھ ملا کر کار میں جا بیٹھا اور کار واپس موڑ دی۔

اس کے بعد میں نے انہیں پلٹ کر نہیں دیکھا تھا لیکن میرے ذہن کی کرید اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اس ویران حویلی میں ہنی مون منائیں گے۔ کیسی انوکھی بات ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو اور پھر میرا دل نہ مانا۔ یہ اسرار میرے ذہن کو کھانے لگا تھا اور میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ پھر ایک لمبا چکر لے کر میں قصبے میں پہنچ گیا اور ایک جگہ کار روک دی۔ میں نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر کھائیں اور پھر دن بے مقصد گھوم

پھر کر گزارہ۔ اس کے بعد جونہی جھٹپٹا ہوا' میں حویلی کی طرف چل پڑا۔ کار میں نے
وہیں چھوڑ دی تھی۔ یہاں سے حویلی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ ملگجے اندھیرے میں عمارت
بڑی عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بہت سے حصے بوسیدہ تھے۔ اس لئے مجھے اندر
داخل ہونے میں دقت نہ ہوئی۔ عمارت میں کہیں کہیں روشنی تھی۔

میں چوروں کی طرح اس کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ اتنی بڑی حویلی میں کر
کو تلاش کرلینا ممکن نہ تھا لیکن روشن حصے میری رہنمائی کر رہے تھے اور پھر ایک
راہداری میں مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دیا اور میں ٹھٹک گیا۔

ایک ستون کی آڑ سے میں نے روشینہ کو دیکھا۔ اس وقت اس کے بدن پر ایک
قدیم وضع کا لباس تھا۔ ہاتھوں میں اس نے دو شمعیں پکڑی ہوئی تھیں اور اس کی چال
عجیب تھی۔ یہ عورت مجھے روزِ اول ہی سے پُراسرار معلوم ہوئی تھی۔ اس وقت بھی
وہ بہت عجیب لگی۔

وہ میرے نزدیک سے گزر کر راہداری کے آخری سرے پر گھوم گئی۔ بہزاد اس
کے ساتھ نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پھر وہ ایک
دیوار کے پاس پہنچ گئی جہاں ایک چوکور خلا بنا ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا چند
ساعت کے بعد میں بھی خلا میں پہنچ گیا۔

انوکھی جگہ تھی نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور سیڑھیوں کے
اختتام پر ایک گول کمرہ تھا جو کافی وسیع تھا۔ جگہ جگہ جالے تنے ہوئے تھے اور شمعوں
کی روشنی اس کمرے میں تھرتھرا رہی تھی۔ ویسے روشنی میں کمرے کا ماحول صاف نظر
آرہا تھا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ صرف اس کے ایک سرنے پر تین سیڑھیوں والا ایک گول
چبوترہ تھا جس پر ایک خوبصورت نوجوان کا سنگی مجسمہ ایستادہ تھا۔ یہ مجسمہ بھی قدیم طرز
کے لباس میں تھا۔ مجسمہ کسی بے حد حسین نوجوان کا تھا' روشینہ چند ساعت اس کے
سامنے کھڑی رہی پھر آہستہ سے جھکی اور اس نے دونوں شمعیں مجسمے کے قدموں میں
نصب کردیں' اس کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی اور مجسمے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی
ہو گئی۔

"میرے دیوتا۔ میرے سرتاج' آج میں تیرے سامنے آخری قربانی پیش کر ر

ں۔ میرا مان رکھنا۔ میرے دیوتا اور اپنی جون میں واپس آجانا اگر تم اپنی جون میں
پس نہ آئے تو میں بن موت مرجاؤں گی۔" اس نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر کے
یچھے ہٹنے لگی' اس کے بعد آہستہ آہستہ اسی دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں
عیں اب بھی روشن تھیں۔

میں ایک ایسی جگہ پوشیدہ ہو گیا تھا جہاں سے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میرا
یال تھا کہ اس گول کمرے کا پوری طرح سے جائزہ لوں گا اور اس راز کو جاننے کی
وشش کروں گا۔

لیکن ابھی میں پورے طور سے کمرے کا جائزہ بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر مجھے کمرے
ں آہٹ محسوس ہوئی۔ آہٹ میں ایک سے زیادہ قدم شامل تھے۔ میں پھر اپنی جگہ
وپوش ہو گیا تھا۔

تب میں نے دیکھا کہ روشینہ دوبارہ نیچے آرہی تھی' اس کے ساتھ بہزاد بھی تھا
یکن بہزاد کی کیفیت اس وقت بے حد عجیب تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند کے عالم
ں چل رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور قدم روشینہ کے ساتھ ساتھ اٹھ رہے
تھے............

روشینہ' بہزاد کو لے کر مجسمہ کے بالکل قریب پہنچ گئی اور پھر اس نے بہزاد سے
کہا۔

"جھک جاؤ۔ دیوتا کے سامنے جھک جاؤ۔"

بہزاد نے مجسمہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مجھے اچھی طرح یقین تھا اور یقینی طور پر
ہ نیند کے عالم میں تھا۔

اور میں نے دیکھا کہ بہزاد نے گردن جھکا دی اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔
س کی آنکھیں اب بھی نیند میں تھیں۔

روشینہ آہستہ آہستہ اپنے جسم سے لباس اتارنے لگی اور پھر وہ بالکل برہنہ
و گئی۔

موی شمعوں کی روشنی میں اس کا بدن چمک رہا تھا' میں نے ایک لمحے کے لئے
نگاہیں جھکالیں' یہ تصور بھی میرے ذہن میں تھا کہ وہ میرے دوست کی بیوی ہے لیکن

اس وقت جو صورت حال سامنے تھی اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی اچھی بات سوچی جاسکتی تھی۔

بہرحال مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی خوفناک صورت حال ہے اور کچھ نہ ہونے والا ہے' تب اس نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا اور اسے ہوا لہرانے لگی' تب وہ مجسمے کے نزدیک آگئی.........

"میرے سرتاج' میرے دیوتا آج تو جاگ جائے گا' ہاں آج تو جاگ جائے! آج میری برسوں کی تپسیا پوری ہوجائے گی' میں تیرے لئے آخری قربانی دے ر ہوں۔ دیکھ لے میں نے تیرے لئے کتنے کتنے کشٹ بھوگے ہیں۔" وہ کہتی رہی ا آہستہ آہستہ بہزاد کی جانب بڑھنے لگی۔

نہ جانے کیوں میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے' میں سمجھ ر کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے' لیکن جو ہو رہا ہے اس میں دخل کس طرح دا میں کس انداز میں سامنے آؤں۔

روشینہ بہزاد کے بالکل نزدیک تھی۔ اور پھر اس نے خنجر کی نوک سے بہزا قمیض پھاڑ دی۔ اس کے بعد اس نے بہزاد کی قمیض کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اچھ دیئے۔

"اور آج' آج میں تمہارا دل نکال کر اپنے دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ کرد گی اور اس کے بعد یہ جاگ جائے گا' ہاں یہ ساتواں بلیدان ہے' آخری بلیدان اس نے وحشیانہ انداز میں کہا.........

اور اب کچھ سوچنے کی گنجائش نہیں تھی' روشینہ کا ارادہ میرے سامنے تھا میں کچھ نہ سمجھ سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے اور کیوں ہے' لیکن بہرصورت بہزاد کی زن بچانا میرا فرض تھا۔ تب میں نے اپنے فیصلے کو دل میں دوہرایا اور غراتا ہوا باہر نکل آ

"خبردار۔" میں نے زور سے کہا اور روشینہ تیزی سے اچھل پڑی۔ اس وحشیانہ انداز میں میری جانب دیکھا اور پھر بری طرح دھاڑتی ہوئی میری طرف بڑھی

"تو۔ تو۔ تو کیسے یہاں آگیا۔ تو یہاں کیسے آیا۔ اچھا ٹھیک ہے آج ایک بجائے دو قربانیاں ہوں گی۔ دو قربانیاں۔" اس نے خنجر سے میرے اوپر بھرپور حملہ

لیکن میں پوری طرح ہوشیار تھا' میں چھلانگ لگا کر دوسری طرف آگیا۔

پھر میں مجسمے کے بالکل قریب پہنچ گیا' روشینہ میری طرف لپکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے موی شمع مجسمے کے قدموں سے اٹھالی تھی اور جلتی ہوئی شمع کو میں نے روشینہ کے چہرے کی طرف بڑھایا۔ روشینہ جس انداز میں وحشیانہ حملے کررہی تھی اس سے احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

دوسرے لمحے میں نے مجسمے کے نزدیک سے دوسری شمع بھی اٹھالی اور میں نے انہیں روشینہ کی طرف لہرایا لیکن افسوس دونوں شمعیں بجھ گئیں تھیں۔ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اب وہ مجھ پر خنجر چلاسکتی تھی لیکن شمع کے بجھتے ہی روشینہ کی ایک تیز چیخ سنائی دی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا تھا' میں نے دیکھا وہ تیزی سے دروازے کی سمت بھاگی تھی۔ بہرحال میں نے اس کا پیچھا نہیں کیا تھا' اس وحشی عورت سے کوئی بات بعید نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر تک اندھیرے میں کھڑا رہا' بہرصورت میں بہزاد کے تیز سانسوں کی آواز سن رہا تھا' نہ جانے وہ کہاں چلی گئی۔ میں بہزاد کے نزدیک پہنچا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بہزاد۔ بہزاد۔"

"اوہ۔" بہزاد اس طرح چونکا تھا جیسے وہ اچانک نیند سے بیدار ہوا ہو۔

"بہزاد سنبھلو۔"

"کون۔ کون ہو تم؟" اس نے اصلی آواز میں پوچھا۔

"بہزاد میں تمہارا دوست نعمان ہوں۔"

"نعمان۔ ڈاکٹر؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا بات ہے ڈاکٹر نعمان؟"

"اٹھو بہزاد۔ ہوش میں آؤ۔"

"میں ہوش میں ہوں۔" اس نے کہا۔ "ارے میری قمیض کہاں گئی۔" بہزاد نے اپنے بدن کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ جس سے مجھے احساس ہوا کہ وہ ہوش میں ہے۔

"یہاں سے نکلو بہزاد۔ میں تمہیں سب کچھ باہر چل کر بتاؤں گا۔" میں نے بہزاد

کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

چند ساعت کے بعد میں باہر آ گیا' مجھے خطرہ تھا کہ روشینہ اب بھی یہیں کہیں موجود نہ ہو' لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں بہزاد کو لے کر باہر آ گیا۔ وہ حیرت سے حویلی کو دیکھ رہا تھا اور کبھی مجھے۔ چاند نکل چکا تھا اور چاندنی حویلی کو منور کر رہی تھی۔ دفعتاً بہزاد نیند سے چونک پڑا۔ پھر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد عجیب سے لہجے میں بولا۔

"ارے روشینہ کہاں ہے؟"

"بہزاد کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟"

"کہاں؟"

"جہاں میں لے جاؤں۔"

"مگر۔ مگر روشینہ کہاں ہے۔" اس نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہزاد میں اس وقت تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا' براہ کرم تم میرے ساتھ چلو۔"

"مگر میری بیوی یہاں موجود ہے۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر تم پسند کرو تو میری بات مان لو' ورنہ تمہاری زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا اور بہزاد میری شکل دیکھنے لگا۔

"لیکن میں روشینہ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"اسے تلاش کر لو۔ وہ تمہیں یہاں نہیں ملے گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب۔ کیوں آخر؟"

"وہ بھاگ گئی ہے۔"

"کیوں۔ کہاں؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"تم بتا سکتے ہو' تم اس کمرے میں کیسے پہنچے تھے' جہاں سے میں تمہیں لے کر آیا

ہوں؟"

"میں' میں نہیں جانتا' مجھے کچھ یاد نہیں۔" وہ سر پکڑ کر بولا۔

بمشکل تمام میں نے بہزاد کو سمجھایا اور اسے لے کر باہر آ گیا' بہرحال اب اس خوفناک حویلی میں تو ٹھہرا نہیں جا سکتا تھا روشینہ کہیں بھی چلی گئی ہو' بہزاد ظاہر تھا' اس کے بارے میں ضرور پوچھے گا لیکن کم از کم یہاں سے نکلنا ضروری تھا' سو میں باہر آیا اور بہزاد کو لے کر قصبے میں چل پڑا۔

قصبے میں پہنچ کر میں نے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ کار اسی انداز میں کھڑی تھی۔ تب میں نے بہزاد کو بٹھایا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا لیکن میری کیفیت عجیب ہے۔" بہزاد نے کہا۔

"ہاں بہزاد۔ تم خوش قسمت ہو' تمہاری زندگی بال بال بچ گئی۔ وہ عورت تمہیں قتل کرنا چاہتی تھی۔"

"کون۔" وہ چونک پڑا۔

"تمہاری روشینہ۔"

"نہیں۔ نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہی ممکن تھا بہزاد۔ نہ جانے تم کس شیطانی چکر میں پھنس گئے۔ میں نے اس عورت کا ایک خوفناک روپ دیکھا ہے' میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ساری باتیں بتاؤں گا۔"

بہزاد سیٹ سے ٹک کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' اس کی کیفیت بالکل نیم دیوانوں کی سی تھی۔ راستے میں' میں نے اسے تمام تفصیلات بتائیں اور بہزاد شدید حیرانی کے عالم میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ پھر وہ حیران کن لہجے میں بولا تھا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے نعمان؟"

"بہزاد تم جس طرح چاہے یقین کر لو۔ میں قسم کھا سکتا ہوں' یہی کچھ تھا اس میں ایک حرف بھی غلط نہیں۔"

"تعجب ہے۔ وہ کون تھی؟" بہزاد نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں اضمحلال پیدا

ہو گیا۔

"اب ہم کہاں چل رہے ہیں نعمان۔" تھوڑی دیر کے بعد اس نے ٹوٹے ہو
لہجے میں پوچھا۔

"نواب آباد۔"

"اوہ۔" بہزاد نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

کافی دیر تک وہ مضمحل رہا۔ میں اپنے اندازے کے مطابق نواب آباد چل
تھا۔ میں صبح ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

رات کے تقریباً تین بجے تھے۔ جب ہم نے نواب آباد کے خوبصورت قصبے
قدم رکھا۔ میں نے اس وقت فاروق احمد صاحب کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا
یہی فیصلہ کیا کہ رات یہیں کہیں گزار کر صبح ان کے ہاں جائیں گے۔

سو رات میں نے کار ہی میں گزاری۔ کار ہم نے کھڑی کر دی تھی۔ کوئی ہم
ہمارا احوال نہیں پوچھنے آیا۔ پھر میں نے بہزاد کو پوری تفصیل سنائی اور اس
روشینہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"میں نہیں جانتا۔ میری اس کی ملاقات ایک فنکشن ہی میں ہوئی۔ بس
اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات بھی نہ کیں ا
جانے کیا ہو جاتا تھا مجھے اس کے سامنے۔ میں صرف اس کی آنکھوں کے زیر اثر
آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں' وہ شروع ہی سے پُراسرار شخصیت رکھتی تھی
افسوس انجانے اس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا' میں تو اسے بے حد
تھا۔"

"بہزاد! تمہیں صبر کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میری خ
ہے کہ آپ مجھے فاروق احمد صاحب کے ہاں نہ لے جائیں۔"

"کیوں؟"

"میری حالت درست نہیں ہے' اور یہ مناسب نہیں ہوا۔" بہزاد نے ٹو
میں کہا۔

"لیکن پھر تم کہاں جاؤ گے بہزاد؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے گھر۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر۔"

"بھئی میرا مقصد ہے فارسٹ ہاؤس۔"

"نہیں' نہیں میں اپنے گھر جاؤں گا۔"

"مگر کیسے جاؤ گے بہزاد؟"

"آپ اگر کر سکتے ہیں تو صرف اتنا کریں کہ مجھے کسی کے ساتھ ڈاک بنگلے تک پہنچا
یں جہاں میں نے اپنی جیپ چھوڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے صبح کو فاروق احمد کے گھر چلیں گے' کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے
گا۔"

دوسری صبح ہم فاروق احمد صاحب کے گھر پہنچ گئے وہ بے چارے بے حد پریشان
تھے' کیونکہ میرے والد صاحب نے میرے پہنچنے کا تار دے دیا تھا۔ بہت اچھی طرح
ملے تھے۔ بہت تپاک سے مجھے خوش آمدید کہا گیا' میرے ٹھہرنے کا انتظام ہو چکا تھا۔
زاد سے بھی سب لوگ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔ فاروق صاحب بے حد خوش
خلاق اور دین دار قسم کے انسان تھے۔

ان کے گھر کا ماحول بے حد مشرقی تھا لیکن بہرصورت مجھے بہت پسند آیا۔

بہزاد کے بارے میں' میں نے انہیں بتایا کہ وہ جانا چاہتا ہے حالانکہ فاروق احمد
احب نے کہا بھی کہ کوئی بات نہیں جب وہ میرا دوست ہے تو یہاں قیام کرے اس کی
جودگی سے سب کو خوشی ہو گی۔

لیکن بہزاد کے زور پر فاروق صاحب نے اسے واپس بھجوانے کا بندوبست کر دیا
ا۔

بہزاد چلا گیا اور میں پریشان سے انداز میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہرحال
روق صاحب کے ہاں کے شب و روز بے حد دلکش تھے' گو زبیدہ میرے سامنے نہیں
ئی تھی لیکن اس کی ہلکی ہلکی........... جھلکیاں اور آہٹیں میں نے محسوس کی تھیں

اور مجھے یوں لگا تھا جیسے کہ وہ اچھی خاصی لڑکی ہے۔

بہرصورت فاروق احمد صاحب کا نقش قدم میرے ذہن پر ایسا بیٹھا کہ جب وہاں سے چلا تو بے حد خوش تھا۔

گھر آکر میں نے ان کے بارے میں ساری تفصیلات بتائیں اور اپنی پسندی اظہار کردیا۔ میں واپس عظیم پورہ آگیا اور دوسری طرف میری شادی کی تیا ہونے لگیں۔

میں کلینک واپس آگیا۔ شادی کی تیاریوں سے بھلا مجھے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی ہی اس سلسلہ میں ضرورت تھی۔ بہزاد کا خیال درجنوں بار میرے ذہن میں آیا او ایک بار موقع نکال کر میں فارسٹ ہاؤس چل پڑا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ اس نے چھٹی لے رکھی ہے۔

میں اس کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھا۔ اس لئے میں نے اس کے گھر معلوم کیا اور اس کے شہر تک پہنچ گیا۔ بہزاد کے گھر والے بہت نیک دل اور تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ بہزاد تین روز قبل اپنے کسی دوست سے ملنے حسین نگر گ ہے۔ بہرحال اس کی خیریت معلوم ہوگئی تھی اس لئے میں مطمئن ہوگیا اور واپس پورہ آگیا۔ جب بھی کبھی وہ مجھے خوفناک مناظر یاد آتے تو میرے رونگٹے ک ہوجاتے تھے۔ میں نے اس داستان کو کسی کو نہیں سنایا تھا۔ سب اسے میرے ذہ اختراع یا خلل سمجھتے۔ بات خود میری سمجھ میں نہیں آئی تھی تو دوسروں کو کیا سمجھا

شادی کی تیاریاں ہوچکی تھیں۔ تاریخ بھی طے ہوگئی تھی اور مجھے اس کی ا دے دی گئی۔ والدہ صاحبہ نے مجھے وارننگ دے دی تھی کہ شادی کے بعد کم مجھے ایک ماہ کی چھٹی کرنی ہوگی اس لئے انتظامات کرلوں۔

پھر مجھے امین آباد پہنچنا پڑا۔ گھر کے لوگوں کے تو انداز نرالے ہی تھے۔ دو سے مہمان آچکے تھے۔ تب ایک دن مجھے دولہا بنایا گیا......... اور بارات نواب چل پڑی۔

سچی بات ہے کہ اب تو مجھے زبیدہ کے خواب آنے لگے تھے اور دل میٹھی میٹھی سی کیفیت ابھر آئی تھی۔

فاروق احمد صاحب نے بھی خوب حوصلے نکالے تھے بارات کا ایسا شاندار استقبال کیا گیا کہ جس کی مثال مشکل تھی۔ تین روز تک بارات ٹھہرائی گئی۔ نکاح تو پہلے ہی دن ہوچکا تھا۔ اس کے بعد خوب ناٹک سوانگ ہوتے رہے اور میں سب کچھ بھول گیا۔ تیسرے دن بارات کو واپسی کی اجازت ملی اور دلہن رخصت ہو کر چل پڑی۔

امین پور تک کا سفر کافی طویل تھا لیکن دوران سفر بھی خوب لطف لیا۔ میں نے بہزاد کے گھر کے پتے پر بھی شادی کا کارڈ بھیجا تھا اور اس کا کافی انتظار کیا تھا لیکن بہزاد نہیں پہنچا تھا میں جانتا تھا کہ وہ بے چارہ خود افسردہ ہوگا عجیب چکر تھا۔

بہرحال بارات واپس پہنچ گئی اور پھر گھر کی رسومات ہونے لگیں۔ سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔

آرسی مصحف میں' میں نے زبیدہ کی شکل دیکھی تھی اور دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اتنی حسین تھی وہ کہ بس اندازہ نہیں کیا جاسکتا آج مجھے اس کی قربت نصیب ہونے والی تھی۔

خدا خدا کرکے رات ہوگئی۔ لڑکیاں الٹے سیدھے مذاق کررہی تھیں۔ گو ان میں میری بہنیں شامل نہیں تھیں لیکن ان کی ہدایات کام کررہی تھیں۔ بہرحال خاصی رات گئے حجلہ عروسی میں جانا نصیب ہوا۔

شرم تو بہت آرہی تھی کیونکہ بے شمار شریر نگاہیں میری طرف نگراں تھیں لیکن زبیدہ کے قرب کا مسرت آگیں احساس کسی دوسرے کو نہیں ٹکنے دے رہا تھا۔

اپنے خوبصورت اور سجے ہوئے کمرے میں قدم رکھا اور دل دھڑک اٹھا۔ سامنے ہی خوبصورت مسہری خوبصورت زبیدہ سے جگمگا رہی تھی۔ گھونگھٹ نکالے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک اجنبی لڑکی کسی اجنبی کی منتظر تھی۔ ایک ایسے اجنبی کی منتظر جو اس کی پوری زندگی کا ساتھی اس کا سب کچھ تھا۔

میرے اوپر نشہ سا طاری ہونے لگا۔ قدم خودبخود مسہری کی طرف بڑھ گئے اور میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ دیر تک سوچتا رہا کیا کہوں۔ کیسے سلسلہ کلام شروع کروں۔ لرزتے دل سے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"زبیدہ.........!" بہرحال میں نے اسے پکارا۔ دو اجنبی ایک دوسرے
زندگی میں کس طرح رچ بس جاتے ہیں کیسا عجیب لگ رہا تھا اور پھر یہ تصور کر
ساری زندگی کے ساتھی ہیں۔

زبیدہ کے اندر ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ "اب جب ہم اجنبی.........
ہیں تو ایک دوسرے سے تکلف کیوں کریں میں تمہاری صورت دیکھ سکتا ہوں۔
وقت یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے۔"

میں جھکا اور پھر میں نے آہستہ سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ تیز روشنیوں
زبیدہ......... زبیدہ......... مجھے اچانک کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس
آنکھیں بند تھیں لیکن وہ......... وہ......... وہ زبیدہ نہیں تھی.........
.........وہ تو......... میں اس چہرے کو بھول تو نہیں سکتا تھا۔ یہ.........
یہ.........سو فیصد روشینہ تھی۔

حسین چہرہ لیکن اب جو میرے نگاہ میں حسین نہ تھا۔ وہ ایک خوبصورت شیطان
خوبصورت چہرہ تھا۔

دوسرے لمحے میں اچھل کر کھڑا ہو گیا......... "تم......... تم.........
روشینہ یہ تم ہو........."

اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی پُراسرار اور چمکدار آنکھیں جو ذہن
سلاتی محسوس ہو رہی تھیں......... اور اس وقت تو وہ آنکھیں سرخ انگاروں
مانند چمک رہی تھیں۔

"تم......... زبیدہ کہاں گئی؟" میں نے وحشت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میرے قبضے میں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں......... آخر کیوں میں تمہیں........."

"تم نے آخری بلیدان نشٹ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا آخری بلیدان تمہارا ا
گی......... صرف تمہارا........." اس نے کہا۔ سرخ آنکھوں کی ساری چنگار
میرے ذہن میں پیوست ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنا وجود سوتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا
کوشش کے باوجود ہاتھ نہ ہلا سکا......... اب میری عجیب سی کیفیت تھی میں ا

ذہن سے سوچ سکتا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

"آج مجھے کون روکے گا۔" وہ فخریہ انداز میں بولی اور پھر مسہری سے نیچے اتر
آئی۔ "بولو ہے کوئی مجھے روکنے والا؟"

"نہیں........." میرے منہ سے نکلا۔ الفاظ میرے قابو میں نہیں تھے۔

"آؤ......... خاموشی سے نکل چلیں۔ تم جانتے ہو ہمیں کہاں جانا ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"تب آؤ لیکن کسی کو خبر نہ ہو۔ خاموشی سے آؤ کار میں پٹرول بھرا ہوا ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور پھر اس کے اشاروں پر میں ناچتا رہا ہم دونوں چھپ کر
باہر آئے میں نے اپنی کار نکالی اور روشینہ میرے نزدیک آ بیٹھی میں نے کار اسٹارٹ کی
اور پھر ہم باہر نکل آئے......... دروازے پر کھڑے چوکیدار نے تعجب خیز نگاہوں
سے ہمیں دیکھا یہ سہاگ رات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"تیز چلو۔" روشینہ نے کہا اور میرا پاؤں ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالنے لگا میں نے اپنی
پوری زندگی میں اتنی تیز کار نہیں چلائی تھی لیکن روشینہ مجھے اور تیز کار چلانے کی
ہدایت کر رہی تھی۔

اور پھر رفتار آخری حد کو چھو گئی میں تیزی سے نواب آباد کی جانب جا رہا تھا
سڑکیں سنسان تھیں۔ اس لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور کار گویا ہوا میں اڑتی رہی۔

اور پھر میں نے وہی پُراسرار حویلی دیکھی جس میں' مَیں ایک خوفناک کھیل دیکھ
چکا تھا لیکن میں پوری طرح بے بس تھا۔ روشینہ مجھے اس تہہ خانے میں لے گئی۔ پھر
اس نے دو شمعیں روشن کیں اور اس کے حلق سے ایک مسرت بھرا قہقہہ آزاد ہو گیا۔

"بھولے ناتھ۔ آج میں تجھے ضرور جگا لوں گی۔ میرے دیوتا آج تو ضرور جاگے
گا۔ آج میں اپنا آخری بلیدان ضرور دے سکوں گی۔" اس نے شمعیں اس مجسمے کے
قدموں میں لگا دیں۔

اور پھر وہ اپنا لباس اتارنے لگی۔ ایک بار وہ پھر برہنہ ہو گئی تھی اور پھر وہ خنجر
لے کر وحشیانہ انداز میں اچھلنے کودنے لگی۔

"چلو' میرے دیوتا کے چرنوں میں جھک جاؤ۔ میں تمہارا بلیدان دے دوں۔"

اس نے کہا اور میں کسی مشینی عمل کے تحت اس مجسمے کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ روش
چند ساعت اسی طرح اچھلتی کودتی رہی پھر وہ میرے نزدیک آ گئی اور اس نے م
قمیض ٹکڑے ٹکڑے کردی پھر خنجر کی نوک میرے سینے سے آ لگی......... اور ا
لمحہ باقی تھا کہ وہ خنجر سے میرا سینہ چاک کردے کہ اچانک مجسمے کی بھرپور ٹھوکر اس
منہ پر پڑی۔

ٹھوکر اتنی بھرپور تھی کہ روشینہ کی پیشانی پھٹ گئی وہ دوسری طرف الٹ گ
تب مجسمہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا اور اس نے ایک اور ٹھوکر روشینہ کے رسید
پھر میرے قریب پہنچا اور مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

"ڈاکٹر نعمان......... ڈاکٹر نعمان ہوش میں آؤ۔" اور ایک دم جیسے سحر ٹ
گیا۔ میں چونک پڑا میں نے پہچان لیا۔ وہ بہزاد تھا۔ ہاں وہ تو فارسٹ آفیسر بہزاد تھا۔

روشینہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں تعجب سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "
کون ہو پاپی؟ ہائے مجھے میرا آخری بلیدان دینے دو۔"

"غور سے دیکھ میں کون ہوں۔ اُلو کی پٹھی۔ میں وہی ہوں جو ایک بار تی
ہتھے چڑھ گیا تھا اور جس کے لئے تُو بلیدان دے رہی تھی وہ......... وہ پڑا ہے۔ ا
کونے میں۔" بہزاد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا۔ مجسمے کے کئی ٹکڑے ایک کونے میں پڑے تھے۔ دوسرے
روشینہ نے ایک چیخ ماری اور خنجر پھینک کر مجسمے کے قریب پہنچ گئی۔

"یہ......... یہ تُو نے کیا کیا پاپی۔ ہائے تُو نے میرے من موہن کو مار دیا۔ ہا
میرے سوامی۔ اب تم ہی نہ رہے تو میں رہ کر کیا کروں گی۔ ہائے اس پاپی نے میر
سارے جیون کی تپسیا نشٹ کردی۔"

اس نے مجسمے کے ٹکڑوں کو سینے سے لپٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ
"ہائے سوامی اب میں کیا کروں۔" وہ مجسمے کے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی اور پھر ان
نزدیک لیٹ گئی اور پھر اس کا بدن عجیب سی ہیئت بدلنے لگا۔ اس کی شکل بدل گئی
پھر وہ ہڈیوں کے ایک پنجر میں بدل گئی۔

میں اور بہزاد اسے دیکھ رہے تھے۔

"خس کم جہاں پاک۔ آؤ نعمان!" بہزاد نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس منحوس
قید خانے سے باہر نکل آیا۔

"بہزاد......... بہزاد........." میں رندھی آواز میں کہا۔

"بھابی آرام سے ہیں میں نے انہیں سمجھا دیا ہے۔" بہزاد نے کہا۔

"کہاں......... کہاں ہے زبیدہ؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"حویلی ہی کے ایک کمرے میں؟" بہزاد نے جواب دیا اور پھر مجھے لے کر حویلی
کے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں زبیدہ میری زندگی موجود تھی۔ بدحواس پریشان'
اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھا اور میں نے سارا تکلف بالائے طاق
رکھ کر اسے لپٹا لیا۔

بہزاد کھنکھارنے لگا اور میں جھینپ گیا۔

"آؤ بہزاد چلیں۔" میں نے کہا اور پھر اس منحوس حویلی سے نکل آئے' میں نے
اسٹیئرنگ پر بیٹھنا چاہا لیکن بہزاد نے مجھے روک دیا۔

"نہیں جناب۔ آپ میری بھابی کے ساتھ پیچھے تشریف رکھیں کار میں چلاؤں
گا۔"

میں نے مسکرا کر اس کی بات مان لی تھی اور پھر میں زبیدہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔
اس بیچاری کی سمجھ میں ایک بات بھی نہیں آ رہی ہوگی

"مجھے افسوس ہے زبیدہ تم میری زندگی میں آتے ہی اس مصیبت کا شکار ہو گئیں
لیکن تم اس کمبخت کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں۔"

"بس میں کچھ نہیں جانتی۔ میں......... میں اپنے گھر تھی۔ بارات رخصت
ہونے والی تھی اچانک میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو خود کو یہاں پایا۔"

"اوہ بہزاد تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ مجھے بتاؤ۔"

"آپ کا قرض اتارنا تھا ڈاکٹر نعمان۔ آپ نے عین وقت پر میری جان بچائی
تھی۔ میں نے اس کا بدلہ اتارا ہے اور میں پہلے بھی اس شیطانی جال میں پھنسا تھا۔ چند
روز تو بس غم کا شکار رہا۔ پھر میں نے سوچا اس اسرار کو معلوم تو کروں یہ چکر کیا ہے
اور بس میں نے تحقیق شروع کردی۔ اس کے لئے میں اس قصبے میں آیا اور ایک ایک

سے معلومات حاصل کیں۔ میری ملاقات ایک سادھو لکشمی نرائن سے ہوئی اور ا
میں نے پوری تفصیل بتائی۔ اس بے چارے نے میری مدد کی اور اس کم بخت کی
سنائی۔

"یہ ایک زمیندار کی بیٹی رچنا تھی۔ جس کے تعلقات ایک نوجوان ہرنائی
ہو گئے تھے۔ زمیندار بہت جلاد تھا۔ اس نے اس کی گردن دبا کر ایک اندھے کنوی
ڈال دیا اور ہرنائی کو زندہ ایک دیوار میں چنوا دیا لیکن رچنا بد روح بن گئی اور ا
محبوب کے لئے اس نے ایک عمل شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں اس نے چھ نوجوا
کو پھانس کر ان کے دل نکال لئے اور اس مجسمے کے میری مراد ہے ہرنائی کے مجسمے
قدموں میں انہیں بھینٹ چڑھایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق سات قربانیوں کے بع
حیات پا جاتا۔ اب اس میں کیا حقیقت ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانے۔ اس کا ساتواں
میں تھا اور جب تم نے مجھے بچا لیا تو اس کم بخت نے تمہارا انتخاب کیا۔ اور نہ جا
کس طرح بھابی کو وہاں سے لا کر یہاں بند کر دیا اور خود تمہارے پاس پہنچ گئی۔ ر
لکشمی نرائن نے ہی یہ ترکیب بتائی تھی کہ اس مجسمے کو توڑ دوں تو وہ ختم ہو جائے گ
بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ میں اتفاقیہ طور پر ہی اس حویلی میں پہنچا تھا وہ موج
تھی بس میں نے بھابی کو یہاں دیکھا اور بہرحال مجھے شبہ ہو گیا چنانچہ پہلے میں نے
مجسمے کو توڑا اور اس کے بعد حالات تمہیں معلوم ہیں..........."

"اف۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اب اس شیطانی چکر کے با
میں دوسروں کو کیا بتائیں گے۔ کون یقین کرے گا! تیز گاڑی چلاؤ بہزاد اب میں
ہوں رات ختم ہونے سے قبل ہم واپس پہنچ جائیں اور خاموشی سے اپنے کمر
چلے جائیں دوسروں کو اس بارے میں بتانے سے کیا فائدہ۔" اور بہزاد نے ک
رفتار تیز کر دی۔

☆======☆======☆

مغرور

ایک شیطان صفت جن کا قصہ جو مغرور ہو کر انسانوں
کے لئے باعثِ آزار بن گیا تھا۔ ایک جن اور
انسان کے مقابلے کی انوکھی رُوداد

حکیم صاحب سے میری ملاقات انتہائی عجیب ماحول میں ہوئی اس وقت میری
تقریباً بیس سال تھی۔ بی اے پارٹ ون کا طالب علم تھا۔ کالج میں ایک ہی شخص ایسا
جسے میں جگری دوست کہہ سکتا تھا۔ وہ تھا یوسف۔ ایک کھاتے پیتے گھر کا نوجوان خلوص
پیکر۔

ہم دونوں کی دوستی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ یوسف کے والد کی ایک ٹرانسپور
کمپنی تھی۔ بہت عمدہ کاروبار چل رہا تھا۔ ہر سال وہ لوگ گرمیاں گزارنے کے لئے م
جاتے تھے۔ میں بھی اکثر ساتھ جاتا لیکن اس بار کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے میں ا
کے ساتھ نہ جاسکا۔

یوسف کے بغیر وقت بہت کٹھن گزر رہا تھا۔ میں اس کی واپسی کا منتظر تھا ک
معمول کے مطابق ان لوگوں کی واپسی میں دس بارہ روز باقی تھے۔

میں نے آغا جان (میرے والد محترم) سے اجازت طلب کی۔ چونکہ یہاں م
مصروفیات ختم ہوچکی تھی اس لئے آغا جان نے مری جانے کی اجازت دے دی اور
خوشی خوشی تیاری کرنے لگا لیکن جس دن میں روانہ ہونے والا تھا۔ اس دن مجھے یوسف
ٹیلی فون ملا۔ یوسف نے گھر ہی پر سے ٹیلی فون کیا تھا۔ وہ لوگ مری سے آگئے تھے۔

یوسف نے افسردہ لہجے میں بتایا کہ میں فوراً اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ اس کے بھ
کی حالت بہت خراب ہے۔

یوسف کے چھوٹے بھائی آصف سے میں بھی بہت محبت کرتا تھا۔ بڑا ہنس مکھ ا
شریر تھا۔ ملتان سے اچھا خاصا گیا تھا اس لئے مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی جلد اسے کیا ہوگ
بہرحال میں فوراً یوسف کی طرف روانہ ہوگیا' گھر کا ماحول دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ معا
واقعی سنجیدہ ہے۔ پھر یوسف سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے بھائی کی حیرت ا
بیماری بتائی۔ اس نے بتایا کہ تین چار روز قبل تک آصف بالکل صحت مند تھا۔ مری

اس کی ہٹ کے قریب چند لوگ اور بھی مقیم تھے۔ انہی میں آصف کے دو ہم عمر لڑکے
بھی مل گئے اور وہ ان لوگوں سے علیحدہ سیروتفریح کرنے لگا۔

ایک دن شام کو آصف واپس آیا تو اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اس نے والدہ کو
بتایا کہ وہ آج بہت تھک گیا ہے۔ بہرحال کھانا وغیرہ کھا کر وہ سوگیا۔

اور پھر اس وقت رات کے دو بجے تھے جب آصف وحشت ناک آواز میں چیخ پڑا۔
یوسف اور اس کے والدین نزدیک ہی سو رہے تھے۔ اس کی چیخ پر سب جاگ اٹھے۔ وہ
لوگ یہی سمجھے تھے کہ آصف خواب میں ڈر گیا ہے۔ آصف کا چہرہ خون کی طرح سرخ
ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں وحشت ناک چمک تھی اور پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

وہ لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ رات کے دو بجے تھے اس
لئے کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سب بے بس تھے کافی دیر تک آصف پر یہ کیفیت طاری رہی
اور پھر اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان میں وہی تیز
چمک تھی۔ ایک خوفناک چمک' آصف کی والدہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سخت
دہشت زدہ ہوئیں۔ اس کے بعد آصف نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر وہ سوگیا۔

گھر والوں کو رات بھر نیند نہ آئی وہ اس اچانک اور عجیب بیماری سے سخت پریشان ہوگئے
تھے۔ اس سے قبل آصف کی کبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی بہرحال صبح آصف حسب معمول جاگا
لیکن اسکا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ گھر والوں نے اس کی اس کیفیت
کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے لاعلمی ظاہر کی اور پھر اس نے بتایا کہ اس کی کمر میں ٹیسیں
اٹھ رہی ہیں۔ یوسف کے والد نے کمر کے اس حصے کو کھول کر دیکھا جہاں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں
اور حیران رہ گئے۔ اس جگہ ایک گول ابھرا ہوا نشان سا تھا۔ نشان کے ابھار کسی عبارت کی شکل
کے تھے لیکن وہ عبارت کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔

آصف سے اس نشان کے بارے میں پوچھا گیا لیکن اس نے اس سے لاعلمی ظاہر
کی۔ پھر اس سے پچھلے دن کی مصروفیات پوچھی گئیں لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہ
تھی۔ آصف نے بتایا کہ وہ اور اس کے دوست پہاڑی پر گئے تھے اور پورا دن انہوں نے
وہیں گزارا۔ مزید معلومات حاصل کرنے پر اس کے ایک دوست نے بتایا کہ پہاڑی پر
چونے سے بنی ہوئی ایک قبر تھی جس کے نزدیک بیٹھ کر وہ لوگ کافی دیر تک تاش کھیلتے
رہے تھے۔

بہرحال اس دوست سے بھی اس گول سرخ نشان کے بارے میں کچھ نہیں م
ہوسکا۔ دوپہر تک آصف کی حالت ٹھیک رہی' لیکن ایک بجے کے قریب وہ پھر رات
انداز میں چیخنے لگا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہوگیا تھا اور آنکھوں میں مشعلیں
روشن ہوگئی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے اور زبان بھی باہر نکل آئی تھی۔ آ
کی والدہ صدمے اور خوف سے بے ہوش ہوگئیں۔

تقریباً دس منٹ تک اس کی یہ کیفیت رہی۔ یوسف ڈاکٹر کو بلانے کے لئے
تھا پھر جب وہ ڈاکٹر کو لے کر واپس آیا تو آصف پُرسکون اور آنکھیں بند کئے سو رہا
ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا لیکن اس کیفیت کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔
اس نے وہ گول سرخ نشان دیکھا اور کہا کہ یہ نشان شاید جل جانے سے بن گیا ہے۔

بہرحال وہ الٹی سیدھی دوائیں اور ایک انجکشن دے کر چلا گیا۔ تمام تفریح خا
میں مل گئی تھی۔ آصف کی والدہ بیٹے کی حالت دیکھ کر بے حال ہوئی جارہی تھیں۔ انہ
نے واپسی کی تجویز پیش کی لیکن آصف کے والد نے کہا کہ کم از کم حالات تو معلوم کر
چاہئیں۔ انہوں نے بھی شبہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے یہ نشان کسی زہریلے کیڑے کے کا
سے بن گیا ہو اور اس کیڑے کے زہر سے آصف کی یہ حالت ہو بہرحال یہ سب ص
قیاس آرائیاں تھیں۔

شام کو آصف کو بخار ہوگیا اور پھر وہ تیز ہی ہوتا گیا۔ اب گھر کے سب لوگ گھبرا
تھے چنانچہ یوسف کے والد بھی واپسی کے لئے تیار ہوگئے اور پھر انتہائی سفر کے بعد
پہنچ گئے۔ دوران سفر بھی آصف کو دورہ پڑ گیا تھا۔ بمشکل اسے سنبھالا گیا۔ وہ بدستور
میں بھن رہا تھا۔

"یہاں کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا؟ میرا خیال ہے ہسپتال لے چلو۔" میں
مشورہ دیا۔ آصف کی حالت دیکھ کر مجھے بھی بے حد دکھ اور رنج ہوا تھا۔

"کچھ ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں۔ ان کا معائنہ مکمل ہوجائے تو فیصلہ کیا جاسکے گا
یوسف نے بتایا۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ میں اسے تسلیاں دینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈا
واپس چلے گئے اور میں یوسف کے ساتھ آصف کے کمرے کی طرف چل دیا۔ آصف
والدہ اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں روتے روتے سوج
تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ رونے لگیں اور میں بھی رنجیدہ ہوگیا۔ میں نے آصف کی حال

دیکھی۔ درحقیقت اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کئے گہری گہری
سانسیں لے رہا تھا۔

"ڈاکٹروں نے کیا بتایا؟" میں نے یوسف کی والدہ سے پوچھا۔

"ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا بیٹے! کہہ رہے ہیں ہسپتال بھجوا دیا جائے تاکہ اس
گول نشان کا معائنہ کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید یہ کوئی زہریلا پھوڑا ہے۔ نہ جانے
میرے بچے کو کیا ہوگیا ہے۔" وہ سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیسے تسلی دوں۔ آصف کو ہسپتال میں داخل
کردیا گیا۔ گول نشان کا جدید آلات سے معائنہ ہوا لیکن اس میں کسی قسم کے جراثیم
یا زہریلے مادے کے آثار نہیں ملے۔ البتہ وہ بڑھتا جارہا تھا۔ آصف کے بخار میں کمی ہوگئی
تھی لیکن اس کی ذہنی حالت درست نہیں رہی تھی۔ اب وہ بہکی بہکی گفتگو کرنے لگا تھا۔

یوسف کے والدین کی حالت ناقابل بیان تھی۔ میں ان لوگوں کی اس حالت پر بہت
کڑھتا لیکن میں بھی بے بس تھا۔ سوائے اس کے کہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا اور انہیں
تسلی دیتا۔

آصف کی کمر کا نشان اب ایک پھوڑا بن گیا تھا۔ اس کا حجم بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ڈاکٹر
وغیرہ بھی پریشان تھے اور پھر انہوں نے پھوڑے کے آپریشن کا فیصلہ کیا اور ایک صبح اس کا
آپریشن کرلیا گیا لیکن سب ششدر رہ گئے تھے کیونکہ پھوڑے سے کسی قسم کا مواد نہیں
نکلا تھا۔ وہ بالکل خالی تھا۔

ڈاکٹروں نے زخم کو بجلی سے جلایا۔ کئی دن تک آصف کی حالت نازک رہی اور جلد
پر پھوڑا پھر سے پھلنے پھولنے لگا۔ تین چار دن میں پھوڑا پھر اسی طرح ہوگیا۔

غرض تین بار پھوڑے کا آپریشن کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ پھر اسی طرح
پھول جاتا۔ یوسف کے والدین نے آصف کو کراچی لانے کا فیصلہ کیا اور کراچی آنے کی
تیاری ہونے لگی۔

میں نے بھی آغا جان سے اس کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی اور پھر ہم لوگ
ساتھ ہی کراچی آئے۔

کراچی کے ماہر سرجنوں نے پھوڑے کا معائنہ کیا لیکن بے نتیجہ۔ یہاں بھی اس کے
دو آپریشن ہوئے اور ان کا نتیجہ پہلے سے مختلف نہیں تھا۔

آصف اب مکمل دیوانہ ہوگیا تھا۔ اسے اپنی تکلیف کا بھی احساس نہیں تھا۔
وقت اُلٹی سیدھی گفتگو کرتا رہتا۔ کبھی ہنستا کبھی رونے لگتا اور کبھی اس پر تشنج د
جاتا تھا۔

پھر قدرت کی نگاہِ کرم ہوئی۔ آصف کی والدہ کی دعائیں قبول ہوگئی تھیں۔ ا
ہسپتال سے آصف کو لے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ دوسرے دن ہسپتا
رخصت لے لی جائے۔ آصف کی والدہ اس کی مسہری کے پائنتی بیٹھی ہوئی تھیں۔
کے بستر سے مریض کو دیکھنے کے لئے چند خواتین آئی تھیں۔ ان میں سے ایک معمر
نے آصف کو دیکھا اور اس کی والدہ سے اس کی بیماری کے بارے میں پوچھنے لگ
آصف کی والدہ نے آنسو بھری آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں آصف کی کہانی سنا
وہ خاتون بھی رونے لگیں۔

”بہن! میری مانو تو یہ ڈاکٹر واکٹر کا علاج چھوڑو۔ کسی عامل کو دکھاؤ۔ یہ بیماری
کوئی اور ہی چکر ہے۔“

آصف کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں لیکن بیٹے کی حالت پر خود اعتماد کھ
تھیں۔ بات ان کے دماغ میں بیٹھ گئی اور انہوں نے خاتون سے پوچھا کہ اگر وہ کسی عا
جانتی ہوں تو بتائیں جواب میں خاتون نے ایک عامل صاحب کا پتہ بتا دیا۔ دوسر
آصف کو ہسپتال سے ہٹالیا گیا۔ فوری طور پر ایک خوبصورت علاقے میں مکان کا بند
کرلیا گیا اور سب وہاں منتقل ہوگئے۔

میں بدستور ان کے ساتھ تھا اور ہر معاملے میں پیش پیش۔ یوسف اور اس
والدین میرے بہت احسان مند تھے۔ اس کی والدہ مجھے ہر وقت دعائیں دیتی تھیں او
تھیں کہ میری موجودگی سے انہیں بہت ڈھارس ہے۔

بہرحال ہم نے ان عامل صاحب کا پتہ معلوم کیا اور ان کے پاس پہنچ گئے۔
خاصا مکان تھا۔ اس کے ایک کمرے میں بابا کا قیام تھا۔ خود بابا صاحب اس کمرے کو
کٹیا کہتے تھے۔ ایک طرف تعویذوں کے لئے کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف بوتلیں
ہوئی تھیں جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان بوتلوں میں ہر مرض
ہے۔ پیٹ میں درد ہو، کان میں درد ہو، داڑھوں میں درد ہو، بچے کو نظر لگ گئی ہو، د
آرہے ہوں، دست نہ آرہے ہوں، بوتلوں میں موجود پانی ہر مرض کی دوا تھا۔

عامل صاحب نے آصف کے بارے میں تفصیل سنی اور اس انداز میں مسکرا کر
گردن ہلانے لگے جیسے اس تمام ڈرامے کے ذمہ دار وہ خود ہی ہیں۔ پھر انہوں نے ایک
سیاہ مرغ اور ایک مرغی کا جوڑا طلب کیا جن کے پتے پر وہ آصف کے لئے تعویذ لکھنا
چاہتے تھے۔ چھ گز لٹھا، پچیس روپے اور ایک تسبیح طلب کی اور ہم یہ چیزیں لانے کا وعدہ
کرکے اٹھ گئے۔

راستے میں میں نے یوسف سے کہا۔ ”یار یوسف! مجھے تو یہ بابا صاحب بالکل نہیں
جچے تم نے ان کے سرخ ٹماٹر جیسے گالوں کو دیکھا یہ یقیناً ان ہی مرغیوں کا کرشمہ ہے جن
پتے پر یہ تعویذ لکھتے ہیں۔“

یوسف کے خشک ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بھی کہا کہ عامل
صاحب ڈھونگئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال ہم نے والدہ سے عامل صاحب کی طلب کی
ہوئی اشیاء کے بارے میں کہا اور انہوں نے ہماری بدعقیدگی پر ناراضگی کا اظہار کرتے
ہوئے وہ سامان عامل صاحب کے پاس بھجوادیا۔ عامل صاحب ایک ہفتے تک یوسف کی
والدہ سے مال گھسیٹتے رہے لیکن فائدے کی کوئی شکل نظر نہیں آئی۔ تب یوسف کی والدہ
بھی بددل ہوگئیں اور کسی اچھے عامل کی تلاش شروع ہوگئی۔

دواؤں کا مرحلہ ختم ہوچکا تھا۔ اب صرف دعاؤں کی بات تھی۔ یوسف کی والدہ نے
رات دن ایک کرلیا تھا۔ وہ ہروقت مصلے پر ہوتیں۔ آصف کی وہی کیفیت تھی۔ پھوڑا جو
اب کرکٹ کی گیند کے برابر ہوگیا تھا۔ اس کا رنگ ہلکا نیلا تھا جس سے اس کے زہریلے
ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ ہروقت پڑا بڑبڑاتا رہتا۔ کبھی کبھی اس پر دورہ بھی پڑجاتا، لیکن
اب اس دورے کی دوسرے لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ اہمیت نہیں رہی تھی کیونکہ
سب اس سلسلے میں قطعی بے بس تھے۔

اس شام میں اور یوسف ایک نواحی بستی کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے ٹیکسی کا
انتظار کررہے تھے کہ ایک ہی نمبر کی دو بسیں ریس کرتی ہوئی آئیں۔ سواریوں کو اسٹاپ پر
اترنا تھا لیکن ڈرائیور کو جلدی تھی کہ دوسری بس آگے نہ نکل جائے۔ اس نے ایک لمحے
کے لئے بس کی رفتار سست کی اور دو نوجوان آدمی دھم دھم کرکے بس سے نیچے کود
گئے۔ ان کے پیچھے ایک باریش بزرگ بھی اترنا چاہتے تھے، لیکن نوجوان انہیں پیچھے
دھکیل کر پہلے خود کود گئے تھے۔ ناچار بزرگ بھی نیچے کود پڑے۔ ہم دونوں اس کے بالکل

نزدیک تھے۔ بس ڈرائیور اور ان نوجوانوں کی بدتمیزی پر سخت طیش آیا لیکن طیش کر کے بجائے ہم نے بزرگ کو جلدی سے اٹھایا اور وہ شرمسار سے اٹھ کھڑے ہوئے کے گھٹنوں پر چوٹ لگی تھی اور سفید پاجامے پر خون کے دھبے جھلک آئے تھے۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے بچو۔" انہوں نے خلوص سے کہا۔ بس ڈرا اور ان نوجوانوں کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

"ان ڈرائیوروں کے سلسلے میں قانون بالکل بے بس ہوگیا ہے میں نے بس نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ آپ پولیس میں رپورٹ درج کرادیں۔" یوسف نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔

"اللہ انہیں نیک ہدایت دے جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب رہنے دو۔" انہوں جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا اور ہم دونوں ان کی نیک فطرت سے بہت متاثر ہوئے۔

"آپ کے گھٹنوں میں زخم ہیں۔ ہم آپ کو گھر پہنچادیں۔ آپ ہمارا سہارا لیجئے۔"

"ہمیشہ خوش رہو بیٹے۔ میں تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں لیکن خود بھی محسوس کر ہوں کہ اپنے قدموں سے چل کر نہ جاسکوں گا۔ میرا گھر وہ سامنے نظر آرہا ہے۔ وہاں پہنچادو۔" انہوں نے کہا۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہم انہیں سہارا دے کر ان کے کوارٹر کی طرف گئے اور چند منٹ کے بعد کوارٹر کے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے ناصر کہہ کر کسی کو آ دی اور گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ نکل آیا۔

"پردہ کراؤ بیٹے کچھ مہمان آئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

اور لڑکا ان کے گھٹنوں سے چھلکتا ہوا خون اور ان کی حالت دیکھ کر چونک بہرحال اس نے کچھ کہا نہیں، چند لمحات کے بعد واپس آیا اور اندر آنے کا اشارہ کیا نے بزرگ کو اندر ایک چارپائی پر پہنچادیا اور اجازت طلب کی۔

"اوہ نہیں بیٹے۔ ایک ایک پیالی چائے پی لو تو مجھے مسرت ہوگی۔"

"آپ گھٹنے کے زخم صاف کرائیے۔ ہمیں اجازت دیجئے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں بیٹے...... تم بیٹھو میں چائے کے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں ناصر!" انہوں نے لڑکے کو آواز دی اور لڑکا ان کے قریب پہنچ گیا۔ "میں ابھی آ

آرام سے بیٹھو۔" انہوں نے لڑکے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہا اور ہم مجبوراً ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ تقریباً چھ منٹ کے بعد وہ واپس آئے۔ انہوں نے دوسرا پائجامہ پہن لیا تھا۔ چارپائی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے اندر رخ کر کے کہا۔

"چائے بھیج دو۔" اور ایک ٹین کی ٹرے میں صاف ستھری پیالیوں میں چائے آگئی۔

چائے کے دوران انہوں نے اپنا تعارف کرایا میرا نام اصغر علی ہے۔ حکیم ہوں اور ایک چھوٹی سی دکان ہے جسے مطب بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت مطب سے ہی واپس آرہا تھا کہ......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئے اور چند لمحات کے بعد بولے۔

"آپ دونوں کا تعارف حاصل کرسکتا ہوں؟"

"جی میرا نام وقار ہے اور یہ میرے دوست یوسف ہیں۔" میں نے جواب دیا اور وہ گردن ہلانے لگے۔ ہم لوگ خاموشی سے چائے پیتے رہے اور پھر چائے ختم ہوگئی۔ وہی لڑکا پیالیاں واپس لے گیا اور ہم دونوں نے اجازت طلب کی۔

"اگر جلدی نہ ہو تو کچھ دیر بیٹھو بیٹے۔ بڑی اپنائیت محسوس کررہا ہوں۔ اگر کوئی کام ہے تو مجبوری ہے۔" وہ بڑے خلوص سے بولے۔

ہم لوگ ان کی شخصیت سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ گو وہ معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے لیکن جس قدر پاکیزہ ماحول تھا اور انداز سے وہ لوگ جیسے نظر آتے تھے ان کے تحت اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی بہت اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ ویسے ایک بات میں نے محسوس کی تھی حکیم اصغر علی کے چہرے پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی کشمکش کے آثار نمودار ہوجاتے تھے۔

ہم لوگ مزید کچھ دیر بیٹھے اور حکیم صاحب ہم سے ہمارے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر ہم نے دوبارہ اجازت طلب کی اور وہ بسم اللہ کہہ کر کھڑے ہوگئے۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ دروازے تک آئے اور پھر ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

"میاں، اگر برا نہ مانو تو مجھے اپنے گھر کا پتہ دے دو۔ کل حاضر ہوں گا۔"

"ضرور حکیم صاحب۔" میں نے کہا اور مکان کا پتہ لکھ دیا اور پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔ گھر پہنچے تو سب لوگ سخت پریشان تھے آصف پر پھر دورہ پڑ گیا تھا اور اس کی وہی حالت تھی یوسف کے والد مصلے پر بیٹھے رو رو کر دعا مانگ رہے تھے۔ ان کے الفاظ میرے دل میں تیر کی طرح اتر آئے اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"یا اللہ! اگر آصف کی زندگی نہیں ہے تو اسے اٹھا لے۔ تیرے کام تُو ہی جانتا ہے ہم اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔"

ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے موت کی دعا مانگ رہا تھا۔ ماحول بے حد سوگوار تھا۔ یوسف کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے یوسف کی والدہ کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا تھا کیونکہ ان کی حالت بگڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ آصف حسب معمول تڑپتا رہا۔ اس کی کمر کا پھوڑا اب کرکٹ کے گیند سے بھی بڑا ہوگیا تھا۔ بہرحال تھوڑی دیر یہ کیفیت رہی اور پھر وہ پُرسکون ہوگیا۔

دوسرے دن صبح ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور یوسف دروازے پر چل دیا۔ ہم نے سلام کی آواز سنی اور میں نے حکیم صاحب کی آواز پہچان لی۔ یوسف ڈرائنگ روم کھولنے چلا گیا تھا۔

"کون ہے؟" یوسف کی والدہ نے پوچھا اور میں نے مختصراً گزرے ہوئے واقعہ بتا دیا۔ "انہیں ناشتہ وغیرہ کراؤ۔"

انہوں نے کہا میں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ حکیم صاحب بھی چند منٹ بعد وہیں پہنچ گئے اور ہم نے ان کا تعارف کرایا۔ چند منٹ کے بعد ملازم ناشتہ لے آیا گیا۔

"میں ناشتہ کرکے آیا ہوں۔" حکیم صاحب نے کہا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں وہی کشمکش پھر دیکھی جیسی میں شام کو دیکھ چکا تھا۔ بہرحال بہت اصرار پر انہوں نے پیالی چائے کی پی لی اور پھر وہ بولے۔

"وقار میاں نے بتایا تھا کہ آپ حضرات ملتان سے تشریف لائے ہیں۔ یہاں مقصد کیا تھا..........؟"

جواب میں آصف کے والد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر آصف کے بارے میں تفصیل بتائی اور میں نے حکیم صاحب کی آنکھوں میں اطمینان کے آثار دیکھے۔ وہ دور ہوگئی تھی۔ وہ سکون سے تفصیل سنتے رہے پھر بولے۔

"اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمائے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور۔ میں پردہ کرائے دیتا ہوں"۔ یوسف کے والد بولے اور اٹھ کر اندر گئے اور پھر انہوں نے ہمیں آواز دی اور ہم حکیم صاحب کے ساتھ اندر پہنچ گئے

اور یوسف پہلے اندر داخل ہوئے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے دروازے میں قدم رکھا۔ آصف اس وقت آنکھیں بند کئے لیٹا تھا لیکن جوں ہی حکیم صاحب نے اندر قدم رکھا اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی وہی وحشیانہ چمک تھی اور اس کی نظریں حکیم صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔

حکیم صاحب آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور آصف کی چارپائی کے نزدیک پہنچ گئے۔ آصف جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اس سے قبل اسے سہارے کے بغیر نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ ہم سب نے اس بات کو حیرت سے دیکھا۔ حکیم صاحب اسی انداز میں مسکرا رہے تھے اور آصف کے چہرے پر خوف کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سلام عرض کرتا ہوں سید صاحب۔"

"وعلیکم السلام۔" حکیم صاحب نے اسی خوش اخلاقی سے کہا۔ ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ کیونکہ آصف کے حلق سے جو آواز نکلی تھی وہ اس کی اپنی نہیں تھی بلکہ اس میں سختی اور پھٹی پھٹی سی کیفیت تھی۔

"کیا بات ہے میاں۔ بچے کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" حکیم صاحب بولے۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے سید صاحب۔ براہ کرم اس میں دخل نہ دیں۔" آصف نے اسی آواز میں کہا۔

"بری بات ہے میاں۔ بفضل تعالیٰ مسلمان ہو۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کو پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی حالت پر رحم نہیں آتا؟"

"میں کہہ چکا ہوں سید صاحب۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔"

"میں تمہیں ظلم سے روک رہا ہوں۔ ہر مسلمان کے مسائل دوسرے کے لئے اپنے مسائل ہوتے ہیں مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔" حکیم صاحب حلیم لہجے میں بولے۔

"اگر آپ نے میرے خلاف کچھ کیا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔" آصف نے کہا۔

"تم جانتے ہو زندگی اور موت رب حقیقی کی پابند ہے۔ تمہارے یہ الفاظ شریعت سے انحراف کے مترادف ہیں۔ چنانچہ تمہارے لئے سزا لازمی ہوگئی ہے۔" حکیم صاحب

کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور ایک عجیب سا جلال ٹپکنے لگا۔ ہم سب بت بنے گفتگو سن رہے تھے۔ آصف جب سے بیمار ہوا تھا اس وقت سے اب تک نے اتنی صاف گفتگو نہیں کی تھی اور یہ گفتگو اس کی اپنی نہیں تھی۔ کوئی اور اس ک سے بول رہا تھا۔

"مجھ سے بگاڑ کر آپ نقصان میں رہیں گے سید صاحب! سوچ لیں۔" آص کہا۔

"ایک کٹورے میں پانی اور صاف بوتل لے آؤ۔" میں فوراً باہر کی طرف دو چند لمحات میں حکیم صاحب کی مطلوبہ چیزیں لاکر ان کے سامنے رکھ دیں۔

حکیم صاحب نے کٹورے سے تھوڑا سا پانی لے کر کلی کی اور پھر ایک طرف کچھ پڑھنے لگے۔ آصف کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جارہا تھا اور پھر اس پر دہ والی کیفیت طاری ہوگئی لیکن حکیم صاحب اسی طرح پرسکون انداز میں پڑھ رہے آصف پلنگ سے نیچے گر پڑا اور یوسف کے والد اسے اٹھانے کے لئے لپکے لیکن صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کردیا۔ یوسف کے والد مضطربانہ انداز رک گئے۔ چند منٹ کے بعد حکیم صاحب نے پانی دم کیا اور آصف کی طرف مسکرانے لگے۔

"اٹھ کر بیٹھ جاؤ میاں۔" اور آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خونخوار نظروں سے صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

آصف کچھ نہ بولا۔ اس کے ہونٹ کچھ پڑھنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ صاحب ہنسنے لگے پھر انہوں نے ہم لوگوں کی طرف رخ کرکے کہا۔

"آپ لوگ یا تو کمرے سے باہر چلے جائیں یا پھر اس حصار سے باہر نہ نکلیں انہوں نے انگلی سے فرش پر ایک دائرہ بنادیا اور ہم لوگ اس دائرے میں کھڑے ہ باہر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر آصف کھڑا ہوگیا اور اس نے زمین کی طرف کرکے پھونک ماری۔ ہم لوگوں نے خوف و دہشت سے دیکھا۔ جس جگہ پھونک ما تھی وہاں سیاہ رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ سانپ نے پھنکار ماری ا نظریں حکیم صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے دوسری پھنکار ماری اور حکیم ص کی طرف لپکا ہم لوگوں کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ حکیم صاحب نے مٹھی بند

سانپ کے سامنے کردی اور سانپ نے ان کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ حکیم صاحب نے دوسرا ہاتھ بھی سامنے کردیا اور سانپ نے اس پر بھی کاٹ لیا۔

ہمارے دم خشک ہوگئے تھے لیکن حکیم صاحب اسی طرح مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ایک انگلی کٹورے میں ڈالی اور پانی سانپ کی کاٹی ہوئی جگہوں پر لگالیا۔ پھر انہوں نے پانچوں انگلیاں پانی میں ڈبوئیں اور ان کے چھینٹے سانپ پر ماردیئے۔ سانپ نے پھن زمین پر ڈال دیا اور پھر وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ ہم نے اس کے پورے جسم سے دھواں اٹھتے دیکھا اور چند منٹ کے بعد وہاں راکھ پڑی ہوئی تھی۔

"تمہارا یہ سانپ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا میاں کچھ اور کوشش کرو۔"

"میں تمہیں فنا کردوں گا سید صاحب!" آصف کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی اور اچانک آصف نے منہ کھول کر "ہا" کی آواز نکالی۔ اس کی آنکھیں بے حد خوفناک ہورہی تھیں اور ہمارا دہشت سے برا حال تھا۔

"ہا" کی آواز کے ساتھ شعلوں کی زبانیں نکل پڑیں۔ یہ شعلے حکیم صاحب کی طرف لپکے۔ آصف کے منہ سے بدستور شعلے نکل رہے تھے اور حکیم صاحب کا جسم ان شعلوں کی زد میں تھا۔ قریب تھا کہ ہم چیختے ہوئے بھاگ نکلتے کہ ہمیں حکیم صاحب کی آواز سنائی دی۔ "آپ لوگ دائرے سے باہر نہ نکلیں۔ میں نے اسی لئے تجویز پیش کی تھی کہ آپ لوگ باہر نکل جائیں۔ براہ کرم حصار سے باہر نہ نکلیں۔"

ہم دم بخود ہوکر رہ گئے۔ حکیم صاحب کے جسم کے گرد شعلے رقص کررہے تھے لیکن وہ اطمینان سے کٹورے کا پانی بوتل میں ڈال رہے تھے۔ آدھا پانی انہوں نے بوتل میں ڈال لیا اور آدھا اسی طرح رہنے دیا۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھ لہرائے اور شعلے غائب ہوگئے۔

"ایک کوشش اور کرلو میاں۔ اس کے بعد میری باری ہے۔"

"کچھ بھی ہو سید صاحب اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو پھر میرا کیا ہوگا۔ میں بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

"تم اپنی شکل میں بھی زندہ رہ سکتے ہو۔ جو کچھ کیا ہے بھرو۔" حکیم صاحب نے کہا اور پھر کھڑے ہوگئے۔ اچانک انہوں نے کٹورے کا پانی آصف پر اچھال دیا اور آصف کی دھاڑیں گونجنے لگیں۔ وہ پورے کمرے میں چیختا پھر رہا تھا۔ حکیم صاحب نے آگے بڑھ کر

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا اور سکون سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ آ
کمرے میں لوٹتا پھر رہا تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔

"معاف کردو سید صاحب! معاف کردو۔ ہائے میں مرگیا۔ معاف کردو سید
ورنہ میں مرجاؤں گا۔ ہائے۔ ہائے۔ آہ۔ ہائے میں مرا۔ میں مرگیا۔ سید صاحب خد
لئے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔"

"خوب۔ تم نے خدا کا نام لیا تو سہی' ورنہ تم تو فرعون بن گئے تھے۔" حکیم صا
نے کہا اور پھر انہوں نے کچھ پڑھا اور آصف کی طرف رخ کرکے پھونک ماردی۔ آ
زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا اب وہ سہمی ہوئی نظروں سے حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ "اب
خیال ہے؟"

"میں واپس چلا جاؤں گا سید صاحب۔ پھر اپنی پچھلی زندگی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میرا نام ابوداؤد ہے۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی جس کی سزا میں ہمارے شہ
نے میری ہیئت تبدیل کردی اور میں ایک قبر میں رہنے لگا۔ اپنی دنیا سے میرا رابطہ منق
ہوگیا تھا۔ میں نوے برس سے اس قید میں زندگی گزار رہا تھا۔ پھر یہ آیا۔ اس کے ساتھ
اور لڑکے تھے۔ یہ قبر کے اس حصے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا جہاں سے قبر میں جانے کا راس
تھا۔ ہوا بند ہونے سے مجھے پتہ لگا اور پھر میں اس کی پشت میں داخل ہوگیا۔ اس ط
مجھے انسانی جسم مل گیا۔ مگر آپ نے۔ آپ نے مجھے بڑی سزا دی ہے حکیم صاحب۔"

"تم مشیت ایزدی میں دخل دینے لگے تھے ابوداؤد! میں نے تم سے مصالحت
گفتگو کی تھی۔ مجھے مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ خیر اب تم اس بوتل میں آجاؤ۔ میں
واپس مری بھجوادوں گا۔"

آصف خاموشی سے اوندھا لیٹ گیا۔ حکیم صاحب نے اس کی قمیص پیچھے سے
پھوڑا کھول لیا اور پھر ہم نے دنیا کا سب سے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ آصف کا
درمیان سے کھل گیا اور اس کے درمیان سے کوئی سرخ چیز نکلی۔ لمبی لمبی پتلی ٹانگیں
آئیں اور پھر وہ چیز رینگتی ہوئی آصف کی کمر پر آگئی۔

ہم نے خوفزدہ نظروں اور دھڑکتے دل سے دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کا ایک بچھو
انتہائی خوف ناک بچھو جس کا منہ سیاہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا بوتل کی طرف

گیا۔ پھر وہ بوتل کے اوپر چڑھنے لگا اور اس کے منہ میں داخل ہوگیا۔ بوتل میں داخل
ہونے کے بعد حکیم صاحب نے اس کی ڈاٹ بند کردی اور ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر
مسکراتے ہوئے بولے۔

"بچے کو مسہری پر لٹا دیں۔" یوسف کے والد بے تحاشہ دوڑے اور حکیم صاحب
کے قدموں میں گر پڑے۔ ان کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے
اور یوسف نے آصف کو اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

حکیم صاحب نے جلدی سے یوسف کے والد کو اٹھایا اور لرزتے ہوئے بولے "کیا
کر رہے ہیں آپ۔ کیوں مجھ گنہگار کو اور گنہگار کررہے ہیں۔ میں نے صرف اپنا فرض
انجام دیا تھا۔ مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ ابوداؤد کو ایک مسلمان کو پریشان کرنے سے روکو۔
میں بے چین تھا۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کامران کیا بس اب مجھے اجازت
دیجئے۔"

"ابھی نہیں' مجھے کچھ خدمت کا موقع دیجئے۔" یوسف کے والد نے کہا۔

"براہ کرم جس خدمت کا تصور آپ کے ذہن میں ہے اسے نکال دیجئے۔ اللہ کا دیا
سب کچھ ہے۔ بس دعائے خیر کی ضرورت ہے۔" حکیم صاحب نے کہا۔

اور یوسف کے والد صاحب ششدر رہ گئے۔ حکیم صاحب نے بوتل اٹھائی اور
میری طرف رخ کرکے بولے۔ "وقار میاں اجازت چاہئے۔" میں انہیں چھوڑنے باہر
تک گیا۔ میں دل سے حکیم صاحب کا معتقد ہوگیا تھا میں نے ان سے درخواست کی کہ میں
شام کو ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

"غریب خانہ حاضر ہے جب دل چاہے آؤ۔" انہوں نے گرمجوشی سے کہا اور پھر میں
انہیں رخصت کرکے اندر واپس آگیا۔ اندر یوسف کی والدہ سجدہ شکر میں پڑی ہوئی
تھیں۔ ان کی سسکیاں جاری تھیں یوسف نے بتایا کہ آصف نے اسے بھائی جان کہہ کر
مخاطب کیا اور پانی مانگا تھا۔ بہرحال ہم سب کی خوشیوں کی انتہا نہیں تھی۔ یوسف کے والد
صاحب بار بار حکیم صاحب کے بارے میں استفسار کررہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ
کے حضور ان کی دعا قبول ہوئی اور حکیم صاحب یقیناً فرشتے تھے۔ میں نے حکیم صاحب کی
آنکھوں کی کشکش کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ظاہر ہے ان بزرگ صفت انسان سے
ہماری پریشانی کہاں چھپی ہوگی اور انہوں نے صاف طور پر نہیں کہا تھا البتہ وہ ہر قیمت پر

یہاں آنا چاہتے تھے۔

شام تک آصف کی پشت پر پھوڑے کا نشان حیرت انگیز طور پر درست ہوگیا
باقاعدہ گفتگو کرنے لگا۔ جس مصیبت میں ہم سب عرصے سے گرفتار تھے وہ چند گھنٹو
ہی دور ہوگئی۔ بہرحال اس شام ہم پھول اور مٹھائی لے کر حکیم صاحب کے مکان
گئے اطلاع ملتے ہی حکیم صاحب نے ہمیں اندر بلایا۔ یوسف کے والد صاحب بھی
تھے۔ انہوں نے حکیم صاحب کے ہاتھ چومنا چاہے تو حکیم صاحب نے جلدی سے
پیچھے ہٹا لیا۔

"میں بھی آپ کی طرح ایک گنہگار انسان ہوں۔ یہ مناسب نہیں ہے اور یہ
وغیرہ بھی قبول نہیں کروں گا البتہ اگر آپ حکم دیں تو مٹھائی پر نیاز کردوں۔ باہر بچو
تقسیم کردیں۔"

ہم لوگ بڑا خوشگوار تاثر لئے واپس آئے۔

آصف کو اب کوئی بیماری نہیں تھی صرف کمزوری تھی لیکن فیصلہ کیا گیا کہ ا
وقت کراچی میں ہی گزارا جائے جب تک آصف بالکل تندرست نہ ہوجائے۔

اداسیاں چھٹ گئی تھیں۔ سب لوگ خوش و خرم تھے۔ ہم لوگ کراچی کی خو
کرتے۔ آصف بھی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ حکیم اصغر علی صاحب سے
ملاقات ہمارا معمول بن گئی تھی۔ وہ بھی ہم سے بے حد مانوس ہوگئے تھے۔ نہ صر
بلکہ ان کے گھر کے تمام لوگ پابند شرع تھے۔ اتنے دن سے ہم جا رہے تھے لیکن ا
گھر کی کسی خاتون کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ ویسے ہمیں حیرت تھی کہ حکیم صاحب
عظیم شخصیت کے مالک تھے ان کی اپنی زندگی بے حد سادہ تھی۔ بچے تک پیوند لگے
پہنتے تھے۔ حکمت سے مناسب آمدنی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ حکمت چل نہ رہی
مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا لیکن حکیم صاحب اتنے معمولی پیسے لیتے تھے کہ حیرت
تھی۔ روزانہ آدھے سے زائد مریضوں کو بغیر پیسوں کے دوا دے دی جاتی تھی۔

ایک دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ میں ان سے خاص طور پر بہت بے
ہوگیا تھا۔ انہیں خوش و خرم دیکھ کر میں کہہ بیٹھا۔ "حکیم صاحب آپ اس قدر
قوتوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے لئے کچھ نہیں کرتے۔ میرا مطلب ہے اپنے
پر بھی نگاہ کریں۔ انہیں اچھی زندگی دینا بھی آپ کا فرض ہے۔"

میری بات پر وہ پہلے قدرے سنجیدہ ہوگئے۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"میاں میں حتی المقدور محنت کرتا ہوں۔ جو کچھ اپنے طور پر کماتا ہوں بچوں کے
پرد کردیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے اور بحمد اللہ میرے بچے بھی
طمئن ہیں۔ رہا ان عظیم قوتوں کا معاملہ جن کا تم نے ذکر کیا ہے تو میں ان قوتوں کا مالک
ہیں ہوں۔ میں تو معبود حقیقی کا ایک گنہگار بندہ ہوں۔ اس نے جو خدمت میرے سپرد کی
ہے اس کی حفاظت کی کوشش کرتا ہوں اور اس میں سے اس کے حکم کے مطابق ہی خرچ
کرتا ہوں۔ کیا میں امانت میں خیانت کروں؟"

"یہ بچے بھی خدا کی امانت ہیں حکیم صاحب۔ معاف کیجئے آپ نے بے تکلفی کی
جازت دی ہے اس لئے یہ کہنے کی جرأت کررہا ہوں کہ انہیں عمدہ زندگی سے روشناس
کرانا بھی آپ ہی کا فرض ہے۔"

"جو کچھ ان کے لئے کررہا ہوں اس سے زیادہ کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے
بیٹے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے بچے صبر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کے
ل میں کوئی خواہش تشنہ نہیں ہے جبکہ اللہ کے فضل سے میں انہیں دنیا کی ہر شے مہیا
کرسکتا ہوں۔"

"میں مانتا ہوں حکیم صاحب لیکن بنیادی ضرورتیں۔ میرا مطلب ہے۔" میں نے
ہا۔

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تمہاری مراد آسائش کی چیزوں سے ہوگی۔"

"آسائش نہیں ضرورت کہیں۔"

"وہ میرے لئے جائز نہ ہوں گی حالانکہ ان کا حصول میرے لئے مشکل نہیں ہے۔
یکھنا پسند کروگے؟"

انہوں نے شانے پر پڑا ہوا بڑا سا رومال اتارا اور ایک پلنگ پر ڈال دیا۔ پھر چند
پل کے بعد انہوں نے رومال اٹھایا تو میں دنگ رہ گیا۔

رومال کے نیچے ایک تھال موجود تھا جس میں انتہائی نفیس مٹھائی بھری ہوئی تھی۔
ہوں نے مٹھائی میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور پھر اپنے لڑکے کو آواز دی۔

لڑکا اندر آگیا تھا۔ "بیٹے یہ مٹھائی محلے کے بچوں میں تقسیم کردو۔"

"جی ابا جان!" لڑکے نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں مٹھائی کے لئے کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔

وہ تھال لے کر باہر نکل گیا اور چند لمحات کے بعد باہر بچوں کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ واپس آیا اور خالی تھال واپس پلنگ پر رکھ دیا۔ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے تھا دوبارہ انگوچھا ڈال دیا۔ لڑکا خاموشی سے اندر چلا گیا تھا۔

"یہ سب کچھ میرے اوپر فرض ہے بیٹے' اور میں اس میں سے اپنے لئے کچھ ن لے سکتا۔"

میں عقیدت بھری نگاہوں سے حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے پو

"حکیم صاحب! آپ جس دن ہمیں پہلی بار ملے تھے۔ میرا مطلب ہے جس روز آپ ساتھ بس کا حادثہ پیش آیا تھا اس دن آپ کو ہماری پریشانی کا حال معلوم تھا؟"

حکیم صاحب کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر ا نے گردن اٹھا کر کہا۔

"یہ سوال ضروری ہے؟"

"میری خواہش ہے کہ آپ بتائیں۔" میں نے کہا۔

"بہت اصرار کر رہے ہو۔ اللہ گواہ ہے کہ میں تمہیں یہ بات شہرت حاصل ک کے لئے نہیں بتا رہا۔"

"مجھے یقین ہے حکیم صاحب۔" میں نے کہا۔

"وہ حادثہ اسی لئے ہوا تھا کہ میں تم سے متعارف ہو جاؤں۔"

"اوہ تو وہ محض اتفاق نہیں تھا؟"

"نہیں۔" حکیم صاحب سنجیدگی سے بولے۔

"آپ کسی کشمکش کا شکار تھے حکیم صاحب۔"

"ہاں۔"

"اس کی کیا وجہ تھی؟"

"میں چاہتا تھا کہ تم آصف کی بیماری کا تذکرہ کرو تاکہ میں اسے دیکھ لوں۔"

"اوہ مگر آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا۔"

"میں نے کہا نا کہ میں تم پر اپنی جان کاری کا رعب نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن تم موضوع پر ہی نہیں آئے......... مجبوراً مجھے ابتدا کرنی پڑی اور میں نے تم سے تمہارا

علوم کیا......... حالانکہ.........." حکیم صاحب رک گئے۔

"جی......... حالانکہ.........؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"حالانکہ مجھے تمہارا گھر معلوم تھا۔"

"اوہ یقیناً مجھے اعتراف ہے۔"

"بس بیٹے۔ میری حیثیت ایک کوتوال کی سمجھو جسے اپنے علاقے کے تمام افراد کے رے میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب رمز کی باتیں ہیں بیٹے' کیا کرو گے ان کی تفصیل جان ر۔"

"پھر بھی کچھ تو حکیم صاحب۔ مجھے بہت دلچسپی ہے۔"

"کوتوال ان مجرموں کی فہرست بھی رکھتا ہے جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ میری رست کا ایک مجرم غائب تھا۔ میں نے اس کی تلاش کی تو پتہ چلا کہ وہ تم لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔"

"بہت خوب۔ پھر؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"بس مجھے اس کی گرفتاری کا بندوبست کرنا پڑا۔"

میں حکیم صاحب سے متاثر تو تھا ہی ان الفاظ نے مجھے مبہوت کر دیا۔ حکیم صاحب یک خالص دنیاوی انسان تھے لیکن انہیں زبردست روحانی قوتیں حاصل تھیں۔ اگر وہ ارک الدنیا ہوتے تو شاید اتنی حیرت کی بات نہ ہوتی۔

حکیم صاحب چند لمحات خاموش رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ "چائے پیو گے؟"

"تکلف نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں تکلف نہیں ہے۔ ناصر میاں! ارے بھئی یہ وقار میاں آئے ہوئے ہیں۔ پائے نہ پلواؤ گے؟"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر حکیم صاحب کا لڑکا گردن لٹکائے اندر آ گیا۔ "وہ ابا ن......... آج چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے۔"

"اوہ......... اچھا اچھا......... تو پتی لے آؤ بھاگ کر۔" انہوں نے کہا اور پھر ایک م ہنس پڑے۔

"اوہ' معاف کرنا میاں۔ جاؤ پنساری سے کہنا قرض دے دے۔ ایک آدھ دن میں اپس کر دیں گے۔"

"جی ابا جی۔" لڑکے نے کہا اور باہر چلا گیا۔

"بھئی تم سے کیا چھپانا۔ وہ آج کوئی مریض نہیں آیا دکان پر۔ خداوند تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے۔"

میرا دل لرز گیا۔ اتنا عظیم انسان اور یہ کسمپرسی۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ "حکیم صاحب! میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔ مجھ سے غیریت کا برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ میں.........؟"

"ارے نہیں میاں۔ یہ غیریت نہیں ہے۔ محبت ہے تمہاری' پنساری سے ادھار چلتا رہتا ہے۔ واپسی ہو جائے گی۔"

میں دل میں عجیب سے جذبات چھپائے بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب اگر چاہتے تو ان کے سامنے زر و جواہر کے ڈھیر لگ جاتے لیکن ان کا دل دنیاوی طمع سے پاک تھا اور وہ نیک جذبوں کی دولت سے مالا مال تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد چائے آ گئی اور حکیم صاحب نے بڑے محبت بھرے انداز میں مجھے چائے پیش کی۔

چائے پینے کے بعد میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ "حکیم صاحب! میری خواہش ہے کہ میں اپنی اور آپ کی ملاقات کی تفصیل شائع کراؤں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟"

"ارے نہیں میاں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"بس یہ میری آرزو ہے۔"

"میں شہرت کا طلبگار نہیں ہوں۔ بس خاموشی سے سر جھکائے اپنے کاموں میں مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بہت زیادہ اصرار کرتے ہو تو ایک گزارش میری ہے۔"

"جی وہ کیا؟"

"میرا پتہ وغیرہ درج نہ کرنا۔ جن بندگان خدا کے لئے مجھے حکم ہو گا میں خود ان تک پہنچ جاؤں گا۔" میں نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ یہ آپ بیتی میں نے آپ کے گوش گزار کر دی۔ حکیم صاحب حیات ہیں اور حتی المقدور بندگان خدا کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

☆===☆===☆

مُعاوضہ

ایک ذہین مجرم کا قصہ۔ وہ جرم کے بے داغ منصوبے بنانے میں ماہر تھا مگر اس میں جرم کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔
ایک انتہائی دلچسپ کہانی

کہنے کو میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک لمبی سی کار' ایک خوبصور
اس بنگلے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر' ایک آدھ ملازم بھی تھا جس کی تنخواہ بھی مَیں
کہیں سے نکال لیتا تھا........ لیکن یہ سب کچھ خدا کا دیا ہی تھا........ خود ابھی ت
نے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ ساری زندگی اعلیٰ قسم کے جرائم اور ان
عمل کرنے والے ذہنوں کی سوچ کا مطالعہ کرتے ہوئے گزری تھی۔ میں جرائم کرنا
لیکن اعلیٰ پیمانے پر........ چھوٹی موٹی چوری چکاری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی
بیس ہزار کا داؤ بھی کوئی داؤ ہوتا ہے۔ انسان اگر جرم کرے تو کم از کم اس کے
کروڑ پتی نہ سہی تو لکھ پتی تو بن ہی جائے' ورنہ جرم کرنے کا فائدہ؟ اس سے تو
کلرکی بہتر ہے۔

بچپن ہی سے ذہن پر یہ سوچ حاوی تھی کہ شرافت کی زندگی بان کی چارپائی او
کی چھت کے نیچے ہی گزرتی ہے۔ گو والدین کی موت کے بعد ورثے میں کچھ مل گیا
آج تک اسی کچھ پر گزارہ ہو رہا تھا لیکن میں اس کچھ کو بہت کچھ بنانے کا خواہشمند
خدا کے فضل سے ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ میرے بہت سے معتقد تھے یعنی چھ
چھوٹے جرائم پیشہ لوگ جو مجھے مرشد کی حیثیت دیتے تھے۔ کچھ کرنے سے قبل وہ
پاس آتے تھے۔ مشورہ لیتے تھے اور میں نہایت سائنٹفک طریقے سے انہیں کام کے گ
تھا اور میرے بتائے ہوئے گُر ہمیشہ انہیں کامیابی سے روشناس کراتے۔ ان لوگوں
میری ذہانت کے چرچے تھے اور ان میں سے ہر شخص خواہش مند تھا کہ استاد اپنے
اسے کوئی موقع دیں۔ ان کا خیال تھا کہ استاد ہمیشہ اونچے داؤ لگاتے ہیں۔ کوئی نہیں
تھا کہ استاد نے ابھی تک کوئی داؤ نہیں لگایا۔

لیکن کب تک؟ اب تو حالت یہ تھی کہ ملازم کی تنخواہ نکالنا بھی مشکل ہو گئی

در وہ آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔ باورچی خانہ خالی پڑا تھا۔ کھانے
ینے کی اشیاء لانے کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔ مجھے تو اگر ایک آدھ وقت کھانا نہ بھی ملتا
اسی طرح سوجاتا تھا لیکن ملازم تو بھوکا نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اب ضرورت اس بات کی
ھی کہ زیادہ چھان بین نہ کروں اور کوئی کام دکھا ہی دوں۔ اپنی اس ذہانت کو کسی چھوٹے
ٹے کام میں صرف کرتے ہوئے دل تو دکھتا تھا لیکن مجبوری انسان سے بہت کچھ کرا لیتی
ہے۔ چنانچہ کام کی ابتدا کے لئے میں نے بنک آف کناڈا کو منتخب کیا۔ بنک آف کناڈا کی یہ
مارت بنکوں کے مخصوص بلاک سے ہٹ کر تھی اور اس کے قرب وجوار میں رہائشی
مارتیں بنی ہوئی تھیں اور عمارتوں کی وجہ سے ہی میں نے اس بنک کو منتخب کیا تھا۔ سن
نمبر ۱۱ کی عمارت اس بنک کے بالکل نزدیک تھی۔ درمیان میں صرف ایک گلی تھی۔ چنانچہ
ارت کی چوتھی منزل سے کسی لمبے سے تختے کی مدد سے بہ آسانی دوسری عمارت کی
ت پر پہنچا جاسکتا تھا اور چھت پر پہنچ کر نیچے اترنا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا اور نیچے اتر
ر بنک کی تجوری صاف کر دینا اس سے بھی زیادہ آسان تھا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو
انوں کان خبر نہ ہوتی اور بنک صاف ہو جاتا۔ تجوریاں کھولنا مجھ جیسے شخص کے لئے اتنا ہی
سان تھا جتنا اپنے گھر کے دروازے کھول لینا ہوتا ہے۔

میری نگاہوں میں بنک لوٹنا جیب تراشی کے مترادف ہی تھا لیکن عقل کا تقاضا تھا کہ
ب یہ جیب تراشی کر ہی لی جائے' ورنہ بنی بنائی ساکھ بگڑ جائے گی۔ کار میں پٹرول ڈلوانے
ے لئے پیسے بھی نہیں رہیں گے۔ ملازم نوکری چھوڑ کر گیا تو چھتیس گھروں میں بتائے گا کہ
احب کے باورچی خانے میں تو دودھ کی بوتل بھی نہیں ہے۔ چنانچہ وقتی طور پر کچھ کر لینا
بہتر تھا۔ البتہ یہ کام تنہا نہیں کیا جاسکتا تھا حالانکہ میری اولین خواہش تھی کہ جو کچھ
وں تنہا کروں لیکن اب تو بات مجبوری کی تھی لیکن اپنے ساتھ شریک کرنے کے لئے
ی کا انتخاب کروں۔ کئی نام ذہن میں گونجے اور پھر ذہن کی سُوئی فینٹم کے نام پر رکی۔
م میرا بے دام غلام تھا۔ گریٹ ریس میں' میں نے ایک یقینی جیتنے والے گھوڑے کو
انے کے لئے ایک نہایت زبردست گُر بتایا تھا جسے فینٹم نے نہایت ہوشیاری سے
عمال کیا تھا اور دوسرے نمبر کا گھوڑا خود فینٹم کا تھا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف اپنے لئے
اپنی سیلز گرل محبوبہ کے لئے بھی ایک عمدہ فلیٹ خرید لیا تھا اور اچھی زندگی گزار دی

تھی۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو کچھ کرنے سے قبل میری زیارت کر لینا پسند ک
ہیں۔ چنانچہ میں نے آخری فیصلہ کرنے کے بعد فنیٹم کو فون کیا اور اس سے رابط
ہونے پر اسے طلب کر لیا۔ فنیٹم تھوڑی سی دیر کے بعد میرے حضور پہنچ گیا۔

"کیا کر رہے ہو آج کل؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جناب! بیکاری کا وقت گزار رہا ہوں۔" فنیٹم نے جواب دیا۔

"جو یقیناً اپنی محبوبہ کینڈی گراہم کے ساتھ ساحل سمندر پر یا ہوٹلوں اور
کلبوں میں گزر رہا ہوگا!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور فنیٹم انکساری سے ہنسنے لگا۔

"وہ عورت اب لالچی ہو گئی ہے۔ نت نئی فرمائشوں نے مجھے اس سے بد دل
ہے اس لئے میں اس سے کنارہ کشی کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ یوں بھی سال م
از کم ایک محبوبہ تو بدلنی چاہئے جب کہ میں اسے تین سال سے برداشت کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تک چل سکتا ہے چلاؤ.......... میں نے تمہیں ایک خاص
سے بلایا ہے۔" میں نے بات کا رخ بدل جانے کے بعد اصل گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں حاضر ہوں جناب فرمائیے!"

"میں کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور اس کے لئے میں نے بنک
کناڈا کا انتخاب کیا ہے۔ آج سے ٹھیک تیسرے دن بعد ہم اس بنک کو خالی کر دیں
میرے پاس پلان مکمل ہے اور میں اس سلسلہ میں تمہارا تعاون چاہتا ہوں۔"

میرے اندازے کے مطابق فنیٹم خوشی سے پھولے نہ سمایا اس نے کئی بار خو
ظاہر کی تھی کہ میں اسے کوئی موقع دوں اور آج میں نے خود اسے پیش کش کر دی
اس نے بے تحاشا خوشی کا اظہار کیا اور پھر میری ہدایت کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے اسے مختصراً تفصیل بتائی اور وہ غور سے سنتا رہا۔ پھر میرے خاموش ہ
کے بعد مسرور لہجے میں بولا۔ "واہ! کتنا سادہ لیکن کتنا جامع پروگرام ہے۔ کوئی انداز
نہیں لگا سکتا کہ بینک لوٹنے والے کہاں سے اندر داخل ہوئے اور کس طرح تج
صاف کر گئے۔"

"بہرحال تم خود کو تیار رکھو بلکہ بہتر ہے ایک دو بار وہاں جا کر اس پروگرام کا
بھی لے لو تاکہ وقت مقررہ پر کوئی دقت نہ ہو۔"

"بہت بہتر جناب! ویسے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں سے ہمیں کتنا کیش مل سکے
گا؟" فنیٹم نے نہایت چالاکی سے ایک کاروباری سوال کر لیا جسے مجھ جیسا کاروباری آدمی نہ
سمجھتا تو اور کون سمجھ سکتا تھا!

"اتنا کہ اس کا پچیس فیصد تم اپنے کمیشن کے طور پر وصول کرنے کے بعد اپنی کم از
کم تین محبوباؤں کے نخرے ایک سال تک اٹھا سکتے ہو۔" میں نے اسے باتوں ہی باتوں میں
اس کے معاوضے کی شرح بھی بتا دی اور اس نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔

مقررہ رات ابر آلود اور خاموش خاموش سی تھی۔ فنیٹم سرشام ہی رنگ ساز کی
حیثیت سے بلڈنگ کی چوتھی منزل پر رنگوں کے کچھ ڈبے اور ایک لمبا تختہ رکھ آیا تھا۔
اس نے اس منزل کے مکینوں کو بتایا تھا کہ بلڈنگ کے مالک کی طرف سے اسے باہر کی
گیلریوں میں رنگ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور وہ دوسرے دن سے اپنے کام کا
آغاز کرے گا..........! رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے میں اور فنیٹم ضروری چیزوں سے
لیس ہو کر اپنی کار میں چل پڑے۔ کار کو پارک کرنے کے لئے میں نے جگہ کا بھی انتخاب
کر لیا تھا۔ تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر ہمیں کار چھوڑنی تھی اور بقیہ راستہ پیدل طے
کرنا تھا۔ چنانچہ بارہ بجے ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے۔ میں نے احتیاط سے چاروں طرف
دیکھا اور پھر کار کا انجن بند کر کے اسے لاک کر دیا۔

تاریک اور خاموش رات میں ہم دونوں دیواروں کے سائے سائے اس عمارت کی
جانب چل پڑے۔ ہم دونوں ہی اپنے کام کے لئے مستعد اور ہوشیار تھے اور اسے بخوبی
انجام دینے کا تہیہ کر چکے تھے۔ دلکش عمارت کے زینے سے گزرتے ہوئے ہم بالآخر چوتھی
منزل پر پہنچ گئے۔ فنیٹم کسی قدر بھاری بدن کا مالک تھا۔ اس لئے چوتھی منزل پر پہنچ کر
ہانپنے لگا' تاہم اس نے جلد ہی اپنی سانسوں پر قابو پا لیا۔ میں نے اس راہداری کا ایک چکر
لیا۔ تمام دروازے بند تھے۔ تب میں نے فنیٹم کو اشارہ کیا اور فنیٹم نے رنگ کے ڈبوں
کے نزدیک پڑا ہوا مضبوط تختہ اٹھا لیا۔ پھر اس نے نہایت مہارت سے وہ وزنی تختہ گلی کے
دوسرے کنارے تک پہنچانا شروع کر دیا۔ پروگرام کے مطابق فنیٹم کو یہیں رک کر اس
تختے کی اور قرب وجوار کی نگرانی کرنی تھی۔

تختے کا دوسرا سرا بنک کی عمارت کی چھت پر پہنچتا جا رہا تھا۔ میں نے فنیٹم سے پوچھا

کہ وزنی تختے کو دوسرے سرے تک پہنچانے کے لئے اسے میری مدد تو درکار نہ
لیکن اس نے ہنس کر کے کہا کہ یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں ہے لیکن یہ مشکل
مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی فلیٹ میں ایک انتہائی دلدوز چیخ گونجی اور میں اور
فٹ اونچے اچھل گئے۔ تختے پر قابو رکھنا بے شک مشکل تھا۔ میں اس سلسلے میں
کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا۔ چونکہ وہ آخری سرے تک پہنچنے والا تھا اور اس وزن
کا مکمل وزن دوسری طرف تھا اس لئے اطمینان سے فنیم کے ہاتھ سے تختہ چھوٹا
خوفناک دھماکے کے ساتھ چوتھی منزل سے نیچے جاپڑا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے
والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور دو عورتیں اور دو مرد آگ آگ چیختے ہوئے باہر نکل
انہوں نے ہماری طرف توجہ بھی نہیں دی تھی ورنہ ہم آسانی سے دھر لئے جاتے۔

آگ واقعی شدید لگی تھی۔ ایک فلیٹ سے شروع ہوئی تھی لیکن دیکھتے ہی
اس نے دوسرے فلیٹوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور لوگ دھڑا دھڑ عمارت سے با
لگے۔ ہمارے پاس بھی اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ خود بھی آگ آگ چیختے ہو
اتر آئیں۔ ہاں آگ کی تباہ کاریاں دیکھنے کے لئے یہاں رکنا حماقت تھی۔ چنانچہ ہم
قدموں سے اپنی کار کی طرف چل پڑے۔

"بڑی خیریت ہوگئی استاد! اگر تم بنک کی عمارت میں داخل ہو چکے ہوتے
کے بعد یہ ہنگامہ ہوتا تو........" راستے میں فنیم نے کہا........ لیکن میں نے اس
کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کار ڈرائیونگ کرتا ہوا اپنے بنگلے تک

"ٹھیک ہے فنیم! اب تم جاؤ........ میں کوئی دوسرا پروگرام بنا کر تمہیں اطلاع دوں
میں نے کہا اور فنیم مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا لیکن اپنی اس ناکامی سے مجھے شدید جھ
ہوئی تھی۔ میں نے جن لوگوں کو گر بتائے تھے وہ تو عیش کر رہے تھے لیکن میں نے
اپنے معیار سے گر کر ایک کوشش کی تھی تو حالات نے اسے ناکام بنا دیا تھا........
نہیں تھا' انتہائی کامیاب پروگرام تھا لیکن آگ بھی ضرور لگنی تھی۔

بہرحال میرے حالات کچھ اور خراب ہوگئے۔ اب تو یہ ممکن نہیں تھا کہ
گھر میں گھس کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ حالات سنبھالے نہ سنبھلنے
روز بنی پال زیادہ نہ پی جاتا۔ سخت نشے کے عالم میں وہ میرے پاس آیا اور

اظہار کرتے ہوئے نوٹوں کی چند گڈیاں میرے قدموں میں رکھ دیں۔ "تمہارا نام لے کر
ایک گھوڑا کھیل لیا تھا استاد! وارے نیارے ہوگئے۔ ورنہ بالکل قلاش تھا۔ یہ تمہاری نذر
ہے۔ دیکھو انکار مت کرنا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا!" اور میں نے نشے میں ڈوبے ہوئے
اس انسان کا دل نہ توڑا اور وہ نذرانہ قبول کرلیا۔ یہ نذرانہ اس وقت میرے لئے بہت
بڑی تھی۔ حالات نے ذہن منتشر کر رکھا تھا۔ اب کم از کم دلجمعی سے کوئی پروگرام تو
بنا سکوں گا۔ صورت حال واقعی بے حد خراب ہوگئی تھی۔

بہرحال بنی پال کا ہوش میں آنے کے بعد کیا حال ہوا' مجھے اس بارے میں کچھ
معلوم نہیں........ لیکن میں نے اب سنجیدگی سے کسی اقدام کے بارے میں سوچنا شروع
کردیا تھا اور وقتی سہارے کے لئے میں نے اس اتفاق کا سہارا لیا جو ساحل سمندر کے ایک
سنسان گوشے میں پیش آیا تھا۔

مسٹر وکٹر ہال مین شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود چونکہ موٹروں کی ایک
بڑی کمپنی کے مالک تھے اس لئے ایک صنعت کار کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام رکھتے
تھے۔ اب اگر وکٹر مین جیسا باعزت شخص اپنی گنجائش سے زیادہ شراب پی جائے اور اپنی
ہٹ سے مادر زاد برہنہ نکل آئے اور چند لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرکے ان کے ہاتھوں مار
کھائے اور میرے پاس مووی کیمرہ ہو تو پھر کون بے وقوف اس دلچسپ واقعے کی فلم
بنانے سے گریز کرے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ فلم بنانے والا مجھ جیسا آدمی ہو! جو اونچے
شکار کے تصور میں فاقوں تک پہنچ جائے اور کسی گھٹیا شکار پر ہاتھ نہ ڈالے لیکن مسٹر وکٹر
ہال مین گھٹیا شکار تو نہیں تھے........ اس ارب پتی تاجر کے لئے دس بیس لاکھ ڈالر کی
ادائگی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ میں نے اس کو فلم بھجوادی اور ٹیلیفون پر بیس لاکھ ڈالر کا
مطالبہ بھی کردیا۔ اگر یہ رقم مجھے مل جاتی تو میں یقینی طور پر ایک آخری داؤ کے لئے
پلاننگ کرتا اور پھر اس پر عمل کر ہی ڈالتا۔ وکٹر ہال مین نے پہلے تو سیدھے منہ سے بات
بھی نہیں کی لیکن جب میں نے اس پارسل کا اظہار کیا جو آج ہی دوپہر کی ڈاک سے اس
کے پاس پہنچا ہوگا تو وہ کسی قدر سنجیدہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ
پارسل میں موجود فلم کو وہ بغور دیکھے اور سوچے کہ اگر اس کے فوٹوگراف شہر کے متعدد
بکسٹالوں پر نظر آئیں۔ اس کے بعد فلم بھی چند ڈالر میں ہر کس وناکس کو دستیاب

ہو جائے تو کیسی رہے۔ ہاں.......... یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کسی ایسی فلم کی پبلسٹی
میں نہ ہو۔ اگر مسٹرہال کو میری اس بکواس سے دلچسپی نہ ہو تو وہ اپنے گھر پر
کسی بھی وقت میرے فون کا انتظار کریں۔

اس کارروائی کے چوبیس گھنٹے کے بعد میں نے مسٹرہال کو فون کیا تو ان کی آ
کمزور تھی۔ "میں شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔"

"آپ نے فلم دیکھ لی ہو گی مسٹرہال!"

"میاں! خدا کے واسطے.......... خدا کے واسطے.......... مجھے اس
نیگیٹو.......... ساری فلموں کے ساتھ واپس کر دو۔ تم جو مانگو گے ادا کر دوں گا لیکن
ایک بھی کاپی تمہارے پاس نہ رہے اور میرے خاندان کے کسی بھی فرد کو اس کے
میں کچھ نہ معلوم ہو۔" مسٹرہال کی پہلے کی اور اب کی آواز میں بڑا فرق تھا۔ مجھے
کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔

"میں ایمانداری سے سودے کرتا ہوں مسٹرہال! صرف بیس لاکھ ڈالر جو
پہلے آپ سے طلب کئے تھے۔ آپ کی بدحواسی دیکھ کر بلکہ محسوس کر کے بھی
نہیں بڑھا رہا لیکن کسی فریب کے بغیر یہ رقم مجھے مل جانی چاہئے۔ ورنہ..........
آپ نے میرے ساتھ کوئی فریب کیا تو کل کے اخبارات میں اس کی پبلسٹی ہو گی
کے ساتھ ہی فوٹو گراف.........."

"اوہ.......... نہیں.......... نہیں.......... ایسا مت کہو.......... میں..........
مسٹرہال کی آواز ڈوبنے لگی اور پھر ریسیور گرنے کی آواز سنائی دی اور میں ہیلو ہیلو
گیا.......... میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہوا۔ اس وقت تو میں نے فون بند کر
میری بے چینی عروج پر تھی۔ ایک خوفناک خیال میرے ذہن پر ضربیں لگا رہا تھا
ایک گھنٹے کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا اور چند ساعت کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا

"مجھے مسٹرہال سے گفتگو کرنی ہے!" دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز
میں نے کہا۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"ان کا ایک دوست.......... آپ براہ کرم.........." میں نے کہنا چاہا لیکن

نے درمیان سے میری بات کاٹ دی۔

"اگر آپ ان کے دوست بول رہے ہیں تو بڑے غم کے ساتھ آپ کو اطلاع دی
جاتی ہے کہ ایک گھنٹہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ فون پر کسی سے گفتگو کر رہے تھے کہ ان
دل کا دورہ پڑا.......... اور.........." عورت کی چند سسکیاں سنائی دیں اور پھر وہ
لی.......... "اب آپ ان کی تدفین کے لئے تشریف لے آئیے..........!"

تدفین تو میری ہونی چاہئے تھی۔ اس غم کو تو میں آسانی سے نہیں بھول سکتا تھا۔
سٹرہال مجھے بیس لاکھ ڈالر ادا کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ اب ان کے بعد اس فلم سے کس
کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ممکن تھا ان کے اہلِ خاندان میں کوئی نہیں جانتا لیکن مسٹرہال کے
چانک ہارٹ فیلیور کی تحقیقات کرنیوالے پولیس افسر کو وہ فلم بھی دستیاب ہو گئی..........
ھٹی ہوئی..........

کئی دن تک میں غم کا شکار رہا۔ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے
جرم سے روکنا چاہتی ہو اور میں ساری زندگی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔
یرے دوست احباب مجھ سے ملاقات کرنے آتے اور اس کا سبب پوچھتے لیکن کسی کو کیا
تاتا.......... معتقدین اپنے مسائل اور منصوبے لے کر آتے اور صرف بات نبھانے کے
لئے میں انہیں کوئی نہ کوئی مشورہ دے دیتا۔ جب وہ مجھے میرے مشورے کے تحت اپنی
کامیابی کی داستان سناتے تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ کئی بار تو سوچا کہ کسی بڑے شکار کا خیال
چھوڑ کر ان لوگوں کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے دھندے شروع کر دوں لیکن دل نہیں
انتا تھا۔ یہ سوچا کہ صرف مشوروں کا کاروبار کر لوں لیکن اب چھوٹے لوگوں سے کچھ مانگنا
عزت جاتی تھی۔

بہرحال ایک دو تین، چھ، سات کوششیں کی تھیں، پھر خودکشی تک نوبت پہنچ گئی۔
ساری پلاننگ کامیاب ہوتی لیکن کوئی ایسی ناگہانی پڑتی کہ آخری مرحلہ رہ جاتا.......... اگر
پلاکی سے اپنے معتقدین سے کچھ نہ کچھ کھینچتا نہ رہتا تو ساری ساکھ خاک میں مل جاتی۔
زت بچانا مشکل ہو جاتا۔ ان مسلسل ناکامیوں نے میرے ذہن میں خوف پیدا کر دیا تھا۔
جرائم کی پلاننگ کرنے میں میرا ثانی نہیں تھا۔ کسی سلسلہ میں ناکامی ہونے کے بعد بار بار
ور کیا تھا کہ اس ناکامی کے اسباب کیا ہیں لیکن میرے پروگرام میں کوئی رخنہ نہیں ہوتا تھا

سوائے اس کے کہ کوئی بالکل غیر متوقع واقعہ رُونما ہوا اور اس کا اثر براہ راست
پروگرام پر پڑا۔

پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ شہر اور ملک تاریکی میں ڈوب گئے۔ یہ
چوری چکاری یا اچکا گیری کرنے والوں کے لئے تو سود مند ثابت ہوسکتی تھی مگر
کس کام کی۔ شہر کی رونقیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ بس خوف وہراس کی ایک فضا تھی
طرف نظر آتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ خود کالے
کرنے والوں پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ سارے دھندے ختم ہوکر رہ گئے تھے اور عج
کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس کیفیت کا اظہار ایک بار فینٹم نے بھی کیا تھا۔ "بڑی گھٹ
ہوگئی ہے استاد! سارے کاروبار چوپٹ ہوکر رہ گئے ہیں۔ سب کی زبان پر ایک ہی
ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

"ہاں! میں محسوس کررہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے استاد! ورنہ......... ورنہ ہم جیسے لوگوں
زندگی محال ہوجائے گی۔ لاکھوں کماتے ہیں لیکن جرائم کی کمائی اس لئے اپنے پاس
رکھتے کہ نقصان نہ پہنچائے اور جلد از جلد اسے نکال دیتے ہیں اور قلاش کے قلاش
ہیں!"

"ہوں!" میں نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ موجودہ حالات خود میرے
اتنے ہی خوفناک تھے۔ میں تو ان لوگوں سے بھی زیادہ کسمپرسی کا شکار تھا۔ یہ لوگ
بھرنے کے لئے ہر کام کرسکتے تھے' لیکن میں ابھی تک خود کو چوتھے درجے کا انسان
کے لئے تیار نہیں تھا......... میں تو اب تک یہی سمجھتا آرہا تھا کہ صرف ایک داؤ
گا' صرف ایک داؤ......... اور اس کے بعد کسی دوسرے جرم کی ضرورت ہی
جائے گی اور وہ داؤ......... میری بہترین صلاحیتوں کا مظہر ہوگا۔ میرے ذہن میں
شائبہ بھی نہیں تھا۔ کام اگر ایسا ہو کہ میری دیرینہ خواہشات کی تکمیل ہوجائے تو
وغارت گری سے بھی دریغ نہیں کرتا لیکن زندگیاں لی جائیں تو ان کا نعم البدل
بھرپور ہو۔ فینٹم سے میں نے وعدہ کیا کہ میں ضرور کوئی عمدہ پروگرام ترتیب دوں گا
اور اس کے بعد میں نے زیادہ شد ومد سے اپنے کام پر غور کرنا شروع کیا.......

الات میں......... ان موجودہ حالات میں کیا کام ممکن ہوسکتا ہے......... ان دنوں یہی
خل تھا۔ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا تھا اور تخمینے لگاتا رہتا تھا......... کوئی کاروبار.........
وئی ایسا پلان جو اس جنگ سے تعلق رکھتا ہو......... اندازہ لگایا جائے کہ حکومت کے
ائی اجناس کے ذخیروں میں کون سی چیز کی کمی ہے۔ کسی......... گمنام حیثیت سے
ومت سے سودا کیا جائے اور کوئی ایسی ترکیب کہ حکومت سے کوئی بڑی رقم حاصل
سکے لیکن وہ ترکیب کیا ہو؟ وہ ترکیب کیا ہونی چاہئے۔ یہ بات ابھی ذہن میں اٹکی ہوئی
تھی۔

تاریک راتوں میں اکثر باہر نکل جاتا تھا۔ بمباری شروع ہوچکی تھی اور اکثر شہر کی
ضاؤں میں سائرن کی آوازیں گونجتیں' بمباری ہوتی' اینٹی کرافٹ گنیں سرخ نقطے آسمان
ی طرف اچھالتیں اور آتشبازی کا منظر نظر آتا۔ ہر شخص بے چینی کا شکار تھا۔ اہم فوجی
مقامات پر پہرے لگے ہوئے تھے اور اس طرف گذر مشکل تھا۔ اس وقت بھی کار لے کر
آوارہ گردی کرنے نکل گیا تھا۔ سچی بات ہے بالکل قلاش تھا اور اپنی فطرت کے برعکس
سوچا تھا کہ کہیں سے کچھ رقم حاصل کروں گا۔ اب تو ایلن شائے کے جوئے خانے بھی غیر
آباد ہوگئے تھے اور وہاں اکا دکا ٹھرکی ہی نظر آتے تھے۔ جن کی جیبوں میں کچھ نہ ہوگا۔ کار
اس وقت ایلن شائے کے ایک جوئے خانے کے قریب ہی کھڑی تھی کہ اچانک کسی طرف
سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

تاریکی میں کسی سمت کا اندازہ تو نہیں لگا سکا لیکن فائرنگ شدید تھی۔ میں نے سوچا
یہاں سے ہٹ جانا بہتر ہے۔ نہ جانے کیا قصہ ہے......... کوئی گولی بھٹک کر اس طرف بھی
آسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے کار اسٹارٹ کردی اور پھر چند گز آگے ہی بڑھا تھا کہ کسی نے
کار کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک تھا

"براہ کرم دروازہ کھول دو۔ میری مدد کرو۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔ اگر تم
نے میری مدد نہیں کی تو میں ماری جاؤں گی!" آواز نسوانی اور التجا بھری تھی۔ نسوانی آواز
مدد کی درخواست کرے تو عموماً انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ مدد کی
درخواست کرنے والا اس کا مستحق ہے یا نہیں اور اس معاملے میں اس وقت میں بھی عام
انسانوں سے مختلف نہ رہا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے ذرا مختلف انداز میں سوچا تھا۔

میں نے سوچا کہ جس کی زندگی خطرے میں ہے ممکن ہے اس کا تعلق بھی اپنے
کے کسی شعبے سے ہو۔ بہرحال میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ تڑپ کے اندر گھس
جونہی اس نے دروازہ بند کیا' میں نے کار آگے بڑھادی۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں
پھاڑ کر کار کی پچھلی طرف دیکھنے کی کوشش کی.......... عقب نما آئینے کا رخ بھی
لیکن ایک ہیولے کے علاوہ اور کیا نظر آسکتا تھا۔ بہرحال میں اسے اس علاقے سے نکال
لے آیا۔ اس دوران میں' میں نے اس کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں بھی سنی تھیں۔
میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا تم زخمی ہو؟"

"ہاں! میری ران میں گولی لگی ہے۔"

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" میں نے سوال کیا اور دوسری طرف سے فوراً کوئی جواب
نہیں آیا لیکن جب میں نے دوبارہ یہی سوال دہرایا تو ہچکچائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس بورڈنگ ہاؤس کے سوا میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور اس شہر میں اجنبی بھی ہوں
اگر زخمی نہ ہوتی تو کہیں بھی اتر جاتی لیکن اس حالت میں' مجھے تمہاری مدد کی ضرورت
ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"

"کیوں نہیں' یوں بھی میں اپنے مکان میں تنہا رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہ! بہت بہت شکریہ!!" اس نے جواب دیا اور میں دل ہی دل میں مسکرانے
میں نے سوچا۔ خاتون! یہ لفظ شکریہ تو بے وقوف بنانے کے کام آتا ہے۔ بہت جلد آپ
معلوم ہوجائے گا کہ صرف شکریہ سے کام نہیں چلتا اور بھی بہت کچھ ہے اس
علاوہ.......... بہرحال ان احساسات کا اظہار تو نہیں کرسکتا تھا اس لئے خاموش رہا اور
اپنے بنگلے میں پہنچ گیا جس سے اب مجھے چڑ ہوتی جارہی تھی۔ اس چہار دیواری میں
ساکھ کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ نہ جانے یہ ساکھ بھی کب تک تھی..........!

بہرحال کار کھڑی کرنے کے بعد میں نے عقبی دروازہ کھول کر اس خاتون کو اترنے
کی درخواست کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ دوسری آواز کے بعد میں نے اسے
اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔ تعجب کی بات نہیں تھی۔ اس
کہا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ چنانچہ میں نے جھک کر اس کے بدن کو سنبھالا اور باہر نکال لیا۔

ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوگیا۔ بلیک آؤٹ کے ماحول میں ایسی روشنیاں بند
کردی گئی تھیں جو باہر سے نظر آسکیں لیکن اندرونی کمروں میں روشنی تھی۔ میں اسے اپنی
خواب گاہ میں لے آیا اور پھر روشنی میں' میں نے اسے دیکھا اور دیکھ کر کافی خوش ہوا۔
سادہ سی شکل کی ایک لڑکا نما لڑکی تھی۔ بال چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی مانند تراشے
ہوئے تھے جسمانی نقوش یا تو کمسنی کے غماز تھے یا پھر بدن کی ساخت ہی ایسی تھی کہ اسے
بھرپور لڑکی یا عورت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گھٹنوں سے اونچی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور
چیک کا مردانہ تراش کا بلاؤز.......... تیزی سے بہنے والے خون کی وجہ سے ایک پاؤں
سرخ تھا دوسرا سفید.......... جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اس خون نے میرا
لباس بھی کافی خراب کردیا تھا لیکن اتنا خون دیکھ کر مجھے تشویش ہوگئی۔ لڑکی سے گفتگو کے
دوران میں نے اس کی آواز میں کمزوری نہیں محسوس کی تھی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا
تھا کہ اگر خون اسی تیزی سے بہتا رہا تو تھوڑی دیر میں اس کے بدن سے خون کا ایک ایک
قطرہ خارج ہوجائے گا چنانچہ میں اسے بیڈ پر لٹا کر تیزی سے ایک الماری کی طرف بڑھا اور
اسے کھول کر فرسٹ ایڈ بکس نکال لیا اور پھر میں اس کے خون کو بند کرنے کی ترکیبیں
کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد اس میں کامیاب ہوگیا۔ گولی کے زخم کو میں نے دیکھ لیا
تھا۔ اس نے ہڈی نہیں توڑی تھی بلکہ ران کے گوشت میں آرپار سوراخ کردیا تھا لیکن
اس دوران اتنا خون بہہ چکا تھا کہ لڑکی کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ ایک لمحے کے
لئے میں نے سوچا کہ کوئی مصیبت ہی نہ پڑ جائے۔ اگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے
اس کی موت واقع ہوگئی تو خواہ مخواہ میں بھی الجھن میں پھنس سکتا ہوں۔

لڑکی نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ میں اپنے طور پر اسے ہوش میں لانے کی
ترکیبیں کرتا رہا۔ گولی کا زخم چونکہ ایسی جگہ تھا جہاں تک میرا پہنچنا مناسب نہیں تھا لیکن
مجبوری.......... میرے سوا اور کون تھا جو اس وقت اسے سنبھالتا۔ چنانچہ میں نے اخلاقیات
کو لپیٹ کر رکھ دیا تھا اور پھر میں نے ہر ممکن کوشش کرڈالی۔ میری کوشش کے نتیجے میں
آخر کار لڑکی ہوش میں آگئی۔

ہوش میں آنے کے بعد کے لئے میں نے انتظامات کررکھے تھے۔ چنانچہ اسے ایک
مقوی مشروب میں برانڈی ملا کر پلانے سے اس کی حالت کسی حد تک بحال ہوئی۔ حواس

تو اس کے اس وقت بھی خراب نہیں تھے جب وہ میری کار میں آئی تھی۔ اس وق
وہ مجھے دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"میری ران میں گولی لگی تھی۔ کیا تم نے دیکھا؟"

"ہاں! ہڈی محفوظ ہے لیکن تمہارے بدن سے خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ اگر تم
مجھے اپنے زخم کے بارے میں بتا دیتیں تو میں تمہارا خون روکنے کی کوشش کرتا!"

"موقع نہیں تھا۔ مجھے تو اب بھی ان خطرناک لوگوں سے خطرہ ہے۔ اگر
تمہاری کار کا نمبر ان کی نگاہ میں آگیا ہے تو وہ تم تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" ا
نے رک کر میرے چہرے پر خوف کے آثار تلاش کئے۔ پھر مطمئن ہو کر بولی۔ "
تمہیں حفاظتی انتظامات کر لینے چاہئیں۔"

"کون لوگ ہیں وہ اور تمہارے دشمن کیوں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"افسوس میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتی۔ البتہ مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔
اپنے آپ کو بہت مضمحل پاتی ہوں۔ شاید خون ضرورت سے زیادہ ہی بہہ گیا ہے۔ م
اعضا میں سنسناہٹ ہو رہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں دوبارہ بے
ہو جاؤں......... اگر تم اپنی شرائط پر......... میری بات کا برا مت ماننا۔ اگر اخلاقی طو
ورنہ کاروباری طور پر میری مدد کرو......... اگر تم مجھے بحفاظت آک کرین کے فلی
بیس میں مسٹر شائیس کے پاس پہنچا دو تو میں تمہیں اس کا معاوضہ پانچ ہزار ڈالر تک
سکتی ہوں۔ دوسری صورت میں اگر تم کوئی صاحب حیثیت انسان ہو تو صرف اخلاقی طو
میری مدد کرو!" لڑکی نے التجا بھری آواز میں کہا۔

"پانچ ہزار ڈالر۔" میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اس پُر آشوب دور میں اور ا
وقت جب کہ میری مالی حالت بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ اگر یہ رقم ہاتھ آجائے تو احتیاط
ساتھ خرچ کرنے سے کافی وقت گزر سکتا ہے۔ لڑکی نے اپنے بارے میں تفصیل نہیں
تو میرے اوپر بھی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ تھوڑی دیر کی طوطا چشمی ہی بہتر
بہرحال ذرا سی حجت ہی سہی۔ "لیکن میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں!" میں
کہا۔

"دیر نہ کرو شریف آدمی! ممکن ہے میں جانبر نہ ہو سکوں۔ اس سے پہلے

ساتھی کے پاس پہنچا دو اور پانچ ہزار ڈالر کماؤ۔"

"میں تیار ہوں!" میں نے کہا اور وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ "تب جلدی کرو......... میرا پورا بدن......... آہ میرا پورا بدن بے جان ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے کرب ناک آواز میں کہا اور میں بادل نخواستہ تیار ہو گیا۔ ایک بار پھر میں اسے بازوؤں میں سنبھال کر اپنی کار تک لایا اور پھر احتیاط کے ساتھ اسے عقبی سیٹ پر بٹھا دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے کار کا ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی لیکن گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ایک پستول ساتھ لے لیا تھا۔ آک کرین کا علاقہ رہائشی علاقہ تھا اور اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں میرا علاقہ تھا۔ چنانچہ برق رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا میں اس علاقے کی جانب چل پڑا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے ساتھی کا.........؟" میں نے راستے میں یہ جاننے کی غرض سے لڑکی سے سوال کیا کہ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہو گئی جب کہ اس کے ساتھی کا نام مجھے یاد تھا۔

"شائیس!" لڑکی نے جواب دیا۔

"تمہارے بارے میں بتاتے ہوئے میں اس سے کیا کہوں؟"

"اوہ' میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی!"

"فلیٹ کون سی منزل پر ہے؟"

"پہلی منزل پر۔" اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب ٹھیک ہے۔ کسی عمارت کی پہلی منزل پر لفٹ کے بغیر بھی اس نازک سی لڑکی کو سہارا دے کر لے جانا مشکل نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا اور چند ساعت کے بعد میں آک کرین کے علاقے میں پہنچ گیا۔ لڑکی نے بلڈنگ کی جانب میری رہنمائی کی اور بالآخر ہم منزل پر پہنچ گئے۔ میں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا اور میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ عمارت کل چار منزلہ تھی اور اس میں لفٹ نہیں تھی۔ کشادہ سیڑھیوں سے گزر کر ہم پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ لڑکی غیر معمولی قوت ارادی سے کام لے رہی ہے۔ ورنہ اس کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سہارا دے کر دوسرے ہاتھ سے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند ساعت خاموشی رہی اور پھر دروازہ کھلا لیکن اس کے ساتھ ہی دو آدمی ہم دونوں پر ٹوٹ پڑے اور ہمیں اندر کھینچ لیا گیا۔ اتنی قوت سے کھینچا گیا تھا کہ میں

اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکی میرے نیچے دبی ہوئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں اٹھ
ہوا لیکن سامنے موجود آدمیوں کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔ دونوں ہی بڑے
سے سفاک نظر آرہے تھے۔ دروازہ دوبارہ بند ہوگیا اور ان میں سے ایک غرائی ہوئی آ[واز]
میں بولا۔ ”حلق سے آواز نکلی تو حلق میں گولی اتار دی جائے گی۔ خاموشی سے اٹھو
اندر چلو۔ چلو تم اسے اٹھاؤ۔“ اس نے پستول سے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے [کہا]
غصہ تو بہت آیا تھا لیکن صورتِ حال ہی ایسی تھی۔ میں نے جھک کر لڑکی کو س[یدھا]
کیا۔ اس بدنصیب کا زخم گرنے سے پھر کھل گیا تھا اور خون بڑی تیزی سے پھر بہنے لگا
تاہم ان درندہ صفت انسانوں کے سامنے ایک نہ چل سکی اور میں نے لڑکی کو سہارا دے
کر اٹھایا اور ان کے کہنے کے مطابق اندرونی کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں رو[شنی]
تھی اور اس روشنی میں ایک قوی ہیکل شخص اوندھا پڑا نظر آرہا تھا۔ اس کی گردن [میں]
ایک رسی کسی ہوئی تھی۔ لڑکی نے ڈوبتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے حلق [سے]
ایک کربناک چیخ نکل گئی۔ ”آہ شائیس!“ اس کے بعد وہ زمین پر آرہی۔ میں اسے چھوڑ [کر]
کھڑا ہوگیا۔

”تم کون ہو؟“ دونوں میں سے ایک شخص نے پوچھا۔ زبان انگلش تھی لیکن لہ[جہ]
بے ترتیب...... شکل وصورت سے بھی وہ جرمن معلوم ہورہے تھے!

”ایک اجنبی! یہ لڑکی اتفاقیہ طور پر مجھے مل گئی تھی۔ میری کار میں آگھسی تھی اور پھر
اس نے استدعا کی کہ میں کچھ لوگوں سے اس کی زندگی بچاؤں۔ جب یہ میرے گھر [آئی]
تب مجھے احساس ہوا کہ وہ زخمی ہے۔ پھر اس کی خواہش پر میں اسے یہاں لے آیا۔ [میں]
اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”ہوں...... چلو اسے برہنہ کردو۔“ ان میں سے ایک نے حکم دیا۔

”مگر کیا مطلب؟“

”جلدی کرو۔ یہ پستول بے آواز ہے۔ اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔“ وہ کرخت
لہجے میں بولا اور میں مجبوراً جھک گیا لیکن ان لوگوں کے طرزِ گفتگو سے میں بری طرح [جھلا]
گیا تھا اور تاک میں تھا کہ موقع ملتے ہی میں ان سے بدلہ لوں گا۔ لڑکی کو لباس سے
نیاز کرنے کے بعد میں نے ان کی طرف دیکھا۔

”لاؤ...... اس کا لباس ادھر دے دو۔ شیک تم لباس کی تلاشی لو، میں اس کا بدن
دیکھتا ہوں۔ وہ آگے بڑھا اور شیک نے لباس لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن دوسرے
لمحے لڑکی کا لباس میرے ہاتھ سے نکل کر اس شخص کے منہ پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ میں نے
برق رفتاری سے اس کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا لیکن اس نے اپنی دانست میں مجھ
پر گولی چلائی تھی۔ میں تو اس کی رینج میں نہیں آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس آدمی کی
کربناک چیخ سنائی دی جو لڑکی پر جھک رہا تھا۔ اتنی دیر میں، میں اپنے شکار پر قابو پاچکا تھا۔
میں نے اسے بری طرح رگڑ دیا۔ پھر اس بدنصیب کی بھی موت آہی گئی تھی۔ پستول ابھی
تک اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔ چنانچہ پھر کسی
طرح ٹریگر دب گیا اور پستول کی دوسری گولی خود اس کے دماغ میں پیوست ہوگئی۔ میں
غضب سے اس پر داؤ لگائے ہوئے تھا لیکن اس کی گرفت ایک دم سست پڑ گئی اور وہ
اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اس طرح دونوں خود اپنے شکار ہوگئے تھے۔

میں نے ان کا جائزہ لیا اور پھر لڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ پانچ ہزار ڈالر کی آسامی
موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک کونے میں بیڈ
موجود تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے برہنہ جسم کو اٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ آن کی آن میں بیڈ
کی چادر بھی خون سے رنگین ہوگئی تھی۔ جس جگہ لڑکی پڑی ہوئی تھی، وہاں بھی بہت سا
خون جمع تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب اس کی زندگی مشکل ہے۔ چنانچہ اس کے قریب
پہنچ کر میں نے اسے جھنجھوڑا۔ ”اب میں تمہارے لئے کیا کروں؟“

جواب میں لڑکی نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے لیکن آواز
نہیں نکل سکی۔ تب اس نے دونوں ہاتھوں کو جنبش دی اور اپنے زیریں بدن کو ٹٹولنے
لگی۔ میں اس کی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ہاتھوں کو اپنی رانوں تک لے جانے
کی کوشش کررہی تھی۔ ایک بار اس کا ایک ہاتھ اسٹاکنگ کے سرے تک پہنچ گیا اور اس
نے اس سرے کو پکڑ لیا۔ پھر شاید ہاتھوں کی آخری قوت صرف کرکے اس نے زور سے
اسے کھینچا اور اس کا ہک کھل گیا۔ کھلے ہوئے ہک سے کوئی سفید سی شئے جھانکنے لگی۔
میں نے چٹکی سے اسے پکڑ کر کھینچا لیکن یہ اس کی آخری کوشش تھی۔ وہ شئے اس کے
ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کا ہاتھ نیچے گر پڑا۔

"چار" میرے منہ سے نکل گیا۔ چار لاشوں کے درمیان اب میں تنہا جاندار
تھا۔ کیا کروں۔ اب جان بچا کر بھاگ جاؤں۔ اگر کسی مصیبت میں پھنس گیا تو کوئی
نہیں کرے گا کہ میں ان چاروں کے درمیان اجنبی ہوں لیکن دوسرے لمحے احساس
کہ ایسی بھی کیا بزدلی.......... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس اسرار کو جاننے کی کوشش
کروں لیکن یہاں اس فلیٹ میں آرام سے بیٹھ کر یہ راز جاننے کی کوشش اتنے ہی
کے ساتھ مجھے جہنم رسید کر سکتی تھی۔ چنانچہ فوری طور پر میں نے چند فیصلے کئے۔
سے پہلے میں نے لڑکی کی اس آخری کوشش کا جائزہ لیا جو اس نے دانستہ یا نادانستہ طو
کی تھی۔ اسٹاکنگ کے سرے سے برآمد ہونے والی سفید چیز کیا تھی؟ اور اس کا انداز
بہت جلد ہوگیا۔ سفید پلاسٹک کے نیچے کوئی فلم تھی جو اسٹاکنگ کے ڈبل تہہ والے
میں لڑکی کی ران سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس قسم کی مائیکرو فلموں کے بارے میں مجھے تھو
بہت معلومات تھیں اس لئے یہ مجھے بے حد اہم محسوس ہوئی۔ دوسرے اسٹاکنگ میں
ایسی ہی ایک فلم موجود تھی۔ میں نے یہ دونوں فلمیں رول کر کے جیب میں ڈال لی
اس کے بعد میں نے دوسرے انداز میں سوچا۔ پھر میں نے لڑکی کے ساتھی شائیس کو
قبول صورت شخص تھا۔ اس کی جیب سے مجھے کچھ کاغذات اور تھوڑی سی کرنسی ملی
نے انہیں جیب میں ٹھونس لیا۔ اور پھر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان
جیبوں سے بھی جو کچھ دستیاب ہوا' میں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر فلیٹ کی ایسی
چیزوں کا جائزہ لیا جہاں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ ایک
دراز میں مجھے کافی کرنسی ملی اور میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ کم از کم اس بھاگ
معاوضہ تو مل گیا تھا۔

لیکن اب کوئی زیادہ کوشش بیکار تھی۔ یہاں سے نکل جانا بہتر تھا۔ چنانچہ چند
کے بعد میں نے فلیٹ چھوڑ دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنی کار میں بیٹھ کر واپس چل
اپنے بنگلے میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے وہ تمام چیزیں نکال کر ایک محفوظ جگہ
پھر خون آلود لباس تبدیل کیا۔ نہ صرف تبدیل کیا بلکہ کچن میں جا کر پہلا لباس جلا کر
کر دیا۔ پھر پانی کی بالٹی اور کپڑے لے کر باہر آیا اور کار کو ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں
ٹارچ کی روشنی بھی نہ دیکھی جا سکے۔ اس کے بعد میں نے روشنی میں کار کی خوب

کی اور سیٹوں اور نیچے کے پائیدان سے خون صاف کیا۔ اس کام سے پوری طرح مطمئن
ہو کر میں اندر آگیا۔ اس وقت سونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بہت سے کاغذات جو
میں وہاں سے لایا تھا' میرے لئے بہت دلکش تھے چنانچہ میں انہیں کھول کر بیٹھ گیا۔

لیکن اس وقت مجھے شدید حیرت سے دوچار ہونا پڑا جب میں نے دیکھا کہ وہ سب
کے سب جرمن زبان میں ہیں۔ جرمن.......... تو کیا وہ جرمن تھے؟ لیکن وہ کاغذات بھی
جرمنی زبان میں تھے جو میں اس لڑکی کے ہاں سے لایا تھا ممکن ہے وہ سب جرمن نژاد
ہوں اور اسی وقت ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ ممکن ہے وہ جرمن جاسوس
ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب کہ آدھی دنیا جنگ کی لپیٹ میں آچکی تھی اور جنگ کی آگ
بھڑکتی ہی جا رہی تھی۔ اس اتحادی ملک میں جرمنوں کی موجودگی صرف اسی خیال کی مظہر
تھی کہ وہ جاسوس تھے۔ شاید سب ہی جاسوس تھے اور ان میں کسی بات پر چل گئی تھی۔
میں خود تو جرمن زبان سے ناواقف تھا لیکن بہرحال کچھ ایسے لوگ بھی میری نگاہوں میں
تھے جو مجھے ان کاغذات کی تفصیل بتا سکتے تھے۔ خاص طور پر بوڑھا مجسمہ ساز پیٹرک جو
میرا بہت اچھا دوست تھا۔

پیٹرک نے اپنی آدھی زندگی جرمنی میں گزاری تھی۔ وہیں کسی جرمن عورت سے
شادی کی تھی اور اس کی موت سے بد دل ہو کر جرمنی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ طویل عرصہ
سے اپنی جرمن بیوی کے خوبصورت مجسمے بناتا تھا اور انہیں فروخت کر دیتا تھا۔ گویا یہ اس
کا شوق اور اس کی تسکین اور اس کا پیشہ تھا!

میں نے احتیاط کے ساتھ ان تمام کاغذات کو الگ الگ کیا اور پھر انہیں لفافوں میں
بند کر دیا۔ مائیکرو فلم بھی میں نے نہایت احتیاط سے رکھ دی تھی۔ میرے ذہن میں ایک
صورت ابھری تھی۔ کاش یہ کوئی اہم فوجی راز ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کی محرومیوں
کا صلہ مل جائے گا۔ اس زمانے میں یہ راز بے حد بیش قیمت بھی ہو سکتا ہے اور صحیح
معنوں میں یہ کام میرے شایان شان بھی تھا۔ یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ اب تک جو میں
چھوٹی چھوٹی کوششوں میں ناکام ہو چکا تھا وہ صرف اس لئے کہ قدرت مجھے میرا اصل مقام
دینا چاہتی ہو۔

میں نے مدت بعد پھر سینکڑوں ہوائی قلعے تعمیر کر ڈالے دوسری صبح نہا دھو کر میں نے

ہلکا سا ناشتہ کیا اور اپنے اردگرد کے ماحول پر نگاہ ڈالی۔ یہ ساری چیزیں ایک چرمی بیگ
رکھ کر میں باہر نکل آیا۔ اس وقت میری جیب میں تقریباً بارہ ہزار ڈالر کی رقم تھی
حالانکہ میں اس وقت ایک چھوٹی سی رقم یعنی پانچ ہزار ڈالر سے بھی مایوس ہوگیا تھا
لڑکی نے دم توڑ دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا یہ معمولی سی رقم میری تقدیر میں نہیں ہے
میری تھوڑی سی کوشش سے حالات بدل گئے تھے۔

میری کار پیٹرک کے علاقے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پیٹرک کے مکان سے
نصف فرلانگ دور میں نے کار روکی اور اسے لاک کرکے چرمی بیگ اٹھائے لاابالی لوگوں
مانند پیٹرک کے مکان کی طرف چل پڑا۔ بوڑھے کے سالخوردہ مکان کے دروازے
"پیٹرک جوئس لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ بیل مسلسل ایک منٹ
بجانی پڑی تھی تب کہیں جاکر جھلائے ہوئے بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر
تمام اس نے اپنے بگڑے ہوئے خدوخال درست کئے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پہچان گئے ہوگے!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یقین ہے تو پھر یہ بیکار سوال کیوں کیا' آؤ اندر آجاؤ۔ بوڑھے پیٹرک نے کہا
میں اندر داخل ہوگیا۔ پیٹرک جوئس یوں بھی چڑچڑی شخصیت کا مالک تھا اور اس کی
میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ساری دنیا کو تو اس کی بیوی کے مجسموں سے دلچسپی نہیں ہو
تھی اور وہ صرف اسی کے مجسمے بناتا تھا۔ اگر کوئی نیا بے وقوف پھنس گیا تو ہفتہ اچھا چل
ورنہ عموماً وہ پریشان ہی رہتا تھا۔ بوڑھے نے ایک مونڈھا مجھے بیٹھنے کے لئے پیش کیا
بولا۔ "بتاؤ بھئی کیسے آنا ہوا؟"

"مجھے کسی دوست کی ضرورت محسوس ہوئی تو تمہارے پاس چلا آیا۔ یوں بھی
نے سوچا کہ جنگ کے اس برے دور میں جب کہ بڑے بڑے کاروبار ٹھپ پڑے ہیں
جانے بے چارے مسٹر جوئس کا کاروبار کیسا چل رہا ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے دوست
خدمت میں یہ سو ڈالر پیش کرنے آیا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تیسرے دن
سو ڈالر دے جاؤں گا۔" میں نے سو ڈالر کا ایک نوٹ بوڑھے کی طرف بڑھایا اور اس
چیل کی طرح میرے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔

"تم بعد میں اسے مذاق کہہ کر نوٹ واپس تو نہیں مانگو گے؟" وہ مشکوک نگا

ے مجھے دیکھ کر بولا۔

"ہرگز نہیں مسٹر جوئس! لیکن یہ خیال آپ کے ذہن میں کیوں آیا۔"

"اس لئے کہ اس دور میں بہت کم بے وقوف ایسے ہوں گے جو کسی کو سو ڈالر کا
نوٹ اس طرح دے دیں۔" پیٹرک جوئس نے صاف گوئی سے کہا۔

"میں تو تمہارا دوست ہوں مسٹر پیٹرک!"

"ان میں سے جو مجسمہ تمہیں پسند ہو لے جاؤ۔ میری طرف سے تمہاری نذر!"

"نہیں مسٹر جوئس! میں نے آپ کی مدد بے غرض کی ہے' اب مجھے اجازت دیں۔"

"اس طرح نہیں بھئی۔ کم از کم تمہیں چائے تو پلا ہی سکتا ہوں۔" بوڑھے کی
آنکھوں سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اچانک میں نے ایسی اداکاری کی
جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"ارے ہاں مسٹر پیٹرک! آپ تو جرمن زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔"

"واقف ہوں گے؟" بوڑھے نے آنکھیں نکالیں۔ "اہلِ جرمنی بھی مجھ سے زیادہ
اپنی زبان نہیں جانتے ہوں گے!"

"ہاں یقیناً۔ تب براہ کرم میرے اس خیال کی تصدیق کریں میں ایک عجیب وغریب
واقعے سے دوچار ہوں۔ دو تین دن پہلے مجھے ایک لفافہ ملا جس میں چند کاغذات تھے اور
مائیکروفلمیں۔ میرا خیال ہے ان کاغذات کی زبان جرمن ہے۔"

"کس نے بھیجے تھے؟"

"یہی بات تو نامعلوم ہے۔ آپ دیکھ لیں تو کچھ پتہ چل سکتا ہے۔" میں نے بیگ
سے شائیس کے کاغذات نکال کر اس کے سامنے کردیئے۔ بوڑھے نے ان کاغذات کو
دیکھا اور پھر چند ساعت کے بعد بولا۔ "کیپٹن شائیس کے نام ایک خط ہے جس میں لکھا
ہے کہ کیوں نہ ہم اپنی زندگی بنانے کی کوشش کریں۔ لڑکی کی تحریر ہے۔"

"خوب........ اور........"

"بس اس کاغذ میں کچھ نوٹس ہیں' جو صرف یادداشتوں پر مشتمل ہیں!"

"انہیں دیکھئے مسٹر جوئس!" میں نے دوسرے کاغذات دیئے اور سو ڈالر کا نوٹ ان
کاغذات پر رکھ دیا۔

"یہ شناختی کاغذات ہیں۔ میجر گراڈلے' فرائم گستاپو۔ جسے ہدایت دی گئی ہے کہ
دونوں کا پتہ لگاؤ۔ دوسرا کوئی جین بکلے ہے۔ یہ بھی گستاپو کا آدمی ہے۔"
"تعجب کی بات ہے کہ نہ جانے اس لفافے پر میرا پتہ کیوں لکھ دیا گیا۔ بہرحال
جوئس! میں کل یا پرسوں آپ کو بقیہ رقم پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔"
"اور وہ فلمیں.........؟" بوڑھے نے پوچھا۔
"انہیں بھی کسی وقت لے آؤں گا! ظاہر ہے ان کے لئے پروجیکٹر بھی درکار
اور ہاں ان حالات میں کوئی تکلیف مت اٹھانا۔ میں آئندہ بھی تمہاری مدد کرتا رہوں
شکر گزار بوڑھے کو چھوڑ کر میں وہاں سے چلا آیا اور اب مجھے پروجیکٹر درکار تھا۔ یہ
اس خیال کی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ چاروں جرمن جاسوس تھے اور یہاں کوئی کار
کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے مائیکرو فلموں میں کوئی اہم راز ہوا تو میری تقدیر کھل
گی۔

دو روز تک میں بوڑھے کے پاس نہیں گیا۔ پہلے تو میں نے ان فلموں کی حفا
بندوبست کیا اور اس کے بعد ایک چھوٹا سا پروجیکٹر خرید لیا۔ اس کے سوا چارہ نہیں
تیسرے دن میں بوڑھے کے پاس پہنچ گیا اور پھر سو ڈالر کے نوٹ کے ساتھ میں
پروجیکٹر بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔
"فلمیں لے آئے؟"
"ہاں دوست! یہ موجود ہیں!!"
"تو آؤ......... لیکن ٹھہرو......... میں ذرا کاغذ قلم لے آؤں۔ ممکن ہے کوئی
بھی ہو۔" بوڑھے پیٹر جوئس نے کہا اور ہم انتظامات میں مصروف ہوگئے۔ میں پر
آپریٹ کر رہا تھا اور پھر اسکرین پر ایک تحریر ابھر آئی اور بوڑھے کی آواز ابھری۔ "
کا عظیم منصوبہ!" پھر فلم چلنے لگی۔ بوڑھے کا قلم بھی برق رفتاری سے چل رہا تھا
آٹھ بار اس نے فلم بار بار چلوائی۔ پوری فلم میں تحریر ہی تحریر تھی۔ پھر بوڑھے
نے ہاتھ اٹھایا اور بے ربط تحریر کو جمع کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آوا
کہا۔ "میرے خدا! یہ تو جرمن حکمران ہٹلر کا جنگی منصوبہ ہے۔ اس میں اس کی فوج
کی تفصیل ہے اور ان جگہوں کا تعین ہے جہاں پر وہ نگاہیں جمائے ہوئے

دوسری فلم لگاؤ۔" بوڑھے نے کہا اور میں نے جلدی سے دوسرا رول لگا دیا۔
اس بار میں نے خود دیکھا۔ یہ نقشے تھے جن پر تیروں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔
باقاعدہ پہاڑ' میدان اور شہروں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ میری اپنی حالت خراب ہوئی
جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ وہی تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ یہ جو کچھ تھا اس کے بدلے میں
ایک غیر فوجی بھی یہی کہہ سکتا تھا کہ اہم ترین چیز ہے۔ بیش قیمت اور اس کے عوض وہ کچھ
مل سکتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم جوئس کے ذہن سے بھی یہ بات نکالنی
تھی' چنانچہ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "چھوڑو جوئس! یہ سب کچھ ہمارے لئے بیکار ہے۔
نہ جانے کس گدھے نے یہ مذاق کیا۔ ہاں میں نے تمہارے مجسمے خریدنے کے لئے ایک
گاہک کا بندوبست کیا ہے۔ کتنی تعداد ہوگی؟"
"اوہ! کیا وہ ایک سے زیادہ مجسمے خریدنے کا خواہشمند ہے؟" جوئس نے خوش ہو کر
پوچھا۔ اس دوران میں نے فلم رولز پروجیکٹر سے نکال کر جیب میں ڈال لی تھی اور پروجیکٹر
بند کر دیا تھا۔
"ہاں میرا خیال ہے کہ وہ بڑی خریداری کرے گا!"
"کیا تم نے اس سے میرا تذکرہ کیا تھا؟"
"بڑے اہتمام سے......... اور میں نے اسے کافی متاثر کر لیا ہے!"
"واقعی تم تو میرے لئے بہت کچھ کر رہے ہو لیکن میرے دوست! کیا وہ ایک ہی قسم
کے بہت سے مجسمے خریدنے پر تیار ہو جائے گا؟"
"ہاں! اسے ایک ہی قسم کے مجسمے درکار ہیں!"
"تب تم اس سے میری بات کرا دو۔ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں گا!"
"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔ ویسے تم یہ ایک نوٹ اور رکھ لو۔ میرا خیال ہے
تمہارے کافی دن گزر جائیں گے۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔" میں نے خوش ہو کر بوڑھے
جوئس کو ایک اور نوٹ دیا اور پھر وہاں سے باہر نکل آیا لیکن میرے قدم زمین پر نہیں پڑ
رہے تھے۔ پھر مزید دو دن میں نے صرف منصوبہ بندی میں صرف کئے۔ یہ منصوبہ بندی
واقعی میرے شایانِ شان تھی۔ اس منصوبے کے تحت میں نے فنیٹم کو فون کیا اور سے
طلب کر لیا۔

"کیسے حال ہیں فنیئم؟"

"اب تو فاقوں تک نوبت پہنچ گئی ہے استاد! کچھ کرو ورنہ خودکشی کرنی پڑے گی"

"تم جانتے ہو فنیئم! میں گھٹیا قسم کے منصوبے نہیں بناتا۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں کوئی اعلیٰ کام کروں۔ اگر تم اعلیٰ پیمانے پر کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو میرے ساتھ کام کرو۔"

"آہ! میری اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟" فنیئم نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو فنیئم! نہ تو یہ کوئی بنک ڈکیتی ہے، نہ کسی سے فراڈ کرنا ہے لیکن اس میں قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑے گا!"

"میں نے کہا نا استاد...... جب انسان خودکشی کی ٹھان لے، تو پھر خطرناک خطرناک کام اس کے لئے بے حقیقت ہوتا ہے۔"

"یہ بات ہے!"

"ہاں استاد آزمالو...... فنیئم کبھی جان دینے سے دریغ نہیں کرے گا!"

"اس کے علاوہ رازداری شرط ہے فنیئم! اور کبھی میری اسکیم کسی کے سامنے تمہاری زبان سے نکل گئی۔"

"اس کے لئے ایک پیش کش ہے استاد؟"

"کیا؟"

"فنیئم کی زبان کاٹ کر اپنے پاس رکھ لو...... یا رعایت کرو تو اس وقت نہ کاٹو اس وقت کاٹ دینا جب اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے۔"

"نہیں مجھے تمہارے اوپر یقین ہے، تو یوں سمجھو کہ آج سے تم میرے ساتھ رہو گے اور میں تمہیں اپنے عظیم منصوبے کا رازدار بناتا رہوں گا۔"

"فنیئم حاضر ہے۔"

"تو سنو فنیئم!...... جنگ زوروں پر ہے۔ ہٹلر کا قہر بے شمار ممالک پر ٹوٹ رہا ہے۔ میں ایک عظیم جرمن منصوبے کو اتحادیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ اہم ترین جرمن راز موجود ہیں جن کی میں اتنی بڑی قیمت وصول کرنا چاہتا ہوں

ہماری پشتیں عیش کریں۔"

"ایسا کوئی راز تمہارے پاس موجود ہے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتا تھا...... اچھی طرح جانتا تھا کہ تم معمولی انسان نہیں ہو۔ کوئی ایسا کمال دکھاؤ گے کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔ بہرحال تم نے فنیئم کو اس قابل سمجھا ہے یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ میں دل وجان سے تمہارے ہر حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔"

فنیئم کو میں نے بلاوجہ اپنے ساتھ نہیں ملایا تھا۔ ہم نے چھ ایسے آدمیوں کو منتخب کیا جو ہمارے کام کے ہو سکتے تھے۔ ان سب کا سربراہ فنیئم تھا۔ دراصل میں اعلیٰ پیمانے پر کام کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ یقیناً یہ کام مشکل تھا، ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے اپنے منصوبے کی تکمیل کرلی اور پھر فلم کے چند حصوں کو ری پرنٹ کیا گیا اور ان میں سے کچھ ایک خط کے ساتھ میں نے وزارتِ دفاع کو بھجوا دیئے۔ انتہائی ذہانت سے یہ کام میں نے کیا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ جس وقت میں نے وزیرِ دفاع کو فون کیا تو وہاں شاید پوری کابینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مضطربانہ انداز میں میرا فون ریسیو کیا گیا تھا۔

"میرا خط آپ کو ملا ہوگا!" میں نے دریافت کیا۔

"اوہ...... ہاں خط کے مطابق ہم آپ کے فون کا انتظار کر رہے تھے!" وزیرِ دفاع بنفس نفیس بول رہے تھے۔

"کیا آپ کو اس سے کوئی دلچسپی ہے؟"

"ہم پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ آپ سے سودا کرنے کے لئے تیار ہیں!"

"کچھ شرائط کے ساتھ!"

"فرمایئے......"

"سودے کی بات چیت کہاں ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر کیا جائے گا؟"

"جگہ کے بارے میں فرمایئے!"

"گورنر ہاؤس کی عمارت کیسی رہے گی؟"

"مناسب۔ ملاقات کب ہوگی؟"

"آج ہی رات نو بجے آپ پہنچ جائیں۔ یا اگر آپ احتیاط چاہیں تو جو جگہ آپ کریں۔"

"نہیں.......... آپ کی پسند کی جگہ بہتر ہے۔ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جاؤں گا۔ آپ سے فلاؤسسک کے نام سے ملاقات کروں گا۔"

"بہتر۔ تو ہم انتظار کریں۔ آپ کی طرف سے کوئی اور شرط؟"

"جی نہیں.......... سب ٹھیک ہے!" میں نے جواب دیا اور فون بند کردیا۔ رات نو بجے میں گورنر ہاؤس کی تاریک عمارت کے قریب تھا۔ ٹیکسی سے جونہی میں نیچے اترا بہت سے افراد قریب پہنچ گئے۔ میرا استقبال پُرجوش انداز میں کیا گیا تھا۔ میں نے فلاؤسسک کے نام کا حوالہ دیا تھا۔

ایک بڑے ہال میں ہم سب ایک میز کے گرد پہنچ گئے۔ یہاں چھ افراد تھے اور سب کے سب مجھے گھور رہے تھے۔ "یہ وہ ٹکڑے ہیں جو مسٹر فلاؤسسک نے آپ کے پاس بھیجے تھے' انہیں ایک طرح کا ثبوت سمجھئے۔" میں نے کہا۔

"تت.......... تو.......... آپ مسٹر فلاؤسسک نہیں ہیں!"

"جی نہیں لیکن میں ایک برابر کا نمائندہ ہوں۔ مسٹر فلاؤسسک نے ایک بڑا گروپ ترتیب دیا ہے۔ ہم کل آٹھ افراد ہیں' نویں مسٹر فلاؤسسک ہیں۔ ہم میں سے کوئی انہیں صورت سے نہیں پہچان سکتا۔ ہمیں اختیارات دیئے گئے ہیں کہ ہم سودے کی بات کریں۔ اگر مسٹر فلاؤسسک سودے سے مطمئن ہوئے تو بات طے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ آپ سے گفتگو کی جائے گی۔ اگر آپ سے معاملات پسندیدہ طریقے سے طے ہوگئے تو میں مسٹر فلاؤسسک کو اطلاع دے دوں گا۔ اگر میرے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو مسٹر فلاؤسسک دوسرے نمائندوں کے ذریعے دوسرے طریقے سے کام کریں گے!"

"خوب تو آپ ان فلموں کی کیا قیمت لگائیں گے؟"

"آپ آفر کریں' اگر ہمارے لئے قابلِ قبول ہوئی تو.........."

"پچاس لاکھ ڈالر!"

"اس سے زیادہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ رقم کافی ہے!" وزیر دفاع نے کہا۔

"آپ آخری بات کریں' میں مسٹر فلاؤسسک کو اطلاع دے دوں گا!"

"پھر آپ کو ایک کروڑ ڈالر پیش کرسکتے ہیں اور جواب اب سے چھ گھنٹوں کے اندر اندر!"

"مسٹر فلاؤسسک مجھے چار گھنٹوں کے اندر کسی وقت فون کرسکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو میرا پتہ نوٹ کرلیں۔ اس طرح آپ میرے تعاقب کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ میں آپ کو اپنے مطلوبہ پتے پر ہی ملوں گا۔ میں نے آپ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر میرے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو مسٹر فلاؤسسک پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا!"

"آپ بے فکر رہیں۔ ہم آپ سے دیانتدارانہ سودا کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا!"

"بہتر.......... مجھے اب اجازت دیں اور پھر رسمی گفتگو کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ کافی دور تک میں پیدل چلتا رہا۔ پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑا۔ ٹیکسی میں نے ایک ہوٹل کے سامنے رکوائی۔ اس دوران تعاقب کا بھی اندازہ لگا رہا تھا لیکن ایسا کوئی شبہ نہیں ہوا۔

ایک کروڑ ڈالر.......... میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اس راز کی اہمیت کا اندازہ مجھے بخوبی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے کچھ اور باتیں بھی سوچی تھیں۔ حکومت کے پیمانے پر کسی راز کی تجارت معمولی کام نہیں تھا۔ فلمیں میں نے ایسی جگہ محفوظ کی تھیں کہ آسانی سے ان کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے نہایت ہوشیاری سے کام کرنا تھا۔ میں نے یہ بات ذہن نشین کرلی تھی کہ اتحادی مجھے اس راز کی منہ مانگی قیمت ادا کرسکتے ہیں اور یہ ملک' ہر ملک' میرا خیال تھا کہ ایک مخصوص رقم سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے ذہن کو وسعت دینی چاہئے۔ اعلیٰ پیمانے پر اس سلسلے میں کاوش کرنی چاہئے تاکہ راز کی مناسب قیمت مل سکے۔ بے شمار منصوبے میں نے اپنے ذہن میں تکمیل دیئے تھے۔

بہرحال میں گھر واپس پہنچ گیا۔ میں ان لوگوں کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا اور مجھے مایوسی

نہیں ہوئی۔ اس وقت میں اپنے بنگلے میں تنہا تھا۔ ایک کروڑ ڈالر کی رقم نے میر
چھین لی تھی۔ اس وقت رات کے تقریباً تین بجے ہوں گے جب اچانک میں چونکا
میری خواب گاہ کے دروازے سے چار پانچ آدمی اندر گھس آئے۔ یہ سب لمبے کوٹ
فلیٹ ہیٹ میں ملبوس تھے۔ دو آدمیوں نے پستول کے نشانے پر رکھ کر مجھے کس لیا
لوگ میرے گھر کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا
تھا جیسے رات بھر میں وہ اس عمارت کو ہی منہدم کردیں گے۔ مکان کا سارا فرنیچر
واش جگہ جگہ کا فرش اکھاڑنے کا کام وہ لوگ صبح کے تقریباً دس بجے تک کرتے ر
اس دوران نہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے ان سے........ پھر وہ
کی ایک پیالی اور ناشتے کا کچھ سامان لے کر میرے سامنے آئے۔

"براہ کرم آپ ناشتہ کرلیں۔ کچھ مہمان ایسے بھی ہوتے ہیں جو میزبان بن
ہیں!" ان میں سے ایک بولا۔

"بہت بہت شکریہ........ لیکن میں اپنے معزز مہمانوں سے متعارف ہونا
ہوں۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"ہمارا تعلق حکومت سے ہے اور ہم ایک امکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ درا
حکومت کو خطرہ تھا کہ رقم کی کمی کی وجہ سے آپ اس راز کا سودا کہیں اور کرنے
بارے میں نہ سوچنے لگیں۔ اگر وہ فلمیں ہمیں یہاں مل جائیں تو ہم آپ کو اپنی بتائی
رقم پیش کردیتے اور اس کے ساتھ ہی آپ کا جو نقصان ہوا ہے، وہ بھی!"

"خوب! لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کام آپ نے وقت سے پہلے کرڈالا۔ مجھے چھ
دیئے گئے تھے، کیا وہ گزر گئے؟"

"آپ نے اس دوران مسٹر فلاؤسسک سے بات کرنے کی کوشش کی؟"

"جس وقت ان کا فون آیا، افسوس میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اس
مجبور تھا۔"

"کیا........ مطلب........؟"

"میرا خیال ہے وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن آپ نے بتایا کیوں نہیں؟"

"آپ تمام حضرات میرے اس مختصر سے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے اور
میں خود چل کر آپ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے سودے کا وقت گزر گیا۔ مسٹر
فلاؤسسک کو یقیناً اطلاع مل چکی ہوگی کہ میرے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہوا اور وہ اس
سودے سے مایوس ہوگئے ہوں گے!"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم اس سے رابطہ قائم کرو گے۔" بھاری
جبڑوں والے ایک شخص نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"ضرور کروں گا لیکن ایسا کریں۔ آپ مجھے یہاں سے گرفتار کرکے لے جائیں اور
ایک ایک کرکے پہلے میرے دانت توڑیں، پھر انگلیاں۔ آخر میں مجھے آگ سے جلا جلا کر
اذیتیں دیں اور ہلاک کردیں۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے۔ جب میں ہلاک ہوجاؤں تو مسٹر
فلاؤسسک روتے پیٹتے آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور آپ سے میری لاش کا مطالبہ
کریں گے۔ بس آپ اسی وقت انہیں گرفتار کرلیں۔ بہترین ترکیب ہے۔"

"کیا بکواس ہے؟" وہ شخص گرجا۔

"اس کام کو شروع کرنے سے قبل ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا تھا مسٹر، معاہدہ
یہ تھا کہ ہر شخص، ان فلموں کی فروخت کے بعد اس سے حاصل شدہ رقم کا برابر کا حصہ
دار ہوگا لیکن سودے بازی میں اس کو کوئی نقصان پہنچا جو خواہ موت ہی کیوں نہ ہو، تو
دوسرا کوئی اس کی مدد نہیں کرے گا اور اس سے ہر قسم کا رابطہ ختم کرلیا جائے گا اور یہ ہر
شخص کا اپنا رسک ہوگا۔ چنانچہ مسٹر فلاؤسسک کا ایک وکٹ تو گر گیا۔"

وہ سب سکتے کے عالم میں رہ گئے تھے۔ "بیڈ لیک........ تم احمق ہو۔ اب جو
تمہارا دل چاہے کرو۔ میں خود رپورٹ دے دوں گا۔ میں براہ راست تمہارے پروگرام
میں ملوث نہیں ہوں۔"

"لیکن میں نے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔" چوڑے چہرے والے نے کہا۔
"اس کے علاوہ میں انہیں اس رقم کا چیک ابھی پیش کرنے کے لئے تیار ہوں جو اس
نقصان کے سلسلہ میں ہوگی۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ تھا کہ زیادہ رقم کے لالچ میں یہ کہیں
اور سودا نہ کردیں۔"

"مثلاً!" میں نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ آپ سے اگر دوبارہ رابطہ قائم ہو تو اس فون کے بارے میں آپ ... دیں کہ آپ سو گئے تھے۔ معذرت کرلیں مسٹر فلاؤسسک سے۔"

"میں اب بھی یہی چاہوں گا بشرطیکہ آپ اس کی پبلسٹی نہ کریں۔ اس طرح ... چانس تو رہے گا!" میں نے جواب دیا۔

"ہم سمجھ رہے ہیں۔ ہماری طرف سے تو پبلسٹی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ... دوسری حماقت تو ممکن نہیں ہے۔"

"آپ براہِ کرم میرا نقصان ادا کردیں۔ میں آپ سے تعاون کروں گا!"

"کیا پیش کیا جائے؟"

"پہلے مجھے ایک نگاہ جائزہ لینے دیا جائے۔" میں نے کہا اور مجھے اجازت دے دی گئی۔ مکان کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ان کی جانب دیکھا اور بولا۔ "پچیس ہزار ... دے دیئے جائیں۔

"کیا؟" چوڑے جبڑوں والا دہل کر رہ گیا۔

"میں اس سے ایک ڈالر کم لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے اور پھر دوسرے آدمی نے چوڑے جبڑے والے کو مخاطب کرکے کہا۔ "تمہیں یہ شرط ماننا ہوگی!"

"چیک ایک گھنٹے میں پہنچ جائے گا!"

"اس کے کیش ہونے کے بعد ہی میں آپ سے مکمل تعاون کرسکوں گا!" میں نے جواب دیا ور ان پر یہ ظاہر کیا کہ میں ان کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ ... ہی دل میں وہ پیچ و تاب کھا رہے تھے لیکن خود اپنے ہاتھ کٹا بیٹھے تھے اور مجھے بھی ... معنوں میں لطف آرہا تھا۔ پہلی بار ایک بڑی رقم کے لئے ذہنی جمناسٹک کرنی پڑ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے حاصل زندگی مل گیا ہو۔ میں ان لوگوں سے ذرہ بھی خوفزدہ نہیں تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ ان کی ایک جنبش میرے لئے موت بن سکتی ہے لیکن موت اس وقت دعوت نہ دی جاتی تو پھر کون سا وقت آتا۔

بہرحال میں ان لوگوں کے جانے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ باہر نکل گئے تو خود ... تیزی سے اپنے کمرے میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد

مجھے پچیس ہزار کا چیک مل جائے گا لیکن میں ایک کروڑ ڈالر کا مالک تھا۔ یہ پچیس ہزار کیا حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ بہرحال اس راز کی قیمت کی پہلی بولی اتنی عمدہ ہے تو آئندہ اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے اور اب جب یہ نعمت بے بہا میرے ہاتھ آگئی ہے تو پھر اس کی اتنی قیمت وصول کی جائے جس کے بعد آئندہ کچھ کرنے کی حاجت ہی نہ رہے۔

مکان کے عقب سے کس طرح باہر جایا جاسکتا ہے' یہ مجھے معلوم تھا۔ میں نے فنیتھم کی رہائش گاہ منتخب کی تھی لیکن ایک گھنٹے کے بعد ہم نے وہ رہائش گاہ چھوڑ دی۔ فنیتھم کو میں نے پوری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا اور وہ بہت پُرجوش نظر آرہا تھا۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے استاد؟" اس نے پوچھا۔

"جس قدر جلد ممکن ہوسکے' یہ شہر چھوڑ دیا جائے۔ کسی دوسرے شہر پہنچ کر ہم سرحد پار کرنے کی کوشش کریں گے!"

"اور دوسرے لوگ!" فنیتھم نے پوچھا۔

"صورتِ حال بدل گئی ہے فنیتھم! میرا خیال ہے سمندر کا مختصر سفر کرکے ہم کسی بھی طرح دوسرے ملک میں داخل ہوجائیں اور وہاں قسمت آزمائی کریں۔"

"فرانس!" فنیتھم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ہاں! میرے ذہن میں یہی ہے۔"

"اس کے لئے بہترین جگہ آرکوچ ہے۔ ٹرین سے ہم آرکوچ پہنچ جائیں۔ یہاں سے لانچیں چلتی ہیں جو ہمیں راتوں رات فرانس پہنچا دیں گی۔ آرکوچ میں میرا دوست راڈکلف رہتا ہے جو سارے کام آسانی سے کرادے گا۔ آج کل وہ یہی کام کرتا ہے۔" فنیتھم بولا۔

"اس سے عمدہ اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ باقی رہی دوسرے لوگوں کی بات.......... تو انہوں نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہمارے لئے کام نہ کرسکے۔ چنانچہ انہیں معقول معاوضہ ملے گا!"

"تب کسی اور جگہ جانے کی بجائے آرکوچ کیوں نہ چلیں۔" فنیتھم نے کہا۔ "اور اتنی جلدی اتنا بڑا پروگرام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔" ٹرین کا سفر زیادہ دور نہیں

تھا لیکن ہم آرکوچ پہنچ گئے۔ صرف چار گھنٹے کا سفر تھا اور اس وقت دن کے تی
تھے۔ روڈ کلف ایک سیاہ فام نوجوان تھا لیکن بے حد خوش اخلاق.......... بڑے تپاک
پیش آیا۔ "کیا تمہارے پاس کاغذات موجود ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں.......... صرف روڈ کلف ہے۔" فنیثم نے جواب دیا اور وہ ہنس پڑا۔

"تب تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں کاغذات تیار کرائے دیتا ہوں تاکہ
وقت نہ ہو۔ آج کل فرانس کی فضاء بہت خراب ہے۔ ورنہ کوئی بات نہیں تھی!"

"انتظامات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ" اب روڈ کلف اتنا بے اثر بھی نہیں ہے تم میرے آفس میں بیٹھو
تمہارے لئے کوئی مشروب بھجواتا ہوں۔"

ہم اس کے آفس میں بیٹھے شراب سے شغل کرتے رہے۔ ایک فوٹوگرافر ہم د
کی تصویریں اتار کرلے گیا اور تقریباً دو گھنٹے کے بعد روڈ کلف نے ہمیں ایک لانچ
سوار کرادیا۔ پیرس کے پکاڈیل ہوٹل کے چھوٹے سے سیاہ کمرے میں بیٹھ کر ہم
دوسرے پروگرام ترتیب دیئے اور دیر تک ان پروگراموں پر بحث کرکے بالآخر
ہوگئے۔ یہ رات خاموشی سے گزاری۔ ہم سو نہیں سکتے تھے کیونکہ کئی بار سائرن بجے
ان کے بعد دھواں دھوں شروع ہوگئی۔ جرمن طیاروں نے ان علاقوں میں خاصا اودھم
رکھا تھا۔

دوسرے دن ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کردیا اور اس کارروائی کے نتیجے میں ٹھ
ایک ہفتے کے بعد ایک خوبصورت کہانی کے ساتھ فرانس کے خفیہ فوجی محکمے "تاستارا"
ہیڈ کوارٹر میں جنرل گیلی ویل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ جنرل گیلی ویل کے سامنے ہما
فراہم کردہ فوٹوگراف رکھے ہوئے تھے اور وہ بار بار انہیں اٹھا کر دیکھنے لگا تھا!

"میں نے حکومتِ فرانس سے بات کرلی ہے اور مجھے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ آ
سے ہر قیمت پر معاملات کرلوں۔ آپ.........." جنرل اچانک خاموش ہوگیا۔ سا
بھیانک آواز میں چیخ اٹھے تھے اور فرنچ راڈارز نے دیر میں اطلاع دی تھی۔ آج شاید
یہی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس سے قبل کہ جنرل اپنی جگہ سے اٹھے' اچانک کان پھاڑ دینے وا
کئی دھماکے ہوئے اور ہمارے عقب کی دیوار اندر آپڑی جنرل گیلی ویل کی چیخ لمبی

دب گئی۔ میں اگر اچھل کر دروازے سے باہر نہ چھلانگ لگادیتا تو کمرے کی چھت یقیناً
میرے اوپر آگرتی۔ تاہم میں زخمی ہوگیا تھا۔ ایک بڑا پتھر میری پیشانی پر لگا تھا اور اس کے
بعد کچھ خبر نہیں۔ ہوش میں آیا تو فوجی ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا اور میرے
سامنے جو شخص میل نرس کی حیثیت سے کھڑا تھا' وہ فنیثم تھا۔

میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "فنیثم!" میں نے اسے آواز دی اور فنیثم
مسرت سے بے ہوش ہوتے ہوئے بچا۔

"آہ' تم تم ٹھیک ہوگئے استاد! تم ٹھیک ہوگئے!!" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"کیا میرا زخم زیادہ گہرا ہے؟"

"نہیں.......... میں کس طرح مسرت کا اظہار کروں.......... میں کس طرح.........."

فنیثم کی یہ حالت میرے لئے عجیب تھی اور اس سے زیادہ عجیب میری حالت ہوگئی جب
میں نے فنیثم کی زبانی عجیب انکشافات سنے۔ فنیثم نے بتایا کہ تین ماہ سے میں اس ہسپتال
میں داخل ہوں اور دو مہینے دس دن مجھے بالکل ہوش نہیں آیا۔ میری زندگی باقی رہی۔ اس
دوران ڈاکٹروں نے میرے سر کے تین آپریشن کئے ہیں۔ آخری آپریشن آج سے بیس
دن قبل ہوا تھا اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ اس سے میری ذہنی حالت درست ہوجائے گی
فنیثم نے مجھے بتایا کہ کیسے کیسے جتن کرکے وہ یہاں میل نرس کی ملازمت اختیار کرسکا ہے
اور مسلسل میری تیمارداری کرتا رہا ہے۔

"ہمارا سامان فنیثم!" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"میں نے سارا سامان تلف کردیا اور فلمیں.........." اس نے دروازے کی طرف
دیکھا اور پھر اپنا سینہ عریاں کردیا۔ اس کے گھنے بالوں کے نیچے مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا تھا
لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ "یہ آپریشن میں نے خود کیا ہے۔
فلمیں میری کھال کے نیچے موجود ہیں۔"

اور میں دنگ رہ گیا۔ مجھے فنیثم سے اس حد تک وفاداری کی امید نہیں تھی۔ بلاشبہ
وہ ایک قابلِ اعتماد ساتھی اور زندگی بھر کا دوست تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس موقع سے فائدہ
اٹھا سکتا تھا اور میں اس کی گرد بھی نہ پاسکتا لیکن اس نے مکمل وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور
اس کی یہ وفا پرستی میرے دل پر نقش ہوگئی تھی۔ "میں تمہارا شکریہ نہیں ادا کروں گا

فینٹم! لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم میرے زندگی بھر کے دوست ہو!"

"میں تو تمہارا غلام ہوں استاد!" فینٹم نے جواب دیا اور پھر بولا۔ "اب مجھے تم
دیر کے لئے اجازت دو۔ ایک دوسرے کمرے میں بھی میری ڈیوٹی ہے۔ ایک امریکی
افسر یہاں زیر علاج ہے۔ بہت چڑچڑا آدمی ہے۔"

"امریکی!" میں نے پرخیال انداز میں کہا اور فینٹم کو بھی میرے لہجے کا احساس ہوا

"استاد! وہ شخص تمہارے بارے میں بہت پوچھتا رہتا ہے بلکہ کئی بار تو مجھے شبہ
ہوا ہے۔"

"فینٹم!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کیا ہم امریکہ کو بھی اپنی لسٹ میں رکھ سکتے ہیں؟"

"سب سے مالدار ملک ہے استاد!" فینٹم نے آنکھ مار کر کہا۔

"افسر کا کیا رینک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو پتہ نہیں.......... لیکن میں نے بریگیڈیئر تک کو یہاں آتے دیکھا ہے اور یہ
جگہ انتہائی اہم لوگوں کے لئے ہے!"

"کیا تم اپنے طور پر کوشش کرسکتے ہو فینٹم!"

"میں سمجھ گیا استاد......... لیکن کیا کہوں اس سے؟" فینٹم نے پوچھا اور اس کے
بعد دیر تک ہم ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرتے رہے، پھر فینٹم چلا گیا........ تقریباً
گھنٹے بعد وہ ایک بار پھر میرے پاس آیا اور جلدی میں بولا۔ "مجھے اس سے بات کرنے
موقع نہیں مل سکا استاد' کل کوشش کروں گا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے صرف
بتایا تھا کہ ساتھ والے کمرے کا مریض صحت یاب ہوگیا ہے اور پھر کچھ لوگ اس سے
آگئے۔"

"ٹھیک ہے کل تم اس سے بات کرلو۔" میں نے جواب دیا اور پھر نرس کے آجانے
کی وجہ سے فینٹم چلا گیا۔ یوں بھی اس کی ڈیوٹی کے اوقات ختم ہوگئے تھے۔ نرس نے
سے کوئی بات نہیں کی اور وہ انجکشن دے کر چلی گئی۔ میں خاموشی سے ان عجیب و غریب
واقعات کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

رات کو مجھے عجیب و غریب انداز میں غذا دی گئی۔ غالباً انہیں میرے ہوش و حواس
میں ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میں نے صرف اس لئے خاموشی اختیار کرلی کہ میں

دیکھنا چاہتا تھا کہ ان دنوں میری کیا حالت رہی۔ پھر اس وقت تقریباً دو بجے تھے جب
اچانک بمباری شروع ہوگئی۔ کمرے لاکھ ساؤنڈ پروف بنائے گئے تھے لیکن باہر کی آوازیں
کہاں رک سکتی تھیں لیکن جس وقت اچانک زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تو میں
کافی خوفزدہ ہوگیا۔ میں نے سمجھا کہ حملہ ہسپتال پر ہی ہوا ہے اور ایک بار پھر میری زندگی
خطرے میں پڑ گئی ہے لیکن اسی وقت دروازہ دوبارہ بند ہوگیا اور مجھے ایک سرگوشی سنائی
دی۔

"کیا تم جاگ رہے ہو؟"

"کون ہو تم؟"

"سو فیصد تمہارا دوست........ میں تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں......."

"لیکن کیا؟"

"گھبرانے کی بات نہیں.......... میں تمہارے برابر والے کمرے میں رہتا ہوں'
بیماری کا علاج کرانے آیا ہوں اور میرا تعلق حکومت امریکہ کے خفیہ محکمے سے ہے..........
یہاں میں صرف تمہاری وجہ سے داخل ہوا ہوں۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں صرف تمہاری وجہ سے۔ وقت کم ہے اور گفتگو طویل۔ میرے محکمے کو
تمہارے بارے میں جو تفصیل معلوم ہوئی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ تمہاری تحویل میں
جرمنوں کا کوئی خفیہ منصوبہ ہے جسے تم فروخت کرنا چاہتے ہو۔ حکومت برطانیہ نے اس
کی قیمت ایک کروڑ ڈالر لگا دی ہے۔ ہمیں وہ فوٹوگراف بھی مل چکے ہیں جو تم نے
ثبوت کے طور پر پہلے انہیں اور ان کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد حکومت فرانس
کو پیش کئے تھے۔ حکومت امریکہ بھی اس منصوبے کو خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے اور
مجھے اس مشن پر بھیجا گیا ہے۔ ہم تمہیں اس منصوبے کا جو معاوضہ دے سکتے ہیں وہ کوئی
حکومت نہیں دے سکتی۔ اس لئے حکومت فرانس سے بات کرنے کی بجائے ہم سے
کرو۔ تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد میں بھی اس ہسپتال میں
آگیا اور مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ تقریباً ایک ماہ سے صرف تمہارے صحت یاب
ہونے کے انتظار کر رہا تھا اور اگر تم دس بارہ دن اور صحت یاب نہ ہوتے تو پھر تمہیں

یہاں سے اغوا کرلیا جاتا اور ہمارے ڈاکٹر تمہارے لئے کام کرتے۔"

میرا چہرہ تعجب سے سکڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ "کیا ر
سے اس منصوبے کی فروخت کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جناب!" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اپنی طویل ترین بیماری کے باوجود تمہیں یقین ہے کہ تمہارا ساتھی م
ہوگا!"

"یہ سب کچھ کسی ایک آدمی کا معاملہ نہیں ہے جناب! میرے دوسرے سا
سرگرم عمل ہیں اور یقیناً وہ مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں گے!"

"کیا ہوش میں آنے کے بعد تمہارا ان سے رابطہ قائم ہو سکا؟"

"ہاں' وہ میل نرس میرا ساتھی ہے جس نے آپ کو میرے صحت یاب ہو
اطلاع دی ہے۔" اور اس بار اس شخص کے حیران ہونے کی باری تھی۔ پھر وہ منہ
کچھ بڑبڑایا۔ "ظاہر ہے تم لوگ بھی یونہی تو میدان عمل میں نہ کود پڑے ہو
بہرحال میرے دوست! میری اس پیش کش کو قبول کرو۔ امریکی حکومت جنگ پر لا
ڈالر روزانہ خرچ کر رہی ہے۔ وہ اس منصوبے کو خریدنے میں بخل سے کام نہیں
گی اور تمہارے ساتھ کوئی فریب نہیں کیا جائے گا!"

بات میری سمجھ میں آتی تھی۔ تب میں نے کہا۔ "پھر اب مجھے کیا کرنا چا
جناب!"

"کیا تم اس گروہ کے سربراہ ہو؟ یہ سوال میں نے اس لئے کیا ہے کہ تم نے
دونوں جگہ معاملہ کی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم گروہ کے معمولی کار
ہوتے تو اب تک راز کی فروختگی مکمل ہو چکی ہوتی۔"

"آپ کا خیال درست ہے!" میں نے اعتراف کیا۔

"تب میرے دوست! میری درخواست ہے کہ ہمیں بھی آزماؤ اور ہم
تعاون کروں۔ کیا ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر تمہارا معائنہ کر چکے ہیں؟"

"ابھی تک نہیں!!"

"تب تم خود کو تندرست ظاہر نہ کرو۔ صرف کل کا دن گزار دو۔ اس کے

ہم بندوبست کرلیں گے۔ کل رات ہم یہاں سے نکل چلیں گے!"

"ٹھیک ہے میں تم سے تعاون کروں گا!" میں نے جواب دیا۔

"شکریہ! اب میں چلتا ہوں۔" اس نے اندھیرے میں مجھے ٹٹول کر مجھ سے
مصافحہ کیا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ دوسری طرف خطرہ ٹل جانے کا سائرن ہو رہا تھا
لیکن اس کے بعد خیالات نے میرے ذہن پر ایسی یلغار کی کہ دماغ دکھنے لگے۔ مجھے اپنی
کمزوری کا شدید احساس تھا۔ ذہنی قوتیں بھی بحال نہیں ہوئی تھیں۔ میری اس
کوشش نے مجھے نچا کر رکھ دیا تھا لیکن یقین کریں بڑی لذت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں
دنیا کے لئے اسی قدر اہم بننے کا خواہشمند تھا۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد جونہی مجھے فینٹم نظر آیا۔ میں نے اسے ایک خاص
اشارہ کیا اور فینٹم نے گردن ہلادی۔ چنانچہ جب ناشتہ لانے والے اپنی احمقانہ
کارروائیاں کرکے چلے گئے تو فینٹم میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے مختصر تفصیل بتائی اور
کہا۔ "تم فوراً یہ جگہ چھوڑ دو اور کسی اور روپ میں میرا تعاقب کرو...... رات
کو کسی وقت' میرا خیال ہے اس وقت جب کوئی فضائی ہنگامہ شروع ہوا مجھے یہاں سے
لے جانے کی کوشش کی جائے گی!"

"بے فکر رہو استاد! فینٹم نے دور تک پاؤں پھیلا رکھے ہیں!" فینٹم نے مسکراتے
ہوئے کہا اور پھر وہ چلا گیا۔ میں تعجب سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ شخص اس قدر
زبردست صلاحیتوں کا مالک ہے مجھے پہلے علم نہ تھا!

دن عجیب سی کیفیت سے دوچار رہ کر گزارا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو شبہ بھی
نہیں ہونے دیا گیا کہ میرے اندر کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ پھر رات ہو گئی اور میں انتظار
کرتا رہا۔ تقریباً ایک بجے میرا دوست میرے پاس پہنچ گیا۔ رات کی تاریکی میں صرف
قدموں کی آہٹ سے میں اندازہ لگا سکا تھا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "کیا تم سو رہے
ہو؟"

"نہیں' تمہارا انتظار کر رہا تھا!"

"انتظامات مکمل ہیں۔ یہاں کے جاگنے والے گہری نیند سو رہے ہیں آؤ!" اس
نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میں بستر سے نیچے اتر آیا۔ بلاشبہ راہداری سنسان

پڑی تھی' کوئی سازش کی گئی تھی۔ ہم دونوں باہر نکل آئے' روشنیوں کی گنجائش ختم ہوگئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہی ایک وین ہمیں لے کر کسی عمارت میں گئی۔ عمارت اندر سے بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا اور چند ساعت کے بعد دو ڈاکٹر میری تیمارداری کے لئے پہنچ گئے۔ یہ خصوصی دیکھ بھال کی گئی تھی۔ دوسرے دن صبح کو میں فینٹم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اور اس شخص نے جس نے اپنا نام بعد میں لک بتایا تھا' مجھے فینٹم کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"مسٹر فینٹم غالباً آپ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ ہم نے ان مہمان بننے کی درخواست کی اور انہیں یہاں لے آئے۔ ایک بار پھر ہم آپ کو ا دیانتدارانہ تعاون کا یقین دلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اب اس راز کے حصول زیادہ وقت ضائع نہ کریں۔ اگر آپ اپنی حالت بہتر محسوس کر رہے ہیں تو پھر جلد از اس سودے کو مکمل کرلیں۔"

"میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کو ہمارے ساتھ تھوڑا سا سفر کرنا ہوگا۔ ویلی آئی لینڈ میں ہمارا مرکز ایک سب میرین آپ کو مرکز لے جائے گی وہاں آپ سے آخری گفتگو کی جائے اس کے لئے ایک اور درخواست ہے۔" روڈلک نے کہا۔

"جی.......... فرمایئے!"

"بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے بقیہ ساتھیوں کو بھی طلب کرلیں۔ ہم ہر قیمت پر آ سے سودا کرلیں گے۔ اس لئے سودے کے بعد آپ فوری طور پر وہ فلمیں ہمار حوالے کردیں۔"

"مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے مسٹر روڈلک! لیکن براہ کرم اس سلسلہ میں مجبور نہ کریں۔ سودا ہونے کے چند گھنٹوں کے بعد فلمیں آپ کے حوالے کردی جا گی!"

"ٹھیک ہے اگر آپ کو اس طرح اطمینان ہے تو ہم یوں بھی تعاون کریں گے اب سے ایک گھنٹے کے بعد آپ لوگ ویلی آئی لینڈ روانہ ہوجائیں گے' انشاء

کر لئے گئے ہیں۔" روڈلک کے جانے کے بعد فینٹم نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے خاموش کردیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سے ان لوگوں کو کوئی اشارہ مل سکے!

ایک گھنٹے کے بعد ہمیں پھر اسی بند وین میں بٹھا کر بندرگاہ لے جایا گیا۔ مخصوص علاقہ تھا جو صرف امریکیوں کے تصرف میں رہتا تھا۔ یہاں بے شمار جنگی جہاز کھڑے ہوئے تھے۔ ایک اسٹیمر ہمیں ایک آبدوز تک لایا اور آبدوز کے ذریعے ہم ویلی آئی لینڈ روانہ ہوگئے۔ اس سے قبل میں نے اس جزیرے کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔ ممکن ہے کوئی عارضی جنگی جزیرہ ہو جہاں امریکی چھاؤنی ہو لیکن آبدوز کا سفر کافی طویل رہا۔ تقریباً پانچ گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا۔ پھر اچانک کوئی ہنگامہ ہوگیا۔ آبدوز میں سائرن چیخنے لگے اور لوگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ غالباً آبدوز پر حملہ ہوا تھا۔ چند ہی ساعت کے بعد ہولناک دھماکے کان پھاڑنے لگے۔ آبدوز کا عملہ گھبرا گیا۔ انتہائی خوفناک حملہ تھا۔ آبدوز کی رفتار سُست ہوگئی۔ وہ گہرے سمندر میں غوطہ لگا رہی تھی لیکن معلوم ہوا کہ وہاں بارودی سرنگیں "پمٹ مائن" بچھی ہوئی ہیں چنانچہ اسے خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔ آبدوز مصیبت میں پھنس گئی تھی وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ آبدوز کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ چاروں طرف کان پھاڑ دینے والا شور گونج رہا تھا اور میں تقدیر کو کوس رہا تھا کہ کہیں بھی سکون نہیں ہے۔ کوئی ایک پروگرام تو مکمل ہوجائے۔ آبدوز کمانڈر آبدوز کو سطح پر لے جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس سے قبل وہ اتنا سفر کرلینا چاہتا تھا کہ حملہ آوروں کی زد سے دور ہوجائے۔ آبدوز کا یہ خوفناک سفر بہت کم تھا لیکن اس میں ہر لمحہ موت کا لمحہ تھا۔ پھر کمانڈر اسے سطح سمندر پر لایا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا لیکن تقدیر کو ہمارے لئے سمندر کی موت پسند نہیں تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک جزیرہ نظر آیا اور کمانڈر اس طرف چل پڑا۔

لیکن صورت یہاں بھی ہمارے حق میں نہیں تھی۔ زخمی آبدوز اب سمندر میں غوطہ نہیں لگا سکتی تھی اور جزیرے کے عقب سے چھوٹے جنگی جہاز لڑنے والی کشتیوں کے ساتھ آبدوز کی طرف لپکے تھے۔ ان پر جرمن فلیگ لہرا رہے تھے۔ آبدوز کے کمانڈر نے خود کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ آکسیجن ختم ہوجانے کی وجہ سے

آبدوز کا عملہ یونہی بے حال ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم اطمینان سے جرمن قیدی بن گئے
جرمن قید خانوں کی داستانوں سے کون واقف نہیں ہے۔ ہماری تقدیر...
فوجی ہونے کے باوجود ہمیں اس قید کی لذت سے روشناس کرایا۔ آبدوز کے عملے
تمام افراد قیدی بن گئے تھے اور انہیں مختلف حصوں میں بھیج دیا گیا۔ فینٹم اب زیادہ
خاموش رہتا تھا۔ میں بھی اپنی حالت پر غور کرتا تو کلیجہ پھٹنے لگتا۔ کس کو بتاتے کہ
ہیں اور کون ہیں۔ کئی بار فینٹم نے مایوس لہجے میں کہا۔ "استاد! اگر مناسب سمجھو تو
راز کو جرمنوں ہی کے حوالے کرکے ان کی ہمدردیاں حاصل کرو اور اس قید
نجات حاصل کرلو۔"

"نہیں فینٹم......... ان درندہ صفت انسانوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔ یہ
ممکن ہے کہ وہ اس راز کو چرانے کا الزام ہمارے سر ہی تھوپ دیں اور اس
بعد........." فینٹم خاموش ہو گیا تھا۔

ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا۔ عام قیدیوں کی طرح ہم
مشقت لی جاتی تھی۔ پورے دس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا اور ہم تقدیر کو روتے ہو
کام کرتے تھے۔ عام فوجی تو اس مشقت کے عادی تھے لیکن ہم......... وقت تھم
رہا' دن' مہینے' سال' اب تو ہم حساب بھی بھول گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے
زندگی اسی طرح گزاری ہو۔ چہروں پر گھنی الجھی ہوئی داڑھیاں اور مونچھوں کے
بال جنہوں نے ہونٹ ڈھک لئے تھے' دہشت زدہ چہرے اور بس.........
ایک ناسور بن کر رہ گئی تھی۔

ان دنوں ہم سب کو ایک چھوٹے سے جزیرے پر لایا گیا۔ ویران جزیرہ بالکل
آباد تھا۔ ہمیں لانے والوں نے ہمارے لئے ایک عارضی جگہ منتخب کی تھی۔
موقع تھا کہ تین دن گزرنے کے باوجود ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا تھا لیکن.....
ایک صبح جب ہم سو کر جاگے تو ساحل پر لنگر انداز جہاز غائب تھا۔ محافظوں کی
موجود نہیں تھی۔

قیدی پہلے تو خوش ہوئے پھر بدحواس ہو گئے۔ اس ویران جزیرے پر تو
موت سے اور قریب ہو گئی تھی۔ غذا اور پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قیدی

اور چیخنے لگے۔ سب کے چہرے موت کے خوف سے سفید پڑ گئے تھے لیکن تقدیر کے
کھیل' تقریباً آٹھ دن کے بعد جب کہ بہت سے قیدی بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ
کر دم توڑ چکے تھے' دور سے ایک جہاز نظر آیا اور قیدیوں نے اسے متوجہ کرنے کے
لئے سارے جتن کر ڈالے جہاز نے ہمیں دیکھ بھی لیا اور وہ لنگر انداز ہو گیا اور پھر اس
کی کشتیاں ہمیں لینے کے لئے چل پڑیں۔ فرانسیسی جہاز تھا جس کا کپتان ہم سے بہت
اچھی طرح پیش آیا۔ ہمارا حال سن کر اس نے ہمارے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک کیا۔
ہماری ضروریات کی چیزیں فراہم کی گئیں اور پھر ہمیں آرام کی جگہ دے دی گئی۔ جہاز
پر زیادہ افراد نہیں تھے ہمیں اس سکون کی زندگی میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی
اجنبی دنیا میں آ گئے ہوں......... اور ہم دنیا کے ہر مسئلے سے بے خبر کئی گھنٹے گھوڑے
بیچ کر سوئے۔

اسی دن شام کو میں اور فینٹم عرشے پر کھڑے سمندر دیکھ رہے تھے کہ ہماری نگاہ
ایک طویل القامت شخص پر پڑی۔ اس کے بدن پر فوجی وردی تھی اور اس پر لگے
ہوئے نشانات سے وہ امریکی نظر آتا تھا۔ میں نے اور فینٹم نے ایک ہی بات سوچی تھی۔
ہم نے مشورہ کیا اور اس کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے اپنا تعارف میجر گرین کی حیثیت
سے کرایا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم نے میجر گرین کو دوست بنا لیا اور پھر اس کے کیبن
میں شراب کے گھونٹ پیتے ہوئے میں نے اس سے مطلب کی بات کی۔ میں نے اس
امریکی آبدوز کے بارے میں بتایا جو ہمیں ویلی آئی لینڈ لے جا رہی تھی اور راستے میں
تباہ ہو گئی تھی۔ "حکومت امریکہ مجھ سے اس خفیہ جرمن منصوبے کو خریدنا چاہتی ہے
جو میرے پاس محفوظ ہے۔ کیا آپ اس سلسلہ میں میری مدد کرسکتے ہیں؟ میں چاہتا ہوں
کہ کسی تاخیر کے بغیر اب یہ فلمیں امریکہ کے حوالے کردوں!" میری اس بات پر میجر
گرین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شاید آپ ابھی تک حالات سے بے خبر ہیں جناب! جنگ ختم ہو چکی ہے۔
جرمنی دو حصوں میں بٹ گیا ہے اور ہٹلر کا کوئی وجود نہیں رہا ہے۔ وہ فلمیں اب تو بے
مقصد ہوں گی۔ میرا خیال ہے ان کی قیمت دو ڈالر بھی نہیں رہ گئی ہوگی!"

پیرس کے ایک خوبصورت علاقے میں ہمارا اسنیک بار ہے جس کا نام ہم نے

Gentle Men's Den رکھا ہے' یہ خوب چلتا ہے۔ میں اور فنیم شادی شد
اور اسنیک بار دونوں کی شراکت سے چل رہا ہے۔ دراصل جرائم ہمیں راس ن
آئے اس لئے ہم شریف بن گئے ہیں۔ میں نے تسلیم کرلیا ہے کہ میرے اندر کوئی
جرم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے.......... نہ اب میں جرائم پیشہ لوگوں کو مشو
دینے کے قابل رہا ہوں۔ اس لئے یہ ہوٹل کھول کر ہم نے حماقتوں سے توبہ کرلی ہ

☆======☆======☆

تقدیر کے گرداب میں پھنسے ہوئے ایک
باحوصلہ بوڑھے کے عزم و ہمت کی کہانی۔
اسے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی تلاش تھی
اور وہ عداوتوں کے عذاب کا شکار تھا۔

میں اسمگلر کیسے بنا تھا' مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ بس
جوزلینائن کے زیر سایہ ہوش سنبھالا تھا۔ یہ عورت' میں اس کے بارے میں کیا کہوں
برے لوگوں کی آلہ کار ہونے کے باوجود وہ بری عورت نہیں ہے۔ تمام عورتوں
ماؤں کی طرح اس کے سینے میں بھی ممتا سے لبریز دل موجود ہے۔

میں نے جوزلینائن کو کبھی اپنی ماں نہیں سمجھا' کیونکہ وہ مجھے بتاتی رہتی تھی کہ
میری ماں نہیں ہے۔ وہ کہتی تھی کہ وہ خود بھی میرے ماں باپ کے بارے میں
نہیں جانتی۔ میرے بارے میں وہ جو کہانی سناتی تھی وہ بھی عجیب تھی۔ اس کا کہنا تھا
سولہ سال پہلے ایک جوڑے نے اس کے ہوسٹل میں قیام کیا تھا۔ میں اس جوڑے
ساتھ تھا۔ دونوں نہایت شریف اور خوش اخلاق تھے۔ جوزلینائن ان سے گھل
تب انہوں نے اس سے ایک درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں کچھ عرصہ
لئے ان کے لڑکے کی پرورش کی ذمہ داری لے لوں تو وہ نہ صرف اس کے شکر
ہوں گے بلکہ اسے ایک معقول رقم ہر ماہ ادا کرتے رہیں گے۔ بقول جوزلینائن کے
وقت میری عمر تقریباً سات آٹھ سال تھی اور میں اسے بہت پیارا لگا تھا اس نے میری
پرورش کی ذمہ داری قبول کرلی۔ نہ جانے میرے والدین کو کون سا ضروری کام تھا
وہ مجھے اس طرح چھوڑ گئے تھے بہرحال جوزلینائن کے کہنے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سال
تک ایک بڑی رقم ہر ماہ اس کے پاس آتی رہی۔ یہ رقم مختلف ممالک سے آتی تھی۔
اس کے بعد رقم آنا بند ہوگئی۔

پھر نہ میرے والدین واپس آئے اور نہ اس کے بعد کوئی رقم آئی لیکن جوزلینائن
کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ غیر شادی شدہ محبت پرست عورت اب مجھے

خود سے جدا کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ میں جوزلینائن کے زیر سایہ جوان ہوا
جوزلینائن نے مجھے ایک انگلش اسکول میں تعلیم دلائی لیکن میرا نام رشید ہی رہنے دیا۔
بقول اس کے یہی نام میرے والدین نے بتایا تھا۔

میرے خدوخال عجیب ہیں۔ نہ میں مقامی معلوم ہوتا ہوں اور نہ غیر ملکی۔ لوگوں
کو میری نیلی آنکھوں میں یورپ نظر آتا ہے میرے سنہرے بالوں میں امریکہ اور میری
سفید جلد میں پیرس' لیکن اس جلد کے نیچے خالص مشرقی خون دوڑ رہا ہے' یہ خود میرا
اپنا خیال ہے کیونکہ ایشیا سے مجھے اپنوں کی طرح پیار ہے۔

☆======☆======☆

آپ میرے پیشے کو جانے دیں۔ دل کی بات اور ہے میں یہی تو آپ کو بتا رہا ہوں
کہ میں اسمگلر کیوں بنا۔ جوزلینائن بھی اس سلسلے میں مجھے کوئی واضح بات نہیں بتا سکی۔
بس دوران تعلیم ہی مجھے ایک بری عادت پڑ گئی۔ یعنی جوئے کی لت اور یہ عادت خاصی
تکلیف دہ تھی۔ خاص طور سے جوزلینائن کے لئے' وہ بڑی بڑی رقمیں مجھے دیتی تھی
اور میں انہیں ہار کر واپس آجاتا تھا لیکن اس محبت کرنے والی عورت کی پیشانی پر کبھی
شکن نہیں آئی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے وہ مجھے رقمیں مہیا کرتی رہی اور میرا شوق
جاری رہا لیکن آخر کب تک؟ جوزلینائن نے ایک روز بینک کی پاس بک اور چیک بک
میرے سامنے رکھ دی۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں کچھ بھی نہیں رہا تھا میں پریشان
ہوگیا۔ تب مسٹر فرحت رفیق نے مجھے سہارا دیا انہوں نے مجھے پورے بیس ہزار روپے
قرض دیئے اور اس کی شرائط بے حد نرم رکھیں۔ میں ان کا بہت شکرگزار تھا۔ ایسے
لوگ کہاں ملتے ہیں آج کل۔

لیکن یہاں بھی قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ باون پتوں کو مجھ سے للّٰہی بغض
تھا۔ انہوں نے کبھی میرا ساتھ نہیں دیا ہے۔ بیس ہزار کتنے روز چلتے۔ میں منہ لٹکا کر
فرحت رفیق صاحب کے پاس پہنچ گیا لیکن میری توقع کے خلاف فرحت صاحب مجھ سے
ہمدردی سے پیش آئے۔ "میرا خیال ہے رشید میاں تم کارڈ پر بھروسہ کرنا چھوڑ دو۔ یہ
تمہیں راس نہیں آتے۔ کچھ اور کرو۔ اس کے بعد اپنا شوق بھی پورا کرتے رہنا۔"؟

"آپ ہی کچھ بتایئے فرحت صاحب۔ میں تو سخت پریشان ہو چکا ہوں۔ میں اب

کچھ کرنا چاہتا ہوں اور پھر آپ کے بیس ہزار۔"

"تم نے گریجویشن کرلیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

"مس جوزلینائن تو چاہتی ہیں کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں۔"

"تعلیم حاصل کرکے کیا کروگے؟"

"کوئی راستہ نہیں ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"رشید میاں میں تمہارے اندر کچھ خصوصی صلاحیتیں دیکھ رہا ہوں۔ ایم اے کرنے کے بعد تم زیادہ سے زیادہ کسی فرم میں یا کسی سرکاری دفتر میں منیجر یا کوئی افسر عہدہ حاصل کرلوگے۔ عہدہ تمہیں دو ڈھائی ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے دے گا۔ کیا اس سے زندگی گزار سکتے ہو؟"

"مس جوزلینائن نے جس انداز میں میری پرورش کی ہے اس کے تحت تو یہ مشکل ہے جناب۔"

"پھر......... کیا تمہاری پوری زندگی ایک عذاب نہیں بن جائے گی؟"

"حالات تو یہی بتاتے ہیں۔"

"میری رہنمائی قبول کروگے؟"

"میری خوش بختی ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ کہیں تم......... میرے راز سے واقف ہوکر میرے لیے ہی خطرناک نہ بن جاؤ۔"

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"معاشرے میں میرا کیا مقام ہے تم جانتے ہو؟"

"آپ ایک باعزت تاجر شمار ہوتے ہیں۔"

"میرے جیسے بہت سے باعزت تاجر وہی کرتے ہیں مسٹر رشید جو میں کرتا ہوں اور جو تمہیں کرانا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

"اسمگلنگ۔" فرحت رفیق صاحب نے بڑے سکون سے کہا اور میں ان کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ میرے ذہن میں بہت سے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ جوا کھیلا تھا۔ شراب پی تھی۔ دونوں اچھے کام نہیں تھے۔ تیسرا برا کام کرلیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور پھر وہ دونوں کام تو بے مقصد تھے جب کہ یہ کام۔ "کیا آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں گے؟" میں نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"یقیناً! لیکن اس کے سلسلے میں پہلے کچھ مضبوطی کرنا ہوگی۔"

"کیسی مضبوطی؟"

"بہرحال یہ کام خطرناک ہے' تمہاری وجہ سے کسی وقت میں بھی پھنس سکتا ہوں۔ اس لئے ہم ایک سمجھوتہ کریں گے۔ جس کے تحت تم میرے شکنجے میں ہوگے۔ یہ صرف اس لئے ہوگا کہ کبھی تم مجھے دھوکہ نہ دے سکو۔ تمہیں مجھے ایک تحریر دینا ہوگی جو میرے پاس تمہاری امانت کی حیثیت سے رہے گی۔ ابھی تم اس کام پر آمادہ نہیں ہوئے ہو میں نے تم پر بہت بڑا اعتماد کیا ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں بتا دیا تم مجھ پر تھوڑا سا اعتماد کرو۔ اگر ہم دونوں اس سلسلے میں راضی نہ ہوں تو اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا راز رکھیں۔ تم اس کام سے بے تکلفی سے انکار کرسکتے ہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن کام شروع کرنے کے لئے تیار ہو جانے پر تمہیں یہ تحریر ضرور دینا ہوگی۔ اس کے بغیر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔"

"میں تیار ہوں فرحت صاحب۔" میں نے جواب دیا اور فرحت صاحب گردن ہلانے لگے۔ تب انہوں نے ایک تحریر تیار کی۔ جس کے بارے میں بس اتنا بتا دینا کافی ہے کہ میں نے اپنی زندگی' اپنی آزادی ان کے ہاتھ میں دے دی تھی وہ اگر چاہتے تو اس تحریر کے سہارے مجھے جہنم کے آخری سرے تک پہنچا سکتے تھے۔ اس معاہدے کی خوشی میں سب سے پہلے انہوں نے میرے اوپر قرض بیس ہزار روپے معاف کردیئے اور اس کے بعد میرے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لئے۔ یعنی اس وقت تک جب تک میری تربیت ہو۔

☆======☆======☆

یونیورسٹی چھوٹ گئی اور اب کچھ اور ہی کام شروع ہوگیا۔ بلاشبہ فرحت رفیق

صاحب بڑے کام کرنے والوں میں سب سے اچھے انسان تھے۔ میں نے انہیں لاکھوں کما کر دیئے۔ میں ان کی توقعات پر پورا اترا تھا۔ ان لاکھوں میں میرا معقول کمیشن ہوتا تھا اور اس کمیشن سے میں نے اعلیٰ درجے کی ایک کوٹھی تعمیر کرائی میرے پاس کئی قیمتی کاریں ہو گئیں۔ میں نے بھی ایک نام نہاد فرم کھول لی اور فرحت رفیق صاحب کی طرح ایک باعزت انسان بن گیا۔ تب فرحت رفیق صاحب نے میری تحریر مجھے واپس کر دی۔ انہوں نے جو کچھ میرے اوپر خرچ کیا تھا اس کا ہزار گنا وصول کر لیا تھا اور پھر انہوں نے مجھے اپنے طور پر کام کرنے کی آزادی دے دی۔ وہ میرے مربی تھے اور مجھے کاروباری گر بتاتے رہتے تھے۔ ہم دونوں اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ یوں سمجھیں ایک طرح سے میں فرحت رفیق صاحب سے علیحدہ ہونے کے باوجود انہی کے گروہ میں شامل تھا۔ میرا اور ان کا گروہ کبھی کبھی مل کر بھی کام کرتا تھا اور ہم دونوں بغیر کسی چپقلش کے منافع تقسیم کر لیتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے مکمل طور پر قابلِ اعتماد تھے۔ ہاں دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی ہماری چل جاتی تھی۔

لیکن اس کا نتیجہ دوسروں ہی کے حق میں برا نکلتا تھا۔ ہم صاف ستھرا کام کرنے والے تھے۔ شہر' بلکہ ملک میں کئی بڑے اسمگلر بھی تھے جن میں خاص طور سے مسٹر فوزک کا نام لیا جا سکتا تھا۔ مسٹر فوزک آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ اصل نام نہ جانے کیا ہو۔ بہرحال اسے اسمگلروں کا باوا آدم سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے اس کے ساتھ عمدہ تعلقات تھے' لیکن میں نے صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ البتہ کئی بار اس کے ساتھ مل کر بھی کام کرنا پڑا تھا۔ یہ کام فرحت رفیق کے ایما پر ہی ہوتا تھا۔

☆=====☆=====☆

ہاں تو اصل کہانی اس وقت شروع ہوئی' جب میں اپنی ذاتی لانچ پر مال لے کر آ رہا تھا۔ میری لانچ "فردوس" سمندر کے سینے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہم بین الاقوامی سمندر میں تھے اس لئے بے فکری سے سفر جاری تھا۔ احتیاط تو سرحدوں میں داخل ہو کر کرنا پڑتی ہے اور سرحدی فاصلہ اتنا تھا کہ سمندری کشتی پکڑے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں اپنے کیبن میں آرام کرسی میں دراز مزے دار ہوانا سگار کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا اور فضا میں سگار کے دھوئیں کی کشش انگیز خوشبو

بکھری ہوئی تھی۔

دفعتاً فردوس کا کپتان' عبداللہ بیگ میرے کیبن میں داخل ہوا اور میں نے سگار منہ سے نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ "خیریت عبداللہ بیگ؟"

"تقریباً ایک میل دور.......... مشرق میں ایک بادبانی کشتی ڈگمگا رہی ہے صاحب۔ اس پر سے سفید کپڑا ہلایا جا رہا ہے۔ شاید وہ مدد کے طالب ہیں۔ میں آپ کو اطلاع دینے آ گیا۔" عبداللہ بیگ نے کہا۔

"اونہہ.......... جہنم میں جانے دو۔ ہمیں کیا۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا اور عبداللہ بیگ نے گردن ہلا دی۔

"بہت بہتر صاحب۔ میں بس آپ کو اطلاع دینے آ گیا تھا.........." عبداللہ بیگ نے کہا اور گردن جھکا کر باہر نکل گیا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح سگار کے کش لیتا رہا۔

لیکن نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں ایک سفید کپڑا لہرانے لگا۔ کوئی زور زور سے کپڑا ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی۔ زندگی سے مایوس انسان جو زندگی کی آس کھو بیٹھے ہوں۔ لانچ دیکھ کر ان کے دل میں کتنے چراغ جل اٹھے ہوں گے۔ مجھے چراغوں کی ایک قطار نظر آئی۔ ایک ایک کر کے چراغ بجھ رہے تھے ان کی لوؤں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں۔ کیا انسانی زندگی میری نگاہوں میں اس قدر حقیر ہے؟ میں ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر دوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔

"عبداللہ۔ عبداللہ بیگ۔ کہاں ہے وہ کشتی؟" میں عبداللہ بیگ کے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"پیچھے رہ گئی سر۔ بائیں سمت تھی۔"

"رکو۔ لانچ کشتی کی طرف موڑ لو۔" میں نے حکم دیا اور عبداللہ بیگ نے دوسرے خلاصیوں کو ہدایت دی۔ وہ میری اس تبدیلی پر کسی سوال کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے دوربین لے لی' اور اس لانچ کے ڈیک پر پہنچ گیا۔ دور کی وہ کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ اب اس پر سے سفید کپڑا نہیں ہلایا جا رہا تھا۔ تھوڑی

دیر کے بعد لانچ کا رخ بدل گیا اور وہ کشتی کی طرف جانے لگی۔ کشتی والوں کو پھر امید بندھ گئی تھی۔ چنانچہ زور زور سے کپڑا ہلایا جانے لگا۔

میرے ہونٹوں پر نہ جانے کیوں سکون کی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ہم کشتی کے نزدیک پہنچے جا رہے تھے اور میں اس بوڑھے آدمی کو صاف دیکھ سکتا تھا جو اب بھی کپڑا ہلا رہا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے الجھے ہوئے بال' بے ترتیب داڑھی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے لیکن اس کے ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ تھی۔

میں اسے دیکھتا رہا اور لانچ کشتی کے نزدیک پہنچ گئی۔ خلاصی کشتی کو قریب لانے کی تیاریاں کرنے لگے تب لانچ سے ایک رسہ کشتی پر پھینکا گیا اور بوڑھے آدمی نے کسی ماہر کرکٹر کی طرح اسے کیچ کرلیا۔ اس نے رسہ کشتی کے ہک میں پھنسا دیا اور خلاصی کشتی کو لانچ کے قریب کھینچنے لگے۔ کشتی لانچ سے لگ گئی تو رسیوں کی سیڑھی نیچے لٹکا دی گئی اور بوڑھا آدمی انتہائی پھرتی سے سیڑھی چڑھ کر اوپر آگیا اس کا چہرہ دھوپ سے چٹخا ہوا تھا۔ خشک ہونٹ جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اس نے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "کشتی پر میری بیوی بھی موجود ہے میں اسے اوپر لانے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"جاؤ اسے اوپر لاؤ۔" میں نے خلاصیوں کو حکم دیا۔ ہارڈ بورڈ کے سائبان کے نیچے سے وہ ایک بوڑھی عورت کو اٹھا لائے جو غالباً بے ہوش تھی اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر میرے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہوگئے تھے چنانچہ میں نے پوری ہمدردی سے ان کے بارے میں سوچا اور عبداللہ بیگ کو خصوصی ہدایات دیں۔

لانچ پر ہمارا ڈاکٹر موجود تھا۔ اس کے مشوروں سے عورت کو طاقت کے انجکشن دیئے گئے اور نلکی سے اس کے معدے میں گلوکوز داخل کیا جانے لگا۔ بوڑھے آدمی کو بھی گلوکوز پلایا گیا اور پھر انتہائی ہلکی غذا کی تھوڑی مقدار دی گئی۔ لانچ واپس مڑ کر چل پڑی تھی۔ کشتی کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا تھا جس پر بوڑھے آدمی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے لباس تبدیل کرا دیا تھا۔ لانچ پر کوئی عورت نہیں تھی اس لئے

بوڑھی عورت کے لئے زنانہ لباس مہیا نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم ایک گرم چادر اس کے جسم پر لپیٹ دی گئی۔ بوڑھا کافی حد تک پُرسکون ہوگیا تھا گرم گرم کافی کے ایک کپ کے بعد اس کی کیفیت بالکل اعتدال پر آگئی۔ خاصی عمر ہونے کے باوجود وہ چاق و چوبند تھا۔ اس کے انداز سے پھرتیلا پن ظاہر ہوتا تھا۔ چہرے اور جسامت سے سخت مشقت کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

اس وقت تک میں نے بوڑھے آدمی سے کوئی سوال نہیں کیا جب تک کہ اس کی بیوی کی حالت درست نہ ہوگئی۔ لانچ کے ڈاکٹر نے اسے گرم دودھ پلوایا اور پھر نیند کا انجکشن دے دیا اور وہ گہری نیند سوگئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے کیبن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بھی آرام کرنا پسند کرو گے بوڑھے آدمی۔ یا پھر میرے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنا پسند کرو گے؟"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ہم دونوں بھوک اور پیاس کے مریض تھے۔ وہ عورت ہے۔ برداشت نہ کرسکی۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تب میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا کیبن کی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے اسے بھی سامنے بیٹھنے کی پیش کش کی اور وہ شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا۔ تب میں نے اپنے سگار کیس سے ایک قیمتی سگار نکال کر اسے پیش کیا اور اس نے سگار پر اس طرح جھپٹا مارا جیسے چیل گوشت پر۔ سگار اس نے اپنے ہونٹوں میں دبایا اور پھر میں نے اس کا سگار سلگانے کے بعد اپنا سگار بھی سلگا لیا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"ضرور نوجوان۔ سب سے پہلے میں اس امداد پر تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔ غالباً تم اس لانچ کے انچارج ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے خشکی سے انداز میں کہا۔

"شاید لانچ سے پہلے ہمیں نہیں دیکھا جاسکا تھا۔ لانچ آگے بڑھ گئی تو میری ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد میں نے سمجھا کہ شاید زندگی ہمیں قبول نہیں کرنا چاہتی لیکن پھر زندگی لوٹ آئی۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی باتوں پر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"میرا نام لیوہارا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ہوں اور میری بیوی سارتو انڈونیشین ہے کسی زمانے میں، میں ایک بڑا تاجر تھا لیکن اب ایک آوارہ گرد ہوں۔ تقریباً سال سے دنیا گردی کر رہا ہوں۔ ملک ملک مارا مارا پھرتا ہوں۔ یہ کشتی پچھلے سات سے طوفانوں کا مقابلہ کر رہی تھی اس بار اسے کافی نقصان پہنچا یہاں بھی ہم نے تین ماہ سمندر میں گذارے تھے۔ یہ موسم سمندر کی جوانی کا ہے۔ پورے تین ماہ سمندری موجیں کشتی سے پولو کھیلتی رہیں۔ میں ایک تجربے کار ملاح ہوں۔ سمندری موجوں سے لڑنا جانتا ہوں لیکن اس طویل سفر نے خوراک اور پانی کے ذخیرے کردیئے۔ اس کے بعد خاصی مشکلات پیش آئیں۔ اگر تم نہ ملتے تو چند روز اور کسی سے جی لیتے ممکن ہے میری بیوی مرجاتی پھر میں اکیلا زندہ نہ رہ سکتا۔ کیونکہ اب پوری دنیا مجھے بھول گئی ہے۔ صرف میری بیوی مجھے پہچانتی ہے اور ایک تنہا آدمی نہیں رہ سکتا۔ میرا یہی خیال ہے۔"

اس کی کہانی میری توقع کے خلاف نہیں تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

"بس جہاں تم جا رہے ہو۔ وہیں خشکی پر چھوڑ دینا۔ ابھی تو بہت سفر باقی ہے۔ بہت طویل ہے۔" اس نے پھیکی سی ہنسی سے کہا۔

میں اسے دیکھتا رہا بوڑھا بے کس آدمی۔ شاید کاروبار برباد ہو جانے کے بعد نے تنگدستی کی زندگی گزاری ہے لیکن اب بے سروسامانی کے عالم میں اس کی زندگی کیسے گزرے گی۔ کئی منٹ تک میں اس میں الجھا رہا۔ میرا کام ایسا نہیں ہے کہ ایک حساس اور جذباتی انسان کی حیثیت سے زندہ رہ سکوں مجھے تو ایک سخت دل انسان کی زندگی کا عادی بننا پڑا تھا اور اب میں صرف ایک اسمگلر تھا۔ وقت پڑنے پر ہر کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

بوڑھے کی کہانی نے وقتی طور پر مجھے متاثر کیا تھا لیکن یہ تاثر زیادہ دیر میرے ذہن پر قائم نہ رہ سکا۔ میں نے سوچا کہ اس پر یہی احسان کافی ہے کہ میں اسے سمندر کی خطرناک موجوں سے بچا لیا۔ اب اسے خشکی پر چھوڑوں گا۔ اس بعد وہ جانے اور اس کا کام۔ چنانچہ بقیہ سفر طے کرنے کے لئے میں نے اسے اور اس

بیوی کو ایک مناسب جگہ دے دی۔ انڈونیشی عورت کی حالت بھی قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور اس نے احسان مندی کے جذبات سے مجھے دیکھا۔ اس عورت کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مظلومیت کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے دنیا سے بڑی شکایت ہو۔ وہ کئی منٹ مجھے دیکھتی رہی تھی اور میں نے انسانی جذبے کے تحت اسے تسلیاں دی تھیں۔

سفر جاری رہا اور پھر ہماری منزل نزدیک آ گئی۔ میں اب اپنے ملک کی سرحد میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لئے پوری طرح محتاط تھا۔ کسی بھی وقت ایکسائز والوں سے مڈبھیڑ کا اندیشہ تھا، لیکن اپنے متعین کردہ ساحل تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور بغیر کسی حادثے کے ویران ساحل پر اتر گئے۔

لیکن میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا تھا۔ بوڑھا لیوہارا اور اس کی بیوی بہرحال بیوقوف نہیں تھے۔ ہماری حرکتوں سے انہوں نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم اسمگلر ہیں اور بہرحال کسی حد تک اس نے ساحل کا تعین بھی کر لیا تھا۔ یعنی وہ پولیس کو یہاں تک پہنچا سکتا تھا۔ لانچ کا نام بھی اس نے پڑھ لیا ہوگا۔

یہ تو بڑی مشکل پیش آئی۔ اس وقت میں نے یہ باتیں نہیں سوچی تھیں لیکن اب ان کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ بہرحال غلطی میری ہی تھی۔ اس کا کوئی حل سوچنا ہی تھا۔ یوں بھی اس بوڑھے جوڑے کو اس طرح ویران ساحل پر چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔ شہر یہاں سے اٹھارہ بیس میل دور تھا اور اس لئے کسی سواری کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انہیں چھوڑنے سے قبل ان کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی ضرورت بھی تھی۔ آخر انہوں نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی۔

لانچ میں نے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دی اور وہ اسے تیزی سے خالی کرنے لگے۔ میں بوڑھے جوڑے کے ساتھ ایک وین میں آ گیا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے مسٹر لیوہارا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میرے بچے۔ صرف ایک انتظام اور کردو۔ ہمیں کسی ایسی جگہ تک پہنچا دو، جہاں آبادی ہو۔ یہ تمہارا آخری احسان ہوگا۔"

"کیا تم ایک آدھ دن میرے مہمان بننا پسند کرو گے؟" میں نے پوچھا اور بوڑھے نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ پھر لرزتی آواز میں بولا۔

"بہت سادہ سا سوال ہے نوجوان۔ ایک شخص جو ٹھوکریں کھانے جا رہا ہو۔ جس کے سامنے مستقبل کا کوئی راستہ نہ ہو اسے اگر کوئی مہمان بنانے کی بات کرے تو انکار کی کیا گنجائش ہے۔ ممکن ہے اس ایک آدھ دن میں، میں اپنے لئے کوئی راستہ نکال سکوں۔"

بوڑھے کے جواب نے ایک بار پھر میرے دل میں انسانی ہمدردی جگا دی۔ زندگی کے بے بس دور میں داخل ہونے والا یہ جوڑا اس قابل تو نہیں ہے کہ اسے بے دردی سے ٹھوکر ماردی جائے۔ ان کے جسم کے لباس بھی ان کے اپنے نہیں ہیں وہ اس شہر میں بھی اجنبی ہیں۔ وہ پوری طرح ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ٹھیک ہے یہ کا بے مقصد، بے کار سہی لیکن بہرحال اس کی ایک اہمیت ہے۔ ان لوگوں کی کچھ ضرورتیں ہیں جنہیں پوری کر دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے لئے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر میں نے بوڑھے اور عورت کو مخاطب کر کے کہا

"تمہیں تھوڑی دیر اسی گاڑی میں میرا انتظار کرنا ہو گا اس کے بعد ہم چلیں گے، ہاں مستقبل کے بارے میں تم فکر مت کرو میں تمہاری ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں۔"

ان دونوں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہاں ان کی آنکھوں میں تشکر کے آثار ابھرے گہرے ہو گئے تھے۔ میں وین کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر میری نگرانی میں لانچ کا مال گاڑیوں پر لد گیا اور جب میرے آدمی واپس چل پڑے اور لانچ مڑ گئی تب میں اپنی وین میں آ گیا۔ جہاں تھکے ہوئے دو انسان آنکھیں بند کئے سیٹ سے گردن ٹکائے بیٹھے تھے۔ میں نے خاموشی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولے۔ میری نگاہیں سڑک پر تھیں لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچ رہا تھا میں نے بہت سی باتیں ان کے بارے میں سوچیں کیا یہ دونوں پوری دنیا میں تنہا ہیں۔ کیا سیاحت کے شوق نے بوڑھے کو کاروبار ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر نہیں تو کون سے حادثات تھے جنہوں نے اسے آوارہ گردی پر مجبور کر دیا۔

گاڑی کے آئینے میں، میں نے ان دونوں کو دیکھا۔ بے بسی اور بے کسی کی تصویر۔ نڈھال نڈھال سے۔ کیا بڑھاپا اتنا بے بس ہوتا ہے کیا میں بھی بوڑھا ہونے کے بعد....... میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا۔ ہاں میرا بھی تو کوئی نہیں ہے میں بھی تو تنہا ہوں۔ بوڑھے کے ساتھ تو اس کی بیوی بھی ہے لیکن........ لیکن میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ بوڑھی جوزلینائن بھی میری ماں نہیں ہے۔ اس نے صاف صاف بتا دیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ان دونوں کے لئے میرے دل میں گہری ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی کوٹھی پہنچ کر میں نے ان دونوں کے لئے کئی کام کئے اور رات کے کھانے پر بوڑھی عورت اپنے ناپ کے نئے کپڑوں میں اور بوڑھا میرے سوٹ میں خاصے اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی بدحالی دور ہو گئی تھی اور اصل صورت میں ان کی شخصیت ابھر آئی تھی۔

"مسٹر لیوہارا۔ مجھے حیرت ہے آپ نے میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے کہا اور لیوہارا میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے صرف تمہارا نام نہیں معلوم بیٹے۔ باقی اندازے میں نے لگانے کی کوشش کی ہے۔ میں تمہارے بارے میں صرف اتنا جاننا کافی سمجھتا ہوں کہ تم میرے محسن ہو۔"

"میں تمہارے اندازے جاننا پسند کروں گا۔"

"ناگواری محسوس کرو گے۔" بوڑھے نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میرا وعدہ ہے۔" میں نے گہری نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے تم اسمگلر ہو۔ اپنے گروہ کے سربراہ۔ ابتدائی عمر ہونے کی وجہ سے ابھی دل کے کچھ گوشے سرخ ہیں اور انہی سرخ گوشوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تم نے میری مدد کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تمہارے ذہن میں ایک الجھن بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم دونوں کے بارے میں۔ تم شاید ہمارے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو۔" بوڑھے کی باتوں پر میں دنگ رہ گیا۔ بلاشبہ وہ بہترین قیافہ شناس تھا۔

میں نے تعریفی انداز میں گردن ہلائی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہاری [قیافہ] شناسی کا اعتراف کرتا ہوں مسٹر لیوہارا۔ بلاشبہ تمہارے اندازے سوفیصدی درست ہیں۔"

"کوئی کمال نہیں ہے بیٹے۔ عمر کا دیا ہوا تجربہ ہے۔ میری عمر تک پہنچو گے تو تم مجھ سے زیادہ ذہین ثابت ہو گے۔"

"لیکن تمہارا تجربہ مجھے میری الجھن کا حل بھی بتا سکے گا مسٹر لیوہارا۔ بے شک میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ تم مجھ سے پوری طرح واقف ہو گئے ہو اور بہرحال یہ بات میرے خلاف جاتی ہے۔"

بوڑھے نے پھر میری طرف دیکھا اور کسی سوچ میں گم ہو گیا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔ "میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں بیٹے اور پھر میرے محسن ہو۔ یہاں چند روز رہوں گا۔ محنت مزدوری کر کے اتنے پیسے اکٹھا کروں کہ یہاں سے کسی دوسری جگہ جا سکوں۔ تمہارے بارے میں کسی کو بتانے سے مجھے [کیا] نہ ملے گا۔ تاہم اگر تمہارے ذہن میں کوئی پھانس چھپی رہ جاتی ہے تو اس کے صرف [دو] طریقے ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دونوں کو قتل کر کے سمندر میں پھنکوا دو یا کہیں دفن کر دو۔ یا پھر ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچوا دو جہاں ہم تمہارے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہوں۔" بوڑھے نے کہا اور نہ جانے کیوں میرے دل کو ایک دکھ کا احساس ہوا۔ بے شک بے بس لوگ اور کیا کہہ سکتے تھے۔

ایک لمحے میں خاموش رہا۔ پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تمہاری پہلی بات بھی میری سمجھ میں آتی ہے مسٹر لیوہارا۔ بے شک تمہیں میرے بارے میں کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے تو یوں کرو مسٹر لیوہارا کچھ عرصے میرے مہمان رہو پھر جب یہاں سے جانا چاہو تو میں تمہاری مدد کروں گا جو میرے لئے کسی طور تکلیف دہ نہ ہو گی۔"

بوڑھے لیوہارا کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ وہ کچھ نہ بولا اور تھوڑی دیر

کے بعد ہم کھانے کی میز سے اٹھ گئے۔

"مجھے اپنا نام نہیں بتاؤ گے بیٹے؟" بوڑھے نے کہا۔

"رشید۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح ناشتے پر میری ان دونوں سے ملاقات ہوئی۔ میرا یہ ٹور بہت کامیاب رہا تھا۔ تمام کام ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے۔ جس کی رپورٹ مجھے صبح ہی مل گئی تھی۔ اس لئے میرا موڈ بہت خوشگوار تھا یوں بھی میں ہر حال میں خوش و خرم رہنے کا عادی ہوں۔ بوڑھے لیوہارا اور اس کی بیوی سارتوا نے مجھے غور سے دیکھا نہ جانے ان بوڑھی عورت کی آنکھیں کیسی تھیں۔ بس میں ان آنکھوں کی کیفیات کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ ان آنکھوں میں امنڈنے والے جذبات میرے لئے اجنبی تھے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا۔

"ہیلو مسٹر لیوہارا۔ رات کیسی گزری؟" میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آرام دہ۔" بوڑھے نے مسکراتے کہا۔

"مادام لیوہارا زیادہ تر خاموش رہتی ہیں۔" میں نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ خاموش ہے۔ یہ خاموشی دنیا سے احتجاج ہے ایک بے بس احتجاج۔" بوڑھے لیوہارا نے کہا اور ایک دم اداس ہو گیا۔

"میں نہیں سمجھا مسٹر لیوہارا۔" میں نے ناشتہ شروع کرتے ہوئے کہا اور پھر میرے اشارے پر ان دونوں نے بھی ناشتہ شروع کر دیا۔ بوڑھی عورت کی پراسرار آنکھوں میں' میں نے نمی تیرتے ہوئے محسوس کی تھی اور شاید اس نمی کو چھپانے کے لئے ہی وہ خاموشی سے گردن جھکائے ناشتہ کرتی رہی۔ لیوہارا بھی خاموش تھا اور میں ان دونوں کے درمیان خود کو چغد محسوس کر رہا تھا۔ میں بھی خوب انسان ہوں سمندر سے بوڑھی مچھلیوں کا ایک جوڑا پکڑا اور اب اسے شوکیس میں سجائے ہوئے تھا۔ مجھ جیسے انسان کو کہاں فرصت ہے کہ میں غمزدہ انسانوں کا عجائب گھر ترتیب دوں۔ بس میں نے تھوڑی سی انسانی ہمدردی کر دی تھی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو خود ہی میری جان

چھوڑ دینی چاہئے تھی۔

لیکن یہ شاید حماقتوں کا موسم تھا یعنی میں موسم کے اثر سے حماقتیں کر رہا تھا
بڑے میاں بڑھاپے میں بھی سیاحت کے شوقین تھے۔ جسمانی ساخت اور اس عمر
باوجود یہ دم خم ظاہر کرتے تھے کہ نوجوانی میں سیماب صفت ہوں گے۔ بیگم صاحبہ
کسی عشق کا نتیجہ ہوں گی ورنہ سمندر سمندر ماری ماری نہ پھرتیں۔ کاروبار بھی
سیاحت کے چکر میں تباہ ہوا ہوگا اور اب ان کا آخری سہارا یعنی وہ بوڑھی کشتی
ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ چنانچہ اب دوسروں کا سہارا لینے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں
میں نے بلاوجہ اس سہارے کی پیش کش کردی تھی۔

ناشتے کے دوران میں سوچتا رہا۔ خود پر غصہ آرہا تھا دل چاہ رہا تھا کہ بڑے میاں
کی گدی میں ہاتھ ڈالوں، بڑی بی کے بال پکڑوں دونوں کو دروازے تک لے جاؤں
اور پھر اچھل کر ایک ایک لات دونوں کی کمر پر جماؤں تاکہ وہ کم از کم پندرہ فٹ دور
جا گریں۔ اس دوران دروازہ بند کرنے کا موقع بہ آسانی مل جائے گا اور پھر یہ دونوں
دروازے سے اندر گھسنے کی ہمت نہیں کرسکیں گے لیکن اسی خیال کے دوران بڑی بی
کے ہاتھ پر نگاہ پڑی۔

ہاتھوں کی ہلکی سی لرزش، ان کی اوپری جلد پر ابھری ہوئی پتلی پتلی نسیں،
جانے کیسی محسوس ہوئیں۔ ہاں ان کے نقش و نگار طلسمی تھے اگر ان کمزور کلائیوں کو
ناشتہ کرنے سے روک دیا جائے تو وہ بے بسی سے پیچھے ہٹ جائیں گی۔ ان میں اتنی
سکت کہاں ہے جو وہ جدوجہد کرسکیں۔

تو پھر کیا.......... کیا ایسا کرنا مناسب ہے؟ ضمیر میں طوفان اٹھا اور گندے خیالات
کوڑے کرکٹ کی طرح بہہ گئے۔ انسان ایک حقیر کیڑا ہے کمزور بے بس۔ ناتواں۔ ان
کیڑوں کا ایک دوسرے سے تعاون کرنا ضروری ہے۔ ورنہ بے بس کیڑے ختم
ہو جائیں گے اور پھر دنیا میں انسان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

نئے انسان نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف
دیکھنے لگا۔ غلاظت دھل گئی تھی اس لئے دونوں عمر رسیدہ بہت اچھے معلوم ہوئے
میں نے انہیں محبت سے دیکھا اور ابتدائی تعاون کے لئے ذہن میں پروگرام مرتب

کرنے لگا۔ تب اچانک ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ان لوگوں سے ان کی حقیقت تو
معلوم کروں۔ ممکن ہے ان کی کہانی دلچسپ ہو۔ یوں بھی فرصت کا دن تھا۔ آج اور
کوئی کام نہیں تھا چنانچہ ناشتے کے بعد میں نے بوڑھے لیوہارا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا
بوڑھی عورت کا بازو پکڑا اور ان دونوں کو لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔

لیوہارا میری اس اپنائیت پر مسکرا رہا تھا۔ بے بس لوگ دوسروں کی خوشی سے
خوش ہوتے ہیں۔ دوسروں کی سنجیدگی انہیں سنجیدہ کردیتی ہے اور دوسروں کی
مسکراہٹ پر وہ قہقہے لگاتے ہیں۔ تاکہ ان کی کمزور زندگی کے ستون قائم رہیں۔ "بیٹھو
مسٹر لیوہارا۔ آپ بھی بیٹھیں مادام۔ میری بے تکلفی پر آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"اوہ۔ نہیں مسٹر رشید، آپ ایک رحم دل انسان ہیں۔" لیوہارا نے بیٹھتے ہوئے
کہا۔

"اس کے باوجود کہ آپ مجھے برا انسان نہیں سمجھتے۔ میں اب تک آپ کے
بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ سوائے ان چند الفاظ کے جو آپ نے بتائے تھے۔" میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو اپنے بارے میں ایک ایک لفظ بتانے کو تیار ہوں لیکن اول تو یہ
ضروری نہیں تھا کہ میں زبردستی آپ کو اپنی کہانی سنانے بیٹھ جاتا دوسری بات یہ کہ
میری کہانی بس کچھ عجیب ہے۔ ممکن ہے اس کے بعض حصوں پر آپ کو یقین نہ
آئے۔"

"اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ میں آپ کے بارے میں کچھ جانوں۔"
میں نے کہا۔

"تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" بوڑھے لیوہارا نے اپنی بیوی کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے سگار بکس اٹھا کر اس میں سے
ایک سگار لیوہارا کو پیش کیا اور دوسرا خود سلگا کر آرام کرسی میں دراز ہو گیا۔

لیوہارا سگار کے گاڑھے دھوئیں میں اپنے ماضی کی لکیریں تلاش کر رہا تھا پھر اس
کی آواز ابھری۔ "میں بتا چکا ہوں مسٹر رشید کہ میں نسلاً سوئس ہوں۔ میری والدہ نے
میرے لئے موٹر پارٹس کا ایک بہت بڑا اسٹور چھوڑا تھا۔ جس میں تقریباً پچاس سیلزمین

کام کرتے تھے لیکن میں بچپن سے مہم جُو تھا۔ مجھے دنیا کے پُراسرار گوشوں کو دیکھنے
بے پناہ شوق تھا۔ والد صاحب کی زندگی میں بھی اس شوق کی کسی حد تک تکمیل ہو
لیکن بھرپور طریقے سے نہیں، وہ چاہتے تھے کہ میں بزنس میں پوری طرح دلچسپی لو
اور بہرحال ان کی وجہ سے مجھے کچھ خیال کرنا پڑتا تھا لیکن ان کی موت کے بعد
آزادی مل گئی۔ میں نے کاروبار کے لئے ایک آدمی نگران مقرر کیا اور پھر میں
دیکھنے چل پڑا۔ میں نے بہت سے ممالک دیکھے۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ جو
ضرورت ہوتی منگوا لیتا سارتوا سے میری ملاقات جیوکا میں ہوئی۔ ایک ایسا انڈونیشی
جزیرہ جہاں ایک اڑن سانپ نے میری پیشانی پر کاٹ لیا تھا سارتوا کے والد فارسٹ
آفیسر تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ سارتوا نے مجھے دیکھ لیا ورنہ انہی چٹانوں میں میری ہڈیو
کا ڈھانچہ سوکھ جاتا۔ پورے بارہ دن کے بعد مجھے ہوش آیا۔ سارتوا میری معالج تھی
سیدھے سادے خدوخال کی یہ ہمدرد لڑکی میرے دل کو بھا گئی اور بوڑھے فارسٹ
آفیسر نے اپنی دولت میرے حوالے کردی۔ سارتوا بھی دل کی گہرائیوں سے مجھے
چاہنے لگی تھی۔ یوں ہم دونوں نے زندگی کے خوبصورت سفر کا آغاز کیا۔ کافی دن تک
میں انڈونیشیا رہا اور پھر سارتوا کے والد کی اجازت سے اسے لے کر چل پڑا میں شاید
ابھی برسوں اپنے وطن کا رخ نہ کرتا لیکن سارتوا نے میرا وطن دیکھنے کی خواہش ظاہر کی
تھی۔

چنانچہ میں اسے لے کر وطن واپس آگیا۔ وہاں بُرے حالات میرے منتظر تھے۔
منتظم، جسے میں نے اپنے اسٹور کا نگراں مقرر کیا تھا لاکھوں روپے کا غبن کرکے اسے
جوئے میں ہار چکا تھا۔ اسٹور میں اب تھوڑا سا مال اور صرف چند سیلز مین بچے تھے۔
ایسی حالت تھی جسے میں سنبھال ہی نہیں سکتا تھا۔ منتظم میرے قدموں میں گر پڑا۔ اس
نے مجھے برباد کردیا تھا۔ بہرحال میں نے اسے انسان سمجھا۔ اسے برباد کرنے سے مجھے
کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے معاف کردیا۔

لیکن اب اسٹور کو سنبھالنے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی اس پر کافی واجبات
تھے۔ چنانچہ میں نے اسٹور کا بچا کھچا مال مع اس کی عمارت کے فروخت کرکے اس کے
واجبات ادا کئے اور میں اچھی خاصی پوزیشن کے آدمی سے بالکل فقیر ہوگیا لیکن چونکہ

جوان تھا۔ ہر قسم کے حالات سے لڑنے کی ہمت رکھتا تھا میں نے سنجیدگی سے غور
کرنا شروع کردیا۔ بچپن سے فطرت ایسی تھی کہ ملازمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا
مجھے صرف سارتوا کی فکر تھی۔ جو میرے پاس آکر ذرا بھی عیش نہیں کرسکی تھی اور
معاشی فکروں میں مبتلا ہوگئی تھی۔ میں نے جس پیمانے پر زندگی گذاری تھی وہ بہت
بلند تھا لیکن آخر کار اب میں وہ پوزیشن کیسے حاصل کرسکتا ہوں۔ کون سی ترکیب سے
میں اپنی پرانی زندگی کو حاصل کرسکوں گا۔ میری سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آسکا۔ کوئی
ایسی صورت نہیں تھی کہ میں ایک دم کوئی بڑی دولت حاصل کرلوں اور پھر کافی غور
وخوض کے بعد میں نے ایک فیصلہ کیا۔ سیاحت نے میرا مستقبل برباد کیا تھا۔ اب
یہ بات ہی میرا مستقبل بنائے گی میں نے مہم جُوئی میں خزانے کی تلاش کے بارے میں
بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو صرف ایڈونچر کا شائق تھا۔ اکثر دوران سیاحت مجھے ایسے
لوگ ٹکرائے تھے جو خزانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ انہوں نے میری ذہانت
سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے
مہمات کی تیاریاں شروع کردیں۔ لے دے کے اب میرے پاس صرف وہ مکان رہ گیا
جس میں، میں رہتا تھا چنانچہ تھوڑے سے غوروخوض کے بعد میں نے اسے فروخت
کردیا۔ سارتوا پریشان تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں کیا کررہا ہوں لیکن میں اسے کیا
بتاتا۔ میں جو کچھ کرنے جارہا تھا اس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ بس بھنور میں ہاتھ پاؤں
مارنے والی بات تھی۔

تو میرے دوست۔ میں نے اپنا وطن چھوڑ دیا۔ اب یہاں میرے لئے کچھ نہیں تھا
لیکن میرے لئے تو کہیں بھی کچھ نہیں تھا بس موہوم امیدوں کے سہارے میں مستقبل
تابناک بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں مختلف شہروں اور ملکوں میں گھومتا ہوا
آخر بیروت پہنچ گیا۔ بیروت کے سوق الشیخ میں قیام کرتے ہوئے مجھے ٹوری ٹاک یاد
آگیا وہ بدہیئت انسان جو مجھے اس ہوٹل میں ملا تھا لیکن اس وقت جب میرا سورج
بلندی پر جگمگا رہا تھا، وہ ایک مقامی ملاح تھا۔ انتہائی بے جگر اور خطرناک آدمی۔ اس
کے پاس ایک بہت پرانے سیاح کی ڈائری کے چند اوراق تھے جن میں بنی ہوئی آڑی
ترچھی لکیروں میں اسے کسی خزانے کا نقشہ نظر آتا تھا۔ وہ کئی سیاحوں سے مل کر اس

نقشے کے بارے میں گفتگو کر چکا تھا لیکن کسی نے اس کی بات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اسے کسی خزانے کا نقشہ ماننے کو تیار نہیں تھے اور اگر یہ کسی خزانے کا نقشہ تھا بھی تو وہ خزانہ قیامت تک دستیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نقشہ نہایت مبہم تھا اس سے کوئی بات واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرے سیاحوں کی طرح میں نے بھی ٹوری ٹاک کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور وہ میری طرف سے بھی مایوس ہو گیا۔ بہرحال بیروت کے قیام کے دوران وہ کئی بار مجھ سے ملا تھا۔ پھر میں وہاں سے چلا آیا اور اس کے بعد میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن آج سوق الشیخ میں قیام کے دوران وہ مجھے پھر یاد آ گیا۔ اس سے ملاقات کو کافی عرصہ گذر گیا تھا لیکن پھر بھی دل نے کہا کہ میں اسے تلاش کروں اور اب میں اس کاغذ پر بھی پوری توجہ دینے کو تیار تھا۔

میں نے اسے تلاش کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ساحلی علاقے میں اس کا ایک بوسیدہ سا مکان تھا۔ سارا تو کو ہوٹل چھوڑ کر میں اس کی تلاش میں چل پڑا اور ساحلی علاقے میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کا مکان تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا دو منزلہ ہوٹل کھڑا تھا۔ میں نے ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے خونخوار چوکیدار سے ٹوری ٹاک کے بارے میں پوچھا اور چوکیدار نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ "تمہیں ٹوری ٹاک سے کیا کام ہے؟" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"وہ میرا پرانا دوست ہے۔ یقیناً مجھ سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"آؤ۔" چوکیدار نے کہا اور مجھے ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ اس علاقے کی حالت اب بھی نہیں بدلی تھی' ویسے ہی بوسیدہ مکانات تھے جیسے میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ کیلوں جڑے ایک چوبی دروازے پر پہنچ کر چوکیدار نے دوبار دستک دی اور اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا۔ چوکیدار نے گردن سے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

باہر سے بوسیدہ نظر آنے والے اس مکان کا اندرونی حصہ بہت اچھا تھا وہ مجھے ایک ہال میں لے گیا جہاں بوریاں چنی ہوئی تھیں اور پھر اس نے کسی کو آواز دی۔

"اور ہال کے دوسرے دروازے سے ایک خطرناک شکل آدمی باہر نکل آیا۔ بہت قوی ہیکل تھا اور اس نے چست لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر میرے ساتھ آنے والے چوکیدار کی طرف۔ "کون ہے یہ؟" اس نے پوچھا۔

"مسٹر ٹوری ٹاک کا بہت پرانا دوست۔" چوکیدار نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا اور اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں خطرناک لوگوں میں آ پھنسا تھا۔

"ہوں۔" قوی ہیکل یاسر نے پھر مجھے گھورا۔ "حقیقت کیا ہے؟" اس کا سوال مجھ سے تھا لیکن چوکیدار نے اس کا جواب دیا۔

"سرکاری جاسوس لیکن بشرطیکہ یہ اس کا اعتراف خود ہی کر لے' سرکاری جاسوس ہی مسٹر ٹوری ٹاک کے پرانے دوست بن کر آتے ہیں۔"

"میں ابھی معلوم کئے لیتا ہوں۔" قوی ہیکل آدمی میری طرف بڑھا اور میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں دوستو۔ تم غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو اگر تم ٹوری ٹاک کو جانتے ہو تو مجھے اس کے سامنے لے چلو۔ اگر وہ پہچاننے سے انکار کر دے تو بے شک تم مجھے گولی مار دینا۔"

قوی ہیکل آدمی رک گیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے چوکیدار کی طرف دیکھنے لگا۔ اب چوکیدار کو بھی عقل آ گئی تھی اس نے پرُخیال انداز میں کہا۔ "یہ مقامی بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"سوئٹزر لینڈ سے آیا ہوں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"ہوں۔ یہی چیز تمہیں بچاتی ہے۔ بہرحال ہمیں تمہاری شرط منظور ہے۔ آؤ لیکن کوئی حرکت کی تو............" چوکیدار نے کہا اور مجھے اس مکان سے نکال لایا۔ اس بار دوسرا آدمی بھی میرے ساتھ تھا اور ہم ایک بند گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ میں سخت حیران تھا ایک معمولی سا ملاح اس قدر اہمیت کیسے اختیار کر گیا تھا۔ ٹوری ٹاک خطرناک ضرور تھا لیکن وہ اس اہمیت کا مالک ہو گا مجھے گمان بھی نہیں تھا۔

نہ جانے سفر کتنا طویل تھا۔ خیالات میں، مجھے احساس ہی نہیں ہوا بہرحال مجھے ایک عمارت کے کمپاؤنڈ میں اتارا گیا تھا اور پھر دونوں خطرناک آدمی مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ایک خوبصورت ہال کے ایک صوفے پر ٹوری ٹاک بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھے اس کے سامنے کردیا اور ٹوری ٹاک مجھے دیکھنے لگا۔ بے شک ٹوری ٹاک میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں اب وہ میلے کچیلے لباس والا بدبخت خلاصی نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اس کے جسم پر عمدہ تراش کا سوٹ تھا اور انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بھاری آواز میں ان لوگوں سے پوچھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اگر اس بدلے ہوئے آدمی نے بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو؟

"یہ شخص خود کو آپ کا دوست بتاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر آپ اسے پہچاننے سے انکار کریں تو اسے گولی مار دی جائے۔" طویل القامت یاسر نے کہا اور ٹوری ٹاک کھڑا ہوگیا اور پھر اچانک اس نے کہا۔ "اوہ۔ یہ تم ہو۔ لیوہارا۔ کیا یہ تم ہی ہو۔"

"خدا کا شکر ہے ٹوری تم نے تو مجھے مروا ہی دیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم موٹے بھی تو خوب ہوگئے ہو لیوہارا۔" اس نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا دونوں آدمی معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ تب ٹوری ٹاک ان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بھاگ جاؤ۔ یہ میرا دوست ہے۔" اور وہ دونوں گردن جھکا کر الٹے قدموں لوٹ گئے۔

"آؤ بیٹھو لیوہارا۔ بیروت کب آئے؟"

"ایک ہفتہ قبل۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"وہیں۔ جہاں پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ سوق الشیخ۔" ٹوری ٹاک نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن

"لیکن اب میں حیران ہوں۔ سوق الشیخ میں ملنے والے ٹوری ٹاک نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔"

"اوہو۔ کیوں کیوں میری جان؟" اس نے دوسرے گلاس میں میرے لئے وہسکی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ اس وقت کے اور اب کے ٹوری میں بہت فرق ہے۔"

"اوہ دن ضرور بدلتے ہیں میرے دوست۔" اس نے میرے گلاس سے گلاس ٹکرا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت کا سادہ دل ملاح بھی حقیقت تھا اور آج کا ٹوری بھی ایک حقیقت ہے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم اپنی مہم میں کامیاب ہوگئے؟" میں نے خلوص سے کہا۔

"مہم؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔ کیا تمہارا خزانہ تمہیں مل گیا؟"

"خزانہ؟" اس نے حسرت آمیز انداز میں کہا۔ "کاش میں وہ خزانہ حاصل کرسکتا۔"

"اوہ۔ تو گویا۔"

"ہاں دوست۔ آج بھی میں خزانہ حاصل کرنے کی وہی لگن رکھتا ہوں جو اس وقت تھی۔ تم اس خزانے کا تصور نہیں کرسکتے۔ وہ معمولی نہیں ہے اتنا ہے کہ میں سارا بیروت خرید سکتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر اچانک سنبھل گیا اور ایک بے معنی ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے سادگی سے اس سے وہی سوال کردیا جس کا وہ متوقع تھا۔ "تمہیں اس کے بارے میں اتنے وثوق سے کیسے معلوم ہے؟" میری اس بات کا اس نے کئی منٹ تک کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے شراب کے گھونٹ لیتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بہت سی باتیں قبل از وقت نہیں بتائی جاتیں۔"

"اوہ۔" میں نے گردن ہلائی۔ "میں بھی اصرار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"ایک اچھے دوست کی یہی نشانی ہے لیکن سنو۔ میری پیش کش اب بھی برقرا
ہے۔ اگر تم سنجیدگی سے ان کاغذات پر غور کرنے کو تیار ہو تو ہم گفتگو از سرِ نو شرو
کر سکتے ہیں۔"

"میں اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں دوست۔" میں نے صاف گوئی سے کام
اور وہ اچھل پڑا۔ "کیا مطلب؟" اس نے خوشی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے دوست۔ میں ایک صاف گو آدمی ہوں۔ اس وقت جب تم نے
سے اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ میں تنہا تھا خوش حال تھا میں نے تمہاری باتوں پر تو
نہیں دی لیکن اب صورت حال دوسری ہے۔ اب میں ایک قلاش انسان ہوں۔ ا
آخری پونجی یعنی اپنی رہائش گاہ فروخت کر کے یہاں تک پہنچا ہوں اور اب معقو
شرائط پر تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں۔"

"اوہ۔ مجھے افسوس ہوا لیکن فکر کی کیا بات ہے۔ اس وقت کے معمولی خلاصی یع
ٹوری ٹاک کو تم نے اپنا بہترین دوست گردانا تھا آج تم میرے وہی بہترین دوست ہو
تمہارے دوست کے پاس بہت کچھ ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہا
ہم خزانے کے بارے میں سنجیدگی سے پروگرام بنائیں گے کیا تم یقین کرو گے میرے
دوست کہ اس خزانے کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے لیکن معذرت خواہ ہوں ک
ابھی تمہیں تفصیلات نہیں بتاؤں گا۔ اس لئے سب سے پہلا کام یہ کرو کہ سوق الشیخ
سے اپنا سامان یہاں منگوالو۔"

"وہاں میری بیوی بھی موجود ہے۔"

"بیوی؟" وہ چونک پڑا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "ہوں تو یہ بات صحیح ہے کہ عورت
کے چکر میں پڑ کر اچھے اچھے برباد ہو گئے ہیں لیکن اس کا بھی قائل ہوں کہ عورت کا
قرب پا کر بڑے بڑے بودم' باصلاحیت ہو جاتے ہیں۔ بہرحال فکر کی کیا بات ہے' سامان
کے ساتھ ساتھ بیوی بھی آجائے گی۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور کسی کو بلانے کے
لئے گھنٹی بجادی۔

بہرحال مختصر یہ کہ سارتو بھی وہیں آگئی اور ہم ٹوری ٹاک کے ساتھ مقیم
ہو گئے۔ دو تین دن تک ہم نے صرف آرام کیا۔ ٹوری ٹاک باہر نہیں نکلتا تھا اور اسا

مجھ سے ایک درخواست بھی کی تھی وہ یہ کہ کسی پبلک مقام پر اس کا نام نہ لیا
جائے۔

☆======☆======☆

تیسری شام جب وہ اپنی خوبصورت کوٹھی کے لان میں بیٹھا میرے ساتھ چائے پی
رہا تھا میں نے اس سے یہ سوال کر ہی دیا۔ "تمہاری شخصیت کافی پُراسرار ہے ٹوری تم
باہر کیوں نہیں نکلتے؟"

"میں تمہارے اسی سوال کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے تم نے خود بھی اندازہ
لگانے کی کوشش کی ہوگی۔"

"سوچا ضرور ہے لیکن اس سلسلے میں تم سے براہِ راست میں سوال کر سکتا ہوں تو
اپنا سر کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "بے شک تمہارے اندر ایک
اچھے دوست کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ یہ جواب تمہاری نیک نیتی سے تعلق رکھتا ہے
لیکن میرے دوست میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ وقت آنے پر دوسری باتیں بھی
تمہیں بتادوں گا۔ فی الحال اس درمیانی وقفے کی کہانی سنو جو ہماری اور تمہاری ملاقات
کا ہے اور جس کے بعد تم میری زندگی میں یہ تبدیلیاں دیکھ رہے ہو۔ بچپن کا کچھ دور
میں نے خوشحال لوگوں کی طرح گزارا یہ وہ دور تھا جب بقول میری ماں کے میرا باپ
زندہ تھا' پھر میرا باپ مرگیا اور ہمارے اوپر برا وقت آگیا۔ اس برے وقت میں کچھ
عرصے کے بعد میری ماں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ ماں کی موت نہایت کس مپرسی
میں ہوئی تھی۔ یہ بے بسی میرے دل پر نقش ہوگئی۔ میں نے حالات سے جنگ کرنا چاہی
لیکن میرے پاس وسائل نہیں تھے۔ میں خوابوں کا سہارا لینے لگا اور پھر وہ کاغذات
میرے ہاتھ لگ گئے۔ میں ایک معمولی ملاح بن گیا تھا لیکن میرے عزائم خطرناک تھے۔
نہ جانے کیوں' لوگوں نے ان کاغذات میں دلچسپی نہیں لی' جنہوں نے دلچسپی لی وہ انہیں
سمجھ ہی نہیں سکے اور میری خزانہ حاصل کرنے کی خواہش حسرت بن گئی لیکن میں پھر
بھی دولت مند بننا چاہتا تھا اور پھر میری ملاقات ایک اسمگلر سے ہوگئی۔ اس نے مجھے
اسمگلنگ کے گُر سکھائے اور میری زندگی بدل گئی۔ تو میرے دوست اب میں ایک

اسمگلر ہوں لیکن بدقسمتی ہے' لبنان کی پولیس میرے بارے میں مکمل سراغ پاگئی ہے
کیونکہ اس دوران آبکاری کے چھ آدمی میرے ہاتھوں ہلاک ہوچکے ہیں میرے لئے
حکومت کے احکامات ہیں کہ مجھے جہاں دیکھا جائے گولی مار کر ہلاک کردیا جائے۔

اس کے باوجود میں زندہ ہوں اور بے دھڑک کام کررہا ہوں۔ میں خود بھی یہاں
سے نکل جانا چاہتا ہوں کیونکہ اب یہاں کی فضا میرے لئے سازگار نہیں ہے لیکن
میرے سامنے کوئی نظریہ نہیں ہے اگر میری مشکل حل کرنے پر تیار ہو جاؤ تو میں اپنے
پورے وسائل صرف کرکے تمہارے ساتھ خزانے کی تلاش پر چلنے کے لئے تیار
ہوں۔" ٹوری ٹاک خاموش ہوگیا۔

میں اس کے بارے میں غور کرنے لگا درحقیقت اس کے ساتھ رہ کر خود میری
زندگی بھی خطرے میں تھی۔ مجھے بھی اس کا ساتھی سمجھا جاسکتا تھا لیکن خطرات کے بغیر
تو زندگی ہی محال ہے اور پھر میں جس دور سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں تمام
خطرات مول لوں چنانچہ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں تمہارا بھرپور ساتھ
دینے پر تیار ہوں ٹوری ٹاک اور یقین کرو کہ اس خزانے کا وجود ہے تو ہم اسے ضرور
حاصل کرلیں گے۔"

"جہاں تک خزانے کے وجود کا سوال ہے تو یوں سمجھو کہ وہ اسی طرح ہے جیسے
میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

"اگر تمہیں اتنا یقین ہے تو پھر کاغذات میرے حوالے کردو۔"

اس رات میں نے سارتوا کو اس سلسلے میں پوری تفصیل سمجھائی اور سارتوا
تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ "تمہیں یقین ہے لیوہارا' تم اس نقشے کو سمجھ سکو گے؟" اس
نے سوال کیا۔

"سارتوا' سنو میری زندگی' میں نے تم سے محبت کی ہے اور تمہاری طرف سے
میری محبت کا بھرپور جواب ملا ہے۔ میری روح' میں تمہارے لئے کچھ بھی تو نہیں
کرسکا۔ میں نے تمہارے لئے حسین زندگی کے خواب دیکھے تھے' لیکن بدقسمتی سے میرا
ایک بھی خواب پورا نہیں ہوسکا۔ تاہم' نہ میں خود سے مایوس ہوں' نہ تمہاری محبت
سے' چنانچہ میں نے اپنی اور تمہاری محبت کو آزمانے کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میں سارتوا

مستقبل کو اپنی صلاحیتوں سے منسلک کردوں گا اور میری محبت میرے ذہن میں وہ
روشنی پیدا کردے گی جس کے سہارے میں اس نقشے کو سمجھ لوں گا۔"

"خدا کرے میری محبت کامیاب ہو!" سارتوا نے کہا۔

"بس چند مسائل ہیں!"

"وہ کیا؟" سارتوا نے پوچھا۔

"میں تمہارے بارے میں غور کررہا ہوں۔ اگر میں تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں تو کیا
تمہیں تکلیف ہوگی؟"

سارتوا تڑپ اٹھی۔ "یہ تم نے کیا کہا.......... لیوہارا! کیا میں یہاں تنہا رہوں
گی؟" اس نے پریشانی سے کہا۔

"میری محبت تمہارے ساتھ ہوگی سارتوا!"

"نہیں لیوہارا! نہیں مجھے ایسی دولت کی ضرورت نہیں ہے جس کے لئے تم سے
جدا ہونا پڑے۔ میں بالکل تیار نہیں ہوں۔ مجھے ایک غریب انسان کی زندگی پسند ہے۔
ہاں اگر تم مجھے بھی ساتھ لے چلو تو پھر میں تیار ہوں۔ دوسری صورت مجھے بالکل منظور
نہیں ہے اور لیوہارا.......... اب تو.......... اب تو.......... میں تم سے بالکل جدا
نہیں رہ سکتی!" اس نے عجیب انداز سے کہا اور اس کے چہرے پر شرم کی لکیریں اجاگر
ہوگئیں۔

"اب تو' سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ہماری.......... ہماری خوشیوں میں اضافہ ہونے والا ہے لیوہارا۔"
سارتوا نے بدستور شرماتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں سمجھا سارتوا!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو!" سارتوا نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

"تم سمجھادو سارتوا.......... پلیز!" میں نے کہا۔

"ہم دونوں.......... ہم دونوں کو.......... کسی ننھے مہمان کی آمد کا منتظر رہنا
ہے!" سارتوا نے کہا اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

"سچ سارتوا؟" میں نے خوشی سے کہا۔

"ہاں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں خوش بھی تھا اور متفکر بھی۔ درحقیقت ایسے حالات میں مجھے سارتوا کو تنہا بھی نہیں چھوڑنا چاہئے تھا اور اسے ساتھ لے جانا بھی خاصا مشکل تھا۔ ساری رات میں اسی الجھن میں رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ سارتوا کو ساتھ ہی رکھوں گا' جو کچھ بھی ہو گا' دیکھا جائے گا اور اس فیصلے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے دن میں نے ٹوری ٹاک سے بھی اس بارے میں گفتگو کی اور اس نے فراخدلی سے کہا۔ "ٹھیک ہے مسٹر لیوہارا! سفر کے انتظامات نہایت مکمل ہوں گے۔ اس میں مسز لیوہارا کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ بڑی خوشی سے انہیں ساتھ لے جا سکتے ہیں۔" میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا' میں بھی سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے ٹوری ٹاک کو یہ بات پسند نہ ہو۔

پھر اسی شام اپنے کمرے میں ٹوری ٹاک نے ڈائری سے پھاڑے ہوئے اوراق میرے سامنے رکھ دیئے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل بھی میں نے یہ کاغذ دیکھے تھے لیکن ان کی طرف اس قدر توجہ نہیں دی تھی۔ آج میں انہیں ایک نئے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے ساتھ انگریزی کے حروف بھی لکھے ہوئے تھے۔ یہ حروف ایک خاص ترتیب سے تھے۔ میں ان پر غور کرتا رہا اور ٹوری ٹاک میری شکل دیکھتا رہا۔ کافی دیر کے بعد میں نے گردن اٹھائی۔ میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی تھی۔

میں نے ٹوری ٹاک کی طرف دیکھا' اور وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ شہر بھر کی دکانوں سے دنیا کے بارے میں جس قدر نقشے ملیں خرید لائیں۔ الگ الگ ملکوں کے نقشے اور ان کے شہروں کی تفصیلات بھی مل جائیں تو بہتر ہے!"

"کیا تم کوئی اندازہ لگا سکتے ہو' لیوہارا؟"

"ہاں میرے دوست! اگر قسمت نے ساتھ دیا تو میں ان لکیروں کا راز معلوم کرلوں گا۔"

"تب میں یہ کام کرلیتا ہوں!" ٹوری ٹاک نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

دوسرے دن میرے سامنے نقشوں کا انبار عظیم لگ گیا۔ ایک کمرہ میرے لئے مخصوص

ردیا گیا اور میں نے نقشے دیواروں پر آویزاں کر دیئے۔ پہلے دن کے چار گھنٹوں میں' نے ایک لائن کا راز حل کرلیا۔ مثلاً لکیروں کی ابتدا لفظ "این" سے ہوتی تھی۔ ہچھ میں نے نقشوں کی مدد سے این سے بننے والے تمام ملک اور شہر دیکھے۔ پھر اس ر دیکھا جو ڈبلیو پر جاکر ختم ہوتی تھی اور ڈبلیو کے بعد سے دوسری لکیر چلتی تھی' جو ں اور لفظ پر ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے ڈبلیو سے شروع ہونے والے شہروں اور ں کی فہرست بنائی اور اس سیدھی لکیر سے موازنہ کیا۔ دنیا کے نقشے میری رہنمائی رہے تھے۔ یعنی فرض کرو۔ این سے نیوزی لینڈ بنا' تو میں نے اندازہ کرلیا کہ ے سے اس ملک تک کوئی سیدھا راستہ ہے جو ڈبلیو سے بنتا ہو۔ یہاں تک کہ بہت ملکوں کے بعد مجھے ایسے دو ملک مل گئے جو سیدھے راستے میں تھے اور میں نے ں نوٹ کرلیا۔

خاصا مشکل کام تھا جسے میں نہایت جانفشانی سے کر رہا تھا۔ اس دوران مجھے ہر ت مہیا تھی۔ دن بھر نقشوں میں سر کھپاتا اور رات کو سارتوا کی دلچسپ باتوں میں جاتا۔ جو ننھے مہمان کی آمد کے خیال میں ڈوبی مسرت آمیز گفتگو کرتی رہتی تھی۔ ے پورے دن میں نے اس کام میں صرف کئے اور بالآخر میں نے ایک خاکہ تیار ں لیا۔ بڑا قیمتی نقشہ تھا' جسے شاید میرے علاوہ اور کوئی ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

☆======☆======☆

پندرھویں دن میں نے ٹوری ٹاک کو کامیابی کی خوش خبری سنائی۔ وہ بڑے ب
سے انتظار کررہا تھا اور اس دوران اس نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں پوچھا تھا
اس خوشخبری پر وہ دیوانہ ہوگیا۔ میں نے کمرے میں بند ہو کر ڈائری کے اوراق ا
کے سامنے رکھے اور اپنا بنایا ہوا خاکہ بھی ایک طرف رکھ کر اسے تفصیل سے سمجھا
لگا۔ وہ بہت غور سے ایک ایک تفصیل سن رہا تھا۔ یہ ڈائری کے سات صفحات
تفصیل تھی۔ آخری صفحہ اس ملک کے شہروں سے متعلق تھا لیکن میرے بنائے ہو
نقشے کے آخری ملک کا نام سن کر ٹوری ٹاک کی رنگت بدل گئی۔ "نیواریکا......
نیواریکا.......... نیواریکا!" وہ پاگلوں کے انداز میں بڑبڑایا اور پھر اٹھ کر مجھ
لپٹ گیا۔ وہ مجھے پُرجوش انداز میں زور زور سے بھینچ رہا تھا۔ "نیواریکا آہ میرے
دوست! میرا خیال ہے تم صحیح راستے پر چل رہے ہو' میرے باپ کی لاش بھی نیوار
سے ہی آئی تھی۔ ہاں میری ماں نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"میں نہیں سمجھا!" میں نے حیرانی سے کہا' اور وہ اچھل پڑا۔ پھر وہ اجنبی نگاہو
سے مجھے دیکھنے لگا اور پھر اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"تمہارے باپ کی لاش کا کیا قصہ ہے!" میں نے پھر پوچھا اور وہ مجھے خاموشی
سے گھورتا رہا۔ تب میرے ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا اور میں نے گردن ہلا
ہوئے کہا۔ "ٹوری ٹاک! میرے دوست کیا تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر
ہو اگر ایسا ہے تو پھر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہمارے درمیان خلوص نہیں ہے ا
ایسی شکل میں..........."

لیکن اس نے مجھے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا او
بولا۔ "نہیں........... نہیں کوئی سخت بات مت کہنا۔ ہاں تمہارا خیال درست ہے"

نے تم سے بہت کچھ چھپایا ہے اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اگر میں تم سے کچھ نہ
چھپاتا تو تم جیسے آدمی کا اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔"

میں خاموشی سے ٹوری ٹاک کی شکل دیکھتا رہا۔

"میں تمہیں اپنی کہانی سنا چکا ہوں۔ اس میں مبالغہ نہیں تھا لیکن اس میں سے کچھ
واقعات میں نے حذف کردیئے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ ڈائری جس کے اوراق میں نے
پھاڑے ہیں خود میرے باپ کی تھی۔ جو اس نے بڑی احتیاط سے میری ماں کو روانہ کی
تھی۔ ہاں میرا باپ بحری قزاق تھا۔ وہ نیواریکا کے ساحلی علاقوں میں سفید زلزلے کے
نام سے مشہور تھا۔ اس نے بے پناہ دولت جمع کی تھی لیکن پھر اس کے گروہ میں پھوٹ
پڑگئی اور اپنے ہی ساتھیوں کی مخبری کی وجہ سے وہ نیواریکا میں مارا گیا۔ اس کی لاش
وطن بھیج دی گئی چونکہ وہ ایک بین الاقوامی مجرم تھا۔ سب کی نفرت کا شکار۔ ہمارے
گھر کی تلاشی ہوئی لیکن کوئی خاص چیز برآمد نہ ہوسکی۔ تاہم ہم ہمیشہ لوگوں کی نفرت کا
شکار رہے اور اسی وجہ سے مجھے معاشرے میں کوئی مقام نہ مل سکا۔ یہ تھے سارے
حالات۔ وہ خزانہ بحری قزاقوں کا خزانہ ہے جسے میرے باپ نے پوشیدہ کردیا تھا اور
اس کے بارے میں تفصیلات میری ماں کو بھیج دی تھیں۔" ٹوری ٹاک خاموش ہوگیا۔
درحقیقت عجیب اور حیرت انگیز کہانی تھی۔

کئی منٹ خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "باقی ڈائری کہاں ہے؟"

"پولیس نے دوسرے سامان کے ساتھ ہی اپنی تحویل میں لے لی تھی' صرف یہ
اوراق میری ماں نے پھاڑ کر چھپا لئے تھے اور اسی نے مجھے ان کے بارے میں بتایا
تھا۔"

ٹوری ٹاک کی اس گفتگو نے مجھے بڑی ڈھارس دی تھی درحقیقت اگر وہ مجھے
پہلے سے اس کے بارے میں تفصیل سے بتا دیتا تو شاید مجھے اس قدر سخت محنت نہ کرنا
پڑتی۔ بہرحال جو ہونا تھا ہوگیا تھا۔

ہم نے تیاریاں شروع کردی۔ ٹوری ٹاک نے اپنے خصوصی وسائل سے کام
لے کر بہترین انتظامات کئے اور ایک شام ہم ایک لانچ سے چل پڑے۔ لانچ پُراسرار
راستوں پر سفر کرتی رہی۔ سارتوا بھی اس سفر سے بہت خوش تھی۔ میں نے اس کی

صحت پر اس سفر کا خوشگوار اثر دیکھا۔ لانچ کا سفر بیس دن تک جاری رہا اور ہم پوشیدہ طور پر ایک اور ملک کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی ٹوری ٹاک کے آدمی موجود تھے۔ انہوں نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا۔ ویسے اس دوران میں نے ٹوری ٹاک کو کچھ الجھا الجھا سا دیکھا۔ نہ جانے کیوں!

☆======☆======☆

اس ملک میں ایک طویل قیام کے بعد آگے جانے کا بندوبست کیا گیا اور بالآخر تقریباً دو ماہ تک مختلف راستوں سے سفر کرتے ہوئے ہم نیوا ریکا کی حدود میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی ہم غیر قانونی طور پر آئے تھے۔ ٹوری ٹاک ایک معروف شخصیت رکھتا تھا۔ اس لئے وہ باقاعدگی سے کہیں نہیں آجاسکتا تھا۔ نیوا ریکا میں اس کے آدمی بھی نہیں تھے۔ نیوا ریکا کے ہوٹل "فیراسک" میں ہم نے قیام کیا اور پھر مطمئن ہونے کے بعد ٹوری ٹاک نے ڈائری کے آخری صفحات مجھے دے دیئے اور میں ان سے مغز زنی کرنے لگا۔ میں کئی دن تک سخت مصروف رہا اور پھر ہم نے نیوا ریکا کے علاقے گھومنا شروع کردیئے۔ ہم بے حد محتاط تھے۔ ایک دوسرے سے ذرا سی شناسائی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

لیکن بدقسمتی یہاں بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ایک شام جب میں اپنے کمرے میں شام کی چائے کے لئے تیار ہو رہا تھا میں نے باہر شور کی آوازیں سنیں۔ سارتوا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آکر اس نے ایک روح فرسا خبر سنائی۔

"پولیس.......... پولیس نے ٹوری ٹاک کو گرفتار کرلیا ہے۔"

میرے جسم کی گویا جان نکل گئی تھی۔ معمولی بات نہیں تھی پورا پروگرام درہم برہم ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ٹوری ٹاک کے بارے میں کہاں سے اطلاع مل گئی۔ پولیس ٹوری ٹاک کو گرفتار کرکے لئے گئی' اور میں کچھ نہ کرسکا۔ بس سر پکڑے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا لیکن رات کو تقریباً گیارہ بجے میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور سارتوا نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ کچھ پولیس افسر تھے جو اندر گھس آئے اور انہوں نے ہمارے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ طلب کئے ظاہر ہے یہ سب کچھ میرے پاس نہیں تھا۔ اس لئے ہم دونوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

میں سخت بدحواس تھا۔ ہم ناجائز طور پر یہاں داخل ہوئے تھے یہ اتنی بڑی بات تھی۔ جتنی یہ کہ میں ٹوری ٹاک جیسے خطرناک انسان کا ساتھی گردانا جاتا۔ بہرحال [illegible]ت کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ ٹوری ٹاک کئی حکومتوں کا مجرم تھا اور پھر کسی نیوا ریکا کو یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ ایک خطرناک بحری قزاق کا بیٹا ہے۔ ٹوری ٹاک عمر قید کی سزا دے دی گئی۔ اس کے بارے میں مجھ سے کافی چھان بین کی گئی تھی' میں نے اس سے اپنا واسطہ ظاہر نہیں کیا اور وہ کوئی ثبوت بھی نہیں حاصل کرسکے۔ بہرحال غیر قانونی طور پر مجھے اس ملک میں داخل ہونے پر سزا دی گئی اور پھر [illegible] سے نکال دیا گیا۔

☆======☆======☆

خزانے کا نقشہ میرے پاس ہی تھا۔ ہماری حالت اور خستہ ہوگئی اور اسی دوران ایک بچے کے ماں باپ بن گئے.......... میں سوئٹزرلینڈ واپس نہیں گیا' اور ملک گھومتا رہا۔ پھر جب بہت خراب حالت ہوگئی تو میں ڈربن چلا آیا۔ وہاں میں نے [illegible] اسٹور میں ملازمت کرلی' بچے کے مستقبل کے لئے ہم بہت پریشان تھے لیکن اب [illegible]ت میرے بس سے باہر تھے۔ ہمیں معمولی انسانوں کی طرح زندگی گزارنی تھی اور اسی طرح پورے آٹھ سال گزر گئے۔ ڈائری کے اوراق اب بھی میرے پاس تھے [illegible]ن میں نے دوبارہ نیوا ریکا جانے کی ہمت نہیں کی اور پھر ٹوری ٹاک کے بغیر یہ سب بھی نہیں تھا اور ادھر ٹوری ٹاک تو عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔

اور پھر قسمت نے آخری ضرب لگائی۔ ہماری پریشان کن زندگی میں ایک اور [illegible]اب آیا۔ ایک شام جب اسٹور کی چھٹی ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ سارتوا [illegible]ٹیلی فون مجھے ملا۔ اس نے ڈوبتی آواز میں مجھ سے صرف اتنا کہا۔ "لیوہارا.......... [illegible]ہارا.......... جلدی آجاؤ لیوہارا.......... فیلکس.......... فیلکس۔"

"کیا ہوگیا فیلکس کو؟ جلدی بتاؤ سارتوا کیا ہوگیا فیلکس کو؟" میں نے بدحواسی سے [illegible]چھا لیکن سارتوا کی سسکیوں کے علاوہ اور کچھ نہ سنائی دیا۔ میں بدحواسی میں دوڑ پڑا [illegible] اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ پڑوس کے چند لوگ میرے فلیٹ میں موجود تھے اور سارتوا کی حالت خراب تھی۔ پڑوسی ہی کی زبان سے مجھے معلوم ہوا کہ کوئی

فیلکس، یعنی میرے بیٹے کو پکڑ کرلے گیا ہے۔ کون؟ کیوں؟ اس کے بارے میں مجھے کچ
نہیں معلوم ہوسکا۔

بہرحال، سارتوا نے بمشکل مجھے بتایا کہ وہ ٹوری ٹاک تھا، اور سخت طیش کے عا
میں تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ ہم دونوں نے خزانہ حاصل کرنے کے لئے نیوایر
پولیس کو مخبری کی تھی۔ اسی لئے وہ گرفتار ہوا۔ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ شا
ہم خزانہ حاصل کرچکے ہیں۔ سارتوا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن ٹوری ٹا
اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صرف ان سے انتقام لینے کے لئے نیوایریکا جیل سے
فرار ہوا ہے اور وہ انتقام لے کر رہے گا۔ تب اس نے فیلکس کو بے ہوش کر
کندھے پر ڈال لیا اور بولا۔ "اب تم زندگی بھر اپنے بچے کے لئے تڑپو۔ میں اسے ل
کر اتنی دور نکل جاؤں گا کہ تم اس کی پرچھائیں بھی نہ پاسکوگے اور وہ فیلکس کو لے ک
چلا گیا۔

ہماری زندگی تاریک ہوگئی۔ انتہائی کوشش کی کہ ٹوری ٹاک کا پتا چل جائے۔ ہ
اس جگہ اسے تلاش کیا، جہاں اس کے ملنے کے امکانات ہوسکتے تھے لیکن اس کا نشا
نہیں ملا یہ زندگی کی آخری ضرب تھی جسے برداشت کرنا ہماری قوت سے باہر تھا۔ ہ
دونوں نیم پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرے لیکن ٹوری ٹاک شاید زمین کی گہرائیو
میں پوشیدہ ہوگیا ہے۔ زندگی سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہماری آنکھیں صرف
اس لئے کھلی ہوئی ہیں کہ ایک بار، صرف ایک بار فیلکس کو دیکھ لیں۔"

بوڑھے کی لرزتی آواز خاموش ہوگئی۔ سارتوا کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی
جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں پر بے حد رحم آیا۔ میں نے سوچا کاش میں ان کی
کوئی مدد کرسکتا۔ بہرحال ان بے سہارا انسانوں کی مدد انسانی تقاضا تھی۔ چنانچہ میں نے
انہیں پیش کش کی۔

"اگر آپ پسند کریں مسٹر لیوہارا۔ تو بقیہ زندگی میرے پاس گذار دیں۔ آپ کا
لڑکا اگر آپ کو مل جاتا تو وہ بھی میری عمر کا ہوگا۔ آپ مجھے اس کی جگہ سمجھ سکتے ہیں۔
میں پوری زندگی آپ کو تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

"تمہارا شکریہ میرے بچے، لیکن ہم رواں دواں رہنا چاہتے ہیں۔ کسی ایک جگہ

جانے سے ہمارے دل میں حسرت رہے گی کہ ممکن ہے کسی دوسری جگہ فیلکس مل
ہم زندگی کی آخری سانس تک اس کی تلاش جاری رکھنا چاہتے ہیں۔" بوڑھے
جواب دیا۔

"ٹھیک ہے! بہرحال آپ چند روز یہاں آرام کرلیں تو میں آپ کے سفر کا
ب بندوبست کردوں گا۔ میں چاہتا ہوں آپ کو تکلیف نہ ہو۔" اور بوڑھا ممنون
ہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

☆======☆======☆

میرا پیشہ شریفانہ نہیں ہے لیکن بہرحال شریف لوگوں میں زندگی گزارتا ہوں
ان سے میل جول رکھنے پر شریف آدمی کہلاتا ہوں۔ چنانچہ دوسرے شریف
ں کی طرح میری کوٹھی میں بھی اکثر تقریبات ہوتی رہتی تھیں، جن میں شہر کے
زین شرکت کرتے ہیں۔ اس تقریب کا اہتمام بھی زبردست تھا۔ پورا لان بقعۂ نور
ہوا تھا۔ شراب اور دوسرے مشروبات کا دور چل رہا تھا۔ شہر کا سب سے بڑا
کسٹرا موسیقی بکھیر رہا تھا اور میں دوسرے جوڑوں میں شامل فلزا کے ساتھ رقص
رہا تھا۔ فلزا میری محبوبہ ہے۔ ایک بہت بڑے اسمگلر مسٹر فوزک کی لڑکی اور مسٹر
زک میرے ہم پیشہ ہونے کے باوجود میرے حریف نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات ہم
ب دوسرے سے تعاون بھی کرتے ہیں۔ خود مسٹر فوزک بھی اس تقریب میں شریک
۔ اور فرحت رفیق صاحب کے ساتھ بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔ تقریب میں لیوہارا
ر اس کی بیوی بھی شریک تھے۔ میں نے ان کے لئے عمدہ سوٹ سلوائے تھے پھر
قص کا دور ختم ہوا۔ فلزا کو اس کی کچھ دوست لڑکیوں نے آلیا اور میں پلٹ پڑا لیکن
انک لیوہارا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا آنکھوں سے
ب سے تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر چونک پڑا۔

"کیا بات ہے مسٹر لیوہارا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"مسٹر رشید! ذرا...... ذرا میرے ساتھ آؤ گے یہاں...... ان
رختوں کے قریب!" لیوہارا نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہاں...... ہاں...... چلو...... کیا ہے وہاں...... کیا بات

ہے؟" میں نے لیوہارا کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی اور پھر
ہم درختوں کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے سوالیہ انداز میں لیوہارا کو دیکھا۔
"وہ.......... وہ بھاری جسامت کا آخری آدمی کون ہے۔ وہ جس کے بڑے بڑے
چہرے پر گھنی مونچھیں ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"اوہ.......... وہ مسٹر فوزک ہیں! ایک لبنانی عیسائی۔ شہر کے ایک معزز آدمی
لیکن.......... لیکن وہ بھی میرے ہم پیشہ ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"اسمگلر؟"
"ہاں!" میں نے کہا لیکن لیوہارا نے یہ سوال مجھ سے نہیں کیا تھا' وہ خود سے
مخاطب تھا۔ "اسمگلر لبنانی عیسائی!" اس کی آواز ابھری۔
"کیا بات ہے مسٹر لیوہارا۔ براہ کرم" لیکن لیوہارا کے جواب دینے سے قبل ہی
میرے دماغ میں ایک بتی جل اٹھی۔ "لبنانی عیسائی اسمگلر کیا کہا؟" میں زیادہ سوچنے بھی
نہیں پایا تھا کہ لیوہارا کی آواز ابھری۔
"آہ میرے بچے! اگر تم مجھے پاگل نہ سمجھو تو میں.......... میں اپنے گمشدہ بیٹے
کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.......... کہ وہ ٹوری ٹاک ہے.......... میں اسے لاکھوں
میں پہچان سکتا ہوں.......... وہ ٹوری ٹاک ہی ہے رشید! مجھے بتاؤ.......... کیا تم
اسے بخوبی جانتے ہو؟"
"ہاں!" میں نے گردن ہلائی۔
"اس کے ساتھ کوئی نوجوان بھی ہے؟"
"کوئی نہیں! اس کی صرف ایک لڑکی ہے' جو میرے ساتھ رقص کر رہی تھی۔"
"میری مدد کرو میرے بچے! میں پاگل نہیں ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔
اس سے میرے بچے کا پتا معلوم کرو۔ آہ! ہمیں زندگی کی ہی سانسوں کی خوشیاں لوٹا
دو.......... تمہارا بڑا کرم ہو گا۔"
"آپ کو دھوکا تو نہیں ہوا مسٹر لیوہارا.......... میں اسے پندرہ سال سے جانتا
ہوں۔ ایک طرح سے میرے دوستوں میں سے ہے۔ اپنی خطرناک شکل کے باوجود
ایک نیک دل انسان ہے اور ایک اعلیٰ پائے کا اسمگلر!" میں نے کہا۔

"نہیں میرے بچے.......... وہ ٹوری ٹاک ہے.......... میری مدد
.... میری مدد کرو.......... میں غلط نہیں کہہ رہا۔" بوڑھے لیوہارا کی
آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا بہرحال میں
نے اسے تسلی دی اور پھر دوسرے دن میں لیوہارا کو لے کر مسٹر فوزک کی کوٹھی پر پہنچ
گیا۔ میں نے اپنا کارڈ اندر بھجوایا اور مجھے فوراً بلایا گیا۔
"کمال ہے اب تم بھی اس طرح یہاں آؤ گے!" مسٹر فوزک نے خوش اخلاقی
سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور پھر انہوں نے لیوہارا کو دیکھا جس طرح وہ اچھلے
اور ان کے چہرے میں جو' جو تبدیلیاں ہوئیں' انہیں دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس
لی۔ گویا لیوہارا کا بیان غلط نہیں تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ایسا
لگتا تھا جیسے وہ میرے وجود کو بھول گئے ہوں۔ لیوہارا کے چہرے پر شکست خوردگی تھی
اور فوزک کے چہرے پر ایک وحشیانہ چمک پھر اس نے گردن گھما کر میری طرف
دیکھا۔
"یہ کون ہے مسٹر رشید؟"
"میرا خیال ہے آپ انہیں بخوبی پہچان گئے ہیں مسٹر ٹوری ٹاک۔" میں نے خشک
سے انداز میں کہا اور مسٹر فوزک کے چہرے پر عجیب سی بدحواسی نظر آئی۔ وہ مجھے
گھورنے لگا اور پھر ایک صوفے میں گرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھو.......... بیٹھ جاؤ!"
میں نے لیوہارا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور لیوہارا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بیٹھ گیا۔
اس کی آنکھوں میں بڑی حسرت رچی ہوئی تھی۔ میں مسٹر فوزک کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس
کے بھاری جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ وہ
بار بار ہم دونوں کو گھورنے لگتا تھا۔ پھر اس نے سانپ کی سی پھنکارتی آواز میں کہا۔
"تم یہاں کب آئے لیوہارا؟"
"چند روز قبل ایک حادثے کے تحت!" لیوہارا نے جواب دیا۔
"میرے بارے میں تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟"
"میرا خیال ہے میں مسٹر لیوہارا کے بارے میں آپ کو تفصیل بتا دوں' مسٹر
فوزک!" میں نے درمیان میں دخل دیا اور فوزک میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے

شروع سے آخر تک تفصیل اسے بتادی اور جب میں نے خاموش ہو کر فوزک کی شکل دیکھی تو اس کا چہرہ پُرسکون ہو چکا تھا۔ "اور میں پوری امید لے کر آیا ہوں مسٹر فوزک کہ آپ میری وجہ سے اپنا دل صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر لیوہارا کا بیان درست ہے تو بات صرف غلط فہمی کی رہ جاتی ہے اور میں لیوہارا کے بیان کی تصدیق اس لئے کرتا ہوں کہ اگر یہ خزانہ حاصل کر چکے ہوتے تو شاید اس طرح بے یارومددگار نہ ہوتے۔"

فوزک کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہت طویل عرصہ گزر گیا لیکن اس کے باوجود میں لیوہارا سے سودا کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اس کا بیان درست ہے تو یہ ڈائری کے اوراق کے بارے میں بتائے۔"

"میں نے انہیں زندگی سے زیادہ عزیز رکھا ہے ٹوری ٹاک۔ دیکھو وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔" لیوہارا نے اپنے گریبان کے بٹن کھول دیئے اس کے سینے پر ایک چمڑے کی جیکٹ تھی جس کی زپ کھول کر اس نے چند بوسیدہ اوراق نکال کر فوزک کے سامنے ڈال دیئے۔

فوزک لاپرواہی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ان کاغذات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی' ہاں اگر خزانہ میرے ہاتھ آجائے تو میں تمہیں تمہارے بیٹے کا پتہ بتا سکتا ہوں!" لیوہارا نے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ آج بھی تعاون کرنے کو تیار ہوں ٹوری ٹاک' جس طرح تم چاہو بھروسا کرلو لیکن میرے بچے کو مجھ سے ملادو۔ مجھے اس کے بارے میں بتادو۔"

"تو سنو مسٹر لیوہارا! تمہارے بچے کو میں نے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ ممکن ہے تم کبھی مجھے ڈھونڈھ لو میں نے اسے ایک یورپی ملک میں رکھا ہے۔ وہاں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اب ایک پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ یہ تو ہوئی تمہارے لئے ایک خوشخبری لیکن میں تمہیں اس کا پتا اس وقت بتاؤں گا جب مجھے میرے باپ کا گمشدہ خزانہ مل جائے گا۔"

"میں تمہاری ہر تجویز پر تمہارے ساتھ ہوں۔" لیوہارا نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے! مسٹر رشید بھی ہمارے راز میں شریک ہوگئے ہیں۔ کیوں مسٹر

کیا آپ مناسب شرائط پر ہمارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہیں۔"

"سو فیصدی! میں مسٹر لیوہارا کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تھوڑی سی فہمی نے انہیں ایک طویل عذاب میں گرفتار کر رکھا ہے اور اب جب آپ بھی ہارا سے تعاون کرنے کو تیار ہوگئے ہیں' میں بھی آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کے تیار ہوں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ خزانے کی تلاش کے لئے چلوں گا اور میری خدمات بلا معاوضہ ہوں گی لیکن وہاں جانا کیا اب تو ہمارے لئے خطرناک نہیں گا؟"

"میرا خیال ہے نہیں ہم باعزت ملک کے باعزت شہریوں کے انداز میں وہاں یں گے اور پھر چالاکی سے خزانہ نکال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے! میں اس پُرسکون سمجھوتہ پر آپ دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔" نے کہا' اور پھر اپنی موجودگی میں' میں نے لیوہارا اور مسٹر فوزک یعنی ٹوری ٹاک کو لے ملوا دیا۔

☆======☆======☆

بوڑھی عورت کے چہرے پر زندگی کی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ اچانک عمر کے سولہ سال پیچھے لوٹ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کے چراغ روشن ہوگئے تھے اور وہ بے حد خوش تھی۔ راستے بھر وہ ٹوری ٹاک کی جان کھاتی رہی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ اس کا بیٹا کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ اس کی صحت کیسی ہے اور آخری بار ٹوری ٹاک نے اسے کب دیکھا تھا؟

☆======☆======☆

طویل سفر کے بعد ہم نیوایریکا کے خوب صورت ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔ ہم سب اچھے لباس میں تھے۔ فلزا بھی ضد کر کے ہمارے ساتھ آگئی تھی اور پھر ہم پانچوں آدمی نیوایریکا کے ایک خوبصورت ہوٹل میں مقیم ہوگئے۔

ابتدائی دو دن یہاں سیر و تفریح میں گذارے گئے میں اس ملک میں پہلی بار آیا تھا۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز میرے لئے اجنبی تھی لیکن ٹوری ٹاک اور لیوہارا یہاں ہونے والی تبدیلیوں پر انگشت بدنداں تھے۔ تیسرے دن سے لیوہارا' ڈائری کے آخری

صفحات پر کام کرنے بیٹھ گیا۔ اس شہر کے تمام نقشے فراہم کرلئے گئے تھے اور بیس گھنٹے کی شدید محنت کے بعد لیوہارا نے ایک جگہ کا تعین کرلیا۔

یہ جگہ گرین پارک کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا نیا نام بارہلز پڑ گیا تھا اور جیسے کہ لیوہارا کے پہلے اندازے درست ہوئے تھے۔ بارہلز یا گرین پارک کے بارے میں میری اور ٹوری ٹاک کی یہی رائے تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ خزانے کی جگہ دریافت ہونے کے بعد ہم لوگوں کے خون میں عجیب سی روانی پیدا ہوگئی تھی۔

"تو پھر طے یہ ہوا کہ گرین پارک کے مشرقی کنارے پر' جہاں سیاہ پتھروں کا حوض ہے' وی کی شکل کے ایک درخت کی جڑ میں وہ صندوق موجود ہے جس میں دینا کا بیش بہا خزانہ موجود ہے!" ٹوری ٹاک نے مسرت سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں مسٹر ٹوری ٹاک اور اس سلسلے میں آپ میری دلی مبارکباد قبول کریں!"

"شکریہ مسٹر رشید! لیکن میری ایک درخواست ہے!"

"فرمایئے!"

"اس وقت کے بعد سے ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے۔ میرا خیال ہے ایک دوسرے پر اعتماد کے لئے یہ ضروری ہے کل دن میں ہم اس جگہ کی جانچ پڑتال کریں گے اور اس کے بعد خزانہ نکالنے کا پروگرام بنائیں گے کیا خیال ہے؟"

"آپ کے اعتماد کے لئے ہمیں سب کچھ منظور ہے مسٹر فوزک لیکن میرا خیال ہے آپ مجھ سے بخوبی واقف ہیں۔" میں نے کسی قدر برا مانتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں لیکن یہ ضروری ہے۔ ہمیں فراخدلی سے ایک دوسرے کی شرائط قبول کرلینا چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے!" میں نے گردن ہلادی۔ لیوہارا بیچارے کو تو کسی بات پر اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ وہ رات ہم نے ایک ہی کمرے میں گزار دی۔ فلزا کو بھی اپنے باپ کی یہ بے اعتباری پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے کئی بار مجھ سے معذرت کی تھی بہرحال دوسرے دن صبح ہم سب یہاں تک کہ فلزا اور سارتوا بھی گرین پارک چل دیئے

گرین پارک نقشے کے مطابق شہر کے باہر ایک جگہ تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ہم نے گرین پارک چلنے کے لئے کہا اور اس نے گردن کھجائی۔ "آپ کی مراد بارہلز سے تو نہیں ہے؟"

"ہاں.......... ہاں! اس کا نیا نام بارہلز ہی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا اور ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔

"بارہلز یہاں سے کتنی دور ہے؟" مسٹر ٹوری ٹاک نے پوچھا۔

"پہلے شہر سے باہر ہوا کرتا تھا لیکن اب تو شہر بارہلز سے بھی کافی آگے تک پھیل گیا ہے۔ گرین پارک تو کبھی کا ختم کردیا گیا۔ اب اس کی جگہ ہوٹل سمارا ہے۔ ہوٹل سمارا کی کہانی بھی خوب ہے کہتے ہیں بوبی پیٹر پہلے ریس کورس میں گھوڑے دوڑاتا تھا۔ اب وہی معمولی جاکی ہوٹل سمارا کا مالک ہے۔ جب ریس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو قلاش ہوگیا' اور اسے پیٹ بھرنا مشکل ہوگیا۔ اس دوران حکومت نے شہر کی توسیع کا پروگرام بنایا۔ گرین پارک ختم کرکے وہاں مارکیٹ بنانے کا ارادہ تھا اور تھوڑی سی رقم کے عوض بوبی پیٹر نے گرین پارک میں اپنی دکان کے لئے ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا خرید لیا لیکن اس زمین سے بوبی پیٹر کو ایک بہت بڑا خزانہ ملا۔ یہ خزانہ بحری قزاقوں کا تھا۔ اس سے ایسے نشانات ملے جن سے قزاقوں کی نشاندہی ہوتی تھی لیکن شریف آدمی نے شرافت سے خزانہ حکومت کے حوالے کردیا اور حکومت نے اس کی دیانتداری پر آدھا خزانہ اسے بخش دیا۔ بس بوبی پیٹر نے پورا پارک ہی خرید ڈالا اور سمارا بنا دیا.......... اور اب.........."

"بند کرو.......... بند کرو یہ بکواس.......... قتل کردوں گا.......... ایک ایک کو قتل کردوں گا۔" اچانک ٹوری ٹاک نے اچک کر ڈرائیور کی گردن پکڑ لی اور ڈرائیور نے گھبرا کر ٹیکسی روک دی۔

بمشکل تمام ہم نے ڈرائیور کی جان بخشی کرائی۔ اس نے ہمیں اس جگہ اتار دیا اور برا بھلا کہتا ہوا چلا گیا لیکن ٹوری ٹاک کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ لیوہارا اور سارتوا پر حملے کررہا تھا۔ بالآخر میں نے اس کی گردن کی پشت پر گھونسا مار کر بے ہوش کردیا۔ تب کہیں ہم اسے ہوٹل واپس لانے میں کامیاب ہوئے۔

☆=====☆=====☆

ٹوری ٹاک پر ایک ہفتے تک دورے پڑتے رہے۔ خزانے کا حشر معلوم ہوچکا تھا لیکن لیوہارا بھی تو بے قصور تھا۔ اس کی کیا خطا تھی لیکن ٹوری ٹاک اس سے سخت نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سب کچھ لیوہارا ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اعتدال پر آیا۔ لیوہارا اور سارتو اسے اس کی نفرت اسی طرح برقرار تھی اور جب ایک شام لیوہارا نے دبی زبان سے اس سے کہا کہ اس میں اس کی کیا خطا ہے۔ خزانہ نہیں مل سکا' لیکن وہ اس کے بیٹے کا پتا تو بتادے۔ تو ٹوری ٹاک نے سخت نفرت سے کہا۔ "تم پاگل ہو لیوہارا خزانہ میرے باپ کی میراث تھا۔ وہ دوسرے کے ہاتھوں لگ گیا۔ میں زندگی بھر اس کے لئے روتا رہوں گا لیکن رونے والوں میں تنہا میں ہی نہ ہوں گا تم بھی روؤ گے اپنے بیٹے کے لئے............ ہاں............ تم بھی زندگی بھر روؤ گے۔"

"لیکن میرا کیا قصور ہے ٹوری ٹاک' میں تو ہمیشہ سے بے قصور رہا ہوں۔ تم نے میرے اوپر ظلم کیا ہے۔" لیوہارا رو پڑا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ بس مجھے خزانہ نہیں ملا۔ تمہیں تمہارا بیٹا نہیں ملے گا۔" ٹوری ٹاک نے دیوانگی سے کہا۔

"لیکن یہ ظلم ہے مسٹر ٹوری ٹاک! یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مسٹر لیوہارا نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا تھا!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"نہیں بتاؤں گا' میں برباد ہوگیا ہوں۔ پوری دنیا کو برباد کردوں گا سمجھے۔ کوئی میرا کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" ٹوری ٹاک نے کہا اور میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ اچانک میں نے پستول نکال لیا اور دوسرے لمحے میں نے فلزا کو دبوچ کر پستول اس کی طرف کردیا۔ یہ سب کچھ آن کی آن میں ہوگیا تھا۔ سب کے چہرے حیرت سے پھیل گئے۔

"میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں مسٹر فوزک۔ تم جانتے ہو میں تمہیں تمہاری دیوانگی کی سزا دے سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے تم اسے اس کے بیٹے کا پتا نہ بتاؤ لیکن آج کے بعد تمہیں فلزا کا پتا بھی نہیں ملے گا۔ تم پوری زندگی اس کی تلاش میں مارے مارے

پھرو گے اور اگر تم نے کبھی اس کا سراغ پا بھی لیا تو............ میں اسے گولی ماردوں گا............ یہ میرا عہد ہے!" میں فلزا کو دبوچے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔ ٹوری ٹاک کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر شکست خوردگی کے آثار نظر آئے اور وہ ڈوبتی آواز میں بولا۔ "رک جاؤ رشید............ رک جاؤ............ آہ رک جاؤ............ میں نے شکست مان لی ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ خون صرف خون کی حمایت کرے گا۔ تم اپنے والدین سے متاثر نہ ہوگے تو کس سے ہوگے۔ اب کیا ہے۔ سب کچھ برباد ہوگیا ہے۔ میں آخری پونجی بھی نہیں گنوانا چاہتا۔ چھوڑو میری بچی کو............ چھوڑ دو اسے............ میں اسے اس طرح بے بس نہیں دیکھنا چاہتا............ سنو رشید............ میں اپنی بچی کی قسم کھا کر کہتا ہوں............ جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں............ سنو............ لیوہارا............ سنو............ میں دیوانگی میں تمہارے بچے کو لے کر چلا آیا۔ میرا جنون مجھے ملک ملک لئے پھرا لیکن میں تمہارے بچے کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرسکا۔ پھر مجھے ویلما مل گئی۔ ایک محبت کرنے والی عورت' میں نے اس سے شادی کرلی اور پھر ہم اس جگہ آباد ہوگئے جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ویلما حاملہ ہوگئی' وہ فیلکس کو پسند نہیں کرتی تھی تب میں تمہارے فیلکس کو ایک عورت جوز لیناٹن کے حوالے کردیا اور اس کی پرورش کے لئے جوز لیناٹن کو باقاعدہ رقم ادا کرتا رہا۔ مجھے اس بچے سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بہرحال وہ وہاں رشید کی حیثیت سے پرورش پاتا رہا۔ پھر وہ جوان ہوگیا' اور اسمگلر بن گیا۔ میں نے بھی اپنے ایک دوست فرحت رفیق کے ذریعے اسے اس لائن پر ڈال دیا تھا............ اور............ آج تمہارا فیلکس تمہارے سامنے ہے۔ میں کوئی ثبوت نہ پیش کرسکوں گا............ ہاں............ فیلکس کے بچپن کے تعلیمی سرٹیفکیٹس پر اس کی تصویریں موجود ہوں گی۔ تم انہیں دیکھ کر یقین کرسکتے ہو۔ میں تو اس دن حیران ہوگیا تھا جب تم فیلکس کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔ خزانہ مل جاتا تو میں تمہیں اس کے بارے میں بتا دیتا............ لیکن............ مجھ پر ایک بار پھر ناکامی کا جنون طاری ہوگیا تھا لیکن اب میں سنبھل گیا ہوں مجھے معاف کردو لیوہارا۔ فلزا کی جدائی کا تصور کرکے مجھے تمہارا درد معلوم ہوگیا ہے۔ میں فلزا کی قسم کھا کر کہتا ہوں

لیوہارا۔ رشید تمہارا بیٹا فیلکس ہے۔"

پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا............ سارتوا............ میری ماں پاگلوں کے سے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی اور پھر جونہی میں اس کے سینے سے لگا وہ میرے بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی۔

آخری بات آپ کو بتا دوں۔ فلزا کے اصرار پر میں نے اسمگلنگ چھوڑ دی ہے اور ایک باعزت شہری کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ فلزا نے میری اس دن کی حرکت کا ذرا بھی برا نہیں منایا۔ اس کے خیال میں میرا اقدام ٹھیک تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ٹوری ٹاک کا جنون فرو نہ ہو سکتا تھا!

بہرحال میرے سسر مسٹر ٹوری ٹاک اور میرے والد مسٹر لیوہارا آج بھی میرے ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں بہت اچھے دوست ہیں اور اکثر شطرنج کھیلتے ہوئے ایک دوسرے سے الجھ جاتے ہیں۔ پھر میری ماں سارتوا اور میری بیوی فلزا کو ان دونوں میں صلح کرانے کے لئے خاصی محنت کرنی پڑتی ہے۔ دونوں بوڑھے بے حد دلچسپ ہیں اور ہمارا وقت خوب گذرتا ہے۔

☆======☆======☆

مستقبل

...ں چور کی دلچسپ کہانی جو ایک سائنسدان کے ...ر میں گھس گیا تھا۔ ایک انوکھی ایجاد کا قصہ جو ...نی، حال اور مستقبل کے قصے دکھاتی تھی۔

کرم علی کسی زمانے میں بہت شریف اور نیک نوجوان تھا لیکن شرافت اور
مصائب کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ چولی اور دامن یکجا تھے۔ زندگی کی
آسائشیں اس کے پاس دور سے ہوکر بھی نہیں گزری تھیں۔ دن اور رات معاشی
الجھنوں سے سجے ہوئے تھے۔ سوچ کا ہر لمحہ ایک نئی فکر اور پریشانی سے مزین ہوتا تھا۔
گھر میں کچھ نہیں تھا۔ سوائے ایک بوڑھے باپ اور اس کے خاندانی شجرے کے۔ باپ
نے بیماری کے عالم میں گھر کی تمام چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کردی تھیں لیکن کوئی ایک
دوا حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا جو اسے صحت مند کردے۔ اسے مسائل کی بیماری تھی
اور اس بیماری کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس یا میڈیکل اسٹور میں نہیں ملتی۔ وہ کرم علی کو
اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواہشمند تھا۔ ان بے شمار باپوں کی مانند جو اولاد کے پیدا ہوتے ہی
اس کے اعلیٰ مستقبل کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان خوابوں کی
تکمیل کے لئے دیوانے ہوجاتے ہیں اور اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔

ظہیر علی کا شمار بھی انہی لوگوں میں تھا' اور پھر ایک ہی بیماری ہوتی تو شاید اس کا
علاج بھی ممکن ہوتا۔ ظہیر علی ایک دوسری بیماری میں بھی مبتلا تھا۔ یہ شرافت کی بیماری
تھی۔ اسے اعلیٰ نسبی کا بخار رہتا تھا۔ خاندانی نجابت کی کھانسی سے وہ ہر وقت کھوں
کھوں کرتا رہتا تھا۔ اجداد کی نیک نامی پر کسی داغ کے خوف سے وہ ہر وقت سہما رہتا تھا
اور انہی لاتعداد بیماریوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ کرم علی میٹرک کرنے کے بعد سال
اول کا طالب علم تھا کہ ظہیر علی اپنی تمام امنگوں کا بوریا سمیٹ کر ملک عدم کی جانب
روانہ ہوگیا اور کرم علی کو وراثت میں اس بوسیدہ شجرے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ظہیر
نے ساری زندگی اسے اس شجرے کا غلام بنائے رکھا تھا۔ ان تمام امراض کو اس نے

مسلط کرنے کی کوشش کی تھی جو خود اسے تھے لیکن کرم علی نے اس کی موت کے بعد
نصیحتوں کی موٹی رضائی اتار پھینکی۔ اس نے زندگی کے دوسرے رخ پر بھی غور کیا اور
سوچا کہ دنیا کے کامیاب لوگ کون ہیں کیوں ہیں؟ اسے جو لوگ نظر آئے ان کے
طریقۂ کار دوسرے تھے اور اس کے باپ کی سوچ کے دھارے دوسرے۔ اسے اپنا
باپ پسماندہ سوچ کا مالک نظر آیا اور اس کی وجہ یہی شجرہ تھا جس نے ساری زندگی ظہیر
علی کو کام کا آدمی نہیں بننے دیا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس شجرے کو پھاڑ کر
چولہے میں رکھا اور ماچس جلا کر ہمیشہ کے لئے خاندانی روایات کی رسیوں کی بندش سے
آزاد ہوگیا۔ اس کے بعد اسے ایسے دوستوں کی تلاش ہوئی جو اسے مستقبل کے
سنہرے راستے دکھائیں اور برائی کے راستے دکھانے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ چنانچہ
بہت جلد اس نے ایسے کرم فرماؤں کو پالیا جنہوں نے اس کا مستقبل بنادیا۔ انہوں نے
وہ کام کر دکھایا جس کے لئے اس کے باپ نے پوری زندگی کوشش کی تھی اور کامیاب
نہیں ہوسکا تھا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ کرم علی جوان ہوکر بڑا آدمی بن جائے۔ اس کے
پاس رہنے کے لئے عمدہ مکان ہو۔ زندگی گزارنے کے لئے دوسری آسائشیں ہوں۔
اور آج یہ ساری چیزیں کرم علی کو حاصل تھیں۔ وہ عیش سے زندگی گزار رہا تھا۔
دولت کی اسے ہوس نہیں تھی۔ بس عمدہ زندگی گزارنے کے لوازمات ہوں اور کیا
چاہئے۔ چنانچہ اس نے کام کے لئے خصوصی طریقۂ کار متعین کئے تھے۔ یعنی ہر ماہ کی
ایک مخصوص تاریخ کو وہ کام کے لئے نکلتا تھا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت
عمل کرتا تھا۔ یعنی پہلے سے کام کی جگہ کا انتخاب کرلیتا تھا۔ اس کے قرب وجوار کا
اندازہ لگاتا تھا۔ اس کے مکینوں کے بارے میں تفصیلات معلوم کرتا تھا اور فیصلہ کرتا تھا
کہ یہ جگہ کام کے لئے موزوں ہے یا نہیں۔ اپنی اس احتیاط اور قناعت پسندی کی وجہ
سے وہ آج تک کسی چکر میں نہیں پھنسا تھا۔

آج مہینے کی انیس تاریخ تھی اور کرم علی کے حساب سے کام کا دن۔ یعنی پچھلے
کام کو کئے ہوئے پورا مہینہ گزر چکا تھا۔ اس سلسلے میں کرم علی کی سوچ عام سوچوں سے
مختلف تھی۔ وہ اپنا کام پوری دیانت داری سے کرتا تھا۔ یعنی جس طرح عموماً لوگ دفاتر
میں کام کرتے ہیں۔ ایک کام ختم کرنے کے بعد پورے ہفتے کی چھٹی۔ چھٹیوں کے یہ

دن وہ مختلف تفریحات میں گزارتا تھا۔ کئی کاروباری عورتوں سے دوستی تھی۔ اس کے علاوہ سیر و شکار سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ دل کھول کر عیش کیا جاتا۔ دوسرے ہفتے سے وہ کام کے لئے مستعد ہوجاتا۔ ابتدائی چند روز جگہ کی تلاش، اس کے بعد وہاں کے مکینوں کے بارے میں معلومات، محلِ وقوع کا جائزہ اور کام کے لئے موزوں دن کا انتخاب، اس کے بعد عمل، اور یہ لائحہ عمل طویل عرصے سے چل رہا تھا۔

اس بار اس نے جس عمارت کا انتخاب کیا تھا وہ کشمیری دروازے کی اعلیٰ ترین عمارتوں میں سے ایک تھی۔ عمارت کے پورٹیکو میں ایک خوبصورت کیڈلک کار کھڑی رہتی تھی جسے پورے ہفتے کرم علی نے کھڑے ہی دیکھا تھا۔ دروازے پر ایک بوڑھا چوکیدار بھی ہوتا تھا۔ ایک اور بوڑھا آدمی بھی نظر آیا تھا جسے پہلے ہی دن دیکھ کر کرم علی نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بھی ملازم ٹائپ کی کوئی چیز ہے۔ پھر معلومات کے دوسرے دور میں اس نے مکمل کوائف معلوم کرلئے۔ عمارت کے مالک کا نام پروفیسر گیلانی تھا۔ وہ ایک سائنسداں تھا۔ پہلے کسی سرکاری سائنسی ادارے میں تھا لیکن عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ریٹائر ہوگیا تھا شادی نہیں کی تھی اور ساری دنیا میں تنہا تھا۔ پوری عمارت میں صرف دو ملازم تھے۔ ایک چوکیدار جو مالی کا کام بھی کرتا تھا اور دوسرا آل راؤنڈر ملازم.......... یعنی وہ گھر کے فرنیچر وغیرہ کی صفائی کرتا تھا۔ باورچی خانے میں باورچی کے فرائض انجام دیتا تھا اور جب پروفیسر گیلانی خدانخواستہ گھر سے نکلتا تھا تو ڈرائیور کے فرائض بھی اسے ہی انجام دینا ہوتے تھے۔

یہ تھی اس گھر کی افرادی قوت، اور ایسے گھروں میں سارے کام نہایت آسانی سے ہوجاتے ہیں۔ جبکہ کرم علی کے خیال میں ایسے گھروں کا انتخاب خوش بختی ہی ہوتی ہے۔ کوئی مشکل ہی نہیں۔ سکون سے دھندا کرو اور واپس آجاؤ لیکن اس کے باوجود مسلح ہونا ضروری تھا۔ ہتھیاروں میں اسے پستول بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کے خیال میں پستول رکھ کر انسان بزدل اور سہل پسند ہوجاتا ہے اور خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ یعنی کوئی معمولی سا خطرہ ہو تو گولی چلادو کیونکہ پستول موجود ہے۔ اس کے بجائے رامپوری چاقو موزوں ترین چیز ہے۔ جسے انتہائی ضرورت پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ خون خرابے سے تو جس قدر بچا جائے بہتر ہے۔ کسی کی زندگی لو تو اپنی زندگی

کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

اس رات بھی اس نے معمول کے مطابق ہلکا کھانا کھایا اور اپنی تمام چیزیں درست کر کے تیار ہوگیا۔ ٹھیک دس بجے اسے گھر سے نکلنا تھا۔ کام کے اوزاروں میں چابیوں کا ایک گچھا بجلی کے کرنٹ کا جائزہ لینے والا ایک آلہ، رام پوری چاقو اور ایک ننھی سی ٹارچ اور چند مخصوص تھیلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ تمام چیزیں ہلکی ہلکی ہوتی ہیں اور کسی کام میں حارج نہیں ہوتیں۔ دس بجے اپنی ہڈ چڑھی ہوئی وین لے کر وہ گھر سے نکل آیا اور پُر رونق سڑکوں پر سست روی سے چلتا ہوا منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگا۔ سارا نقشہ اس کی نگاہوں میں تھا۔ پیلے پتھروں سے بنی پرانی طرز کی عمارت سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اس نے وین روک دی اور نیچے اتر کر اس کا بونٹ کھول لیا۔ سڑکیں دور دور تک سنسان تھیں اس لئے بونٹ پر جھکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کرکے سلگالی۔ نہایت اطمینان سے وہ سگریٹ کے کش لیتا رہا اور پھر اسے پینے کے بعد اس کا ٹکڑا جوتے سے مسل دیا۔ پھر وہ وین میں آبیٹھا۔ پونے گیارہ بجے سے صرف پندرہ منٹ اور گزارنے تھے۔ اس نے وین میں لگا ٹیپ ریکارڈر آن کردیا اور دھیمی آواز میں گانے سنتا رہا۔ تیسرے گانے کے اختتام کے بعد اس نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ وین کا بونٹ بند کرنے کے بعد اس نے اسے اسٹارٹ کیا اور عمارت کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گیٹ پر بھی بلب وغیرہ نہیں جل رہا تھا۔ اس نے سکون سے گردن ہلائی اور پھر دور جاکر وین کو کچے راستے پر اتار لیا اور پھر اسے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا کردیا جو عمارت سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ پھر وہ پُر اطمینان قدموں سے چلتا ہوا عمارت کی عقبی چہار دیواری کے نزدیک پہنچ گیا جہاں دیواریں تقریباً سات فٹ بلند تھیں۔ اسے صرف ایک فٹ دو انچ اچھلنا پڑا اور اس کے ہاتھ دیوار کی کگر تک پہنچ گئے اور اس کے بعد بدن کو سبک روی سے جنبش دینے کا فن اسے بخوبی آتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کو زیادہ مشقت بھی نہیں کرنا پڑی۔

چند لمحات کے لئے اس کے کریپ سول جوتے دیوار پر ٹکے اور دوسرے لمحے وہ

آہستہ سے نیچے کود گیا۔ اصل عمارت کا فاصلہ دس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ اس علاقے
کی دوسری عمارتوں کی مانند ہی اس کا ڈیزائن بھی تھا۔ عقبی کمروں کی بڑی بڑی کھڑکیاں
جن میں سلاخیں بھی نہیں تھیں اور شیشے بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایسی کسی کھڑکی سے
اندر داخل ہونا بھی کوئی مشکل کام تھا۔ چنانچہ اس نے دروازے کی تلاش بھی ضروری
نہیں سمجھی اور ایسی ہی ایک کھڑکی تک پہنچ کر اندر ہاتھ ڈالا اور چٹخنی کھول لی۔
دوسرے لمحے وہ اندر تھا لیکن اندر داخل ہونے کے بعد دروازے کی تلاش لازمی امر
تھا۔ ہنرمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جہاں سے گزرو وہاں سے واپسی کے لئے آسانیاں
فراہم کرتے جاؤ۔ چنانچہ اس نے وہ دروازہ کھول دیا اور پھر دوسرے اندرونی
دروازے کی تلاش شروع کردی۔ اس دروازے کے دوسری طرف کا جائزہ لینے کے
بعد اس نے اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں سے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ کمرے میں معمولی
قسم کا فرنیچر تھا۔ دیواروں میں الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں کتابیں چنی ہوئی تھیں۔
بیکار اور فضول جگہ' اس نے سوچا اور دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ یہ
شاید کوئی پرانی خواب گاہ تھی۔ یہاں کا فرنیچر تو اچھا تھا لیکن اسے استعمال نہیں کیا جا
تھا۔ اس کمرے کا دروازہ ایک برآمدے میں کھلتا تھا۔ برآمدہ بھی تاریک پڑا تھا سامنے
صحن تھا جس میں درخت لگے ہوئے تھے۔ برآمدے کا اختتام ایک اور دروازے پر ہوا
تھا اور اس دروازے سے دوسری جانب کی فضا دلکش تھی۔ یہ کمرہ بھی خواب گاہ کے
طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں ایک اعلیٰ درجے کا سگار بکس' سگار بکس کے نزدیک رکھی
ہوئی حسین ٹائم پیس' ایک انتہائی نفیس ریڈیو اور ایسی ہی چند دوسری اشیاء موجود
تھیں جو بے حد قیمتی تھیں۔ ان ہلکی چیزوں سے کرم علی کو کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس
نے کینوس کا ایک تھیلا نکالا اور اس کی زپ کھول کر یہ اشیاء اس میں منتقل کرلیں۔ پھر
اس تھیلے کو اس نے اس کمرے کے آخری دروازے میں لا رکھا جہاں سے وہ داخل
ہوا تھا۔ اس کے بعد نئے جہانوں کی تلاش میں چل پڑا۔

خواب گاہ میں کوئی ایسی الماری یا تجوری نہیں نظر آئی جس میں کرنسی اور
زیورات وغیرہ کی موجودگی کا اندازہ ہوسکتا۔ زیورات کے بارے میں تو کرم علی نے
پہلے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ ان کی موجودگی مشکل ہی ہے۔ کیونکہ ان کا استعمال کرنے

کوئی نہیں تھا لیکن کرنسی کے لئے وہ پُرامید تھا۔ اب یہ کوئی بات نہیں کہ کرنسی اس
رے میں نہیں ملی تھی۔ چنانچہ وہ تلاش کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔
ں بھی اسے چند انتہائی قیمتی چیزیں ملیں جو اس نے دوسرے تھیلے میں بند کرلیں۔
زے کے مطابق کئی ہزار روپے کا مال مل گیا تھا لیکن صورتِ حال وہ نہیں نکلی جو
ں نے سوچی تھی۔ اس کے خیال میں اسے اس عمدہ عمارت سے کم از کم پچیس تیس
ار روپے کی آمدنی ہونی چاہئے تھی۔ کمروں کی ترتیب کو پوری طرح ذہن نشین
رنے کے بعد وہ مزید آگے بڑھا' بے ترتیب کمروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اسے اس
ے تکی عمارت پر غصہ آنے لگا۔ کوئی ترتیب ہی نہیں ہے۔ عجیب بھول بھلیاں بنائی گئی
لیکن یہ پوری عمارت تاریک کیوں ہے۔ ممکن ہے بتی چلی گئی ہو۔ چند لمحات کے
وہ برآمدے کے آخری سرے والے دروازے پر پہنچ گیا۔ تھوڑی سی قیمتی چیزوں
کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی تھی جو کارآمد ہوتی اور جسے اس عظیم الشان
ارت کے شایانِ شان کہا جاسکتا۔ یہ مایوس کن بات تھی اس آخری دروازے کو اور
زما لیا جائے اس نے سوچا اور پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا لیکن دروازہ
ھلا ہوا تھا اور جونہی اس نے دروازے کو اندر دھکیلا تیز روشنی سے اس کی آنکھیں
ندھیا گئیں۔ دوسرے لمحے اس نے گھبرا کر ہینڈل چھوڑ دیا لیکن دروازہ کھلا رہا تھا اور
روشنی اب باہر بھی رینگ آئی تھی۔

لیکن یہ ہوا کیا؟ اور پھر ٹھنڈک کے احساس نے صورتِ حال واضح کردی۔ کمرہ
یرکنڈیشنڈ تھا اور اس میں کوئی رخنہ ایسا نہیں تھا جس سے روشنی دکھائی دے جاتی۔
ں لئے باہر سے اسے دوسری طرف روشنی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن یہ تیز روشنی؟
ں نے چاقو نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور پھر اندر جھانکا۔ روشنی جگہ جگہ سے ابھر رہی
گیا۔ چھت پر مرکری لائٹس لگی ہوئی تھیں اور یہ جگہ جسے صرف اس نے کوئی کمرہ
ھا تھا ایک عظیم الشان ہال تھا اور اس ہال میں چاروں طرف عجیب عجیب چیزیں رکھی
ہوئی تھیں۔ شاید سائنس داں کی تجربہ گاہ ہے۔ اس نے سوچا لیکن کیا کوئی اندر موجود
ہے۔ اگر موجود ہے تو کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟ اس کی معلومات کے مطابق یہاں
صرف تین افراد تھے۔ دو ملازم اور ایک بوڑھا سائنسدان۔ اس کا مطلب ہے کہ اس

تجربہ گاہ میں صرف وہ بوڑھا سائنسداں ہوگا۔

بوڑھا سائنسداں بے ضرر اور آسانی سے قابو میں آجانے والا۔ مایوس جانے سے تو کچھ کرنا بہتر ہے۔ کم از کم کچھ کرنسی تو ہاتھ لگے۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر جلدی سے دروازہ بند کردیا اور پھر سائنسداں کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ چھوٹی بڑی مشینوں کے درمیان تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی گونج فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑا پُراسرار ماحول تھا۔ اس نے سفید رنگ کی ڈیپ فریزر نما مشین کی آڑ سے چاروں طرف دیکھا اور اس وسیع تجربہ گاہ کے اس کونے میں اسے ایک چھوٹا سا کیبن نظر آگیا۔ یقیناً اس کیبن میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوگا۔ کیبن تک کا راستہ بے شمار مشینوں کی آڑ سے ہوکر جاتا تھا۔ وہ انتہائی احتیاط کے ساتھ' آہٹ کئے بغیر اس کیبن کی جانب بڑھنے لگا اور چند ساعت کے بعد وہ کیبن کی سفید دیواروں کے نزدیک پہنچ گیا۔ کیبن کے چھوٹے سے دروازے کو آہستہ سے کھول کر اس نے اندر جھانکا اور اسے کسی شخص کی پشت نظر آئی وہ میز پر جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ سفید بالوں والا قوی ہیکل بوڑھا اس کی پشت خاصی چوڑی تھی اور اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قوی ہیکل آدمی ہے۔

کرم علی نے اس دوران اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں وہ صرف یہی تھیں کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ بوڑھے سائنسدان کو دیکھنے کا اتفاق اسے نہیں ہوا تھا اور یوں بھی وہ لڑائی بھڑائی سے بچنے والوں میں سے تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر بوڑھے کو قابو میں کرلیا جائے تاکہ کسی ہنگامے کا خطرہ نہ رہے۔ وہ دبے قدموں اس کی پشت پر پہنچ گیا اور جب بوڑھے کو قدموں کی چاپ کا احساس ہوا تو دیر ہوچکی تھی۔ اس نے بوڑھے کی گردن کی پشت پر چاقو کی نوک رکھ دی تھی۔ بوڑھا بری طرح اچھل پڑا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں قلم دبا ہوا تھا اور دوسرا خالی تھا۔ سامنے ہی ایک پیڈ رکھا ہوا تھا جس پر کاغذ کی کچھ شیٹس لگی ہوئی تھیں اور ان شیٹوں پر کچھ عجیب سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ چند ساعت خاموشی رہی پھر بوڑھے کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "کیا تم مجھے پلٹ کر دیکھنے کی مہلت دوگے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں اس شرط پر کہ تم فوری طور پر جان دینے کی کوشش نہیں کروگے۔" کرم علی نے سفاک لہجے میں جواب دیا اور چاقو کی نوک اس کی گردن سے ہٹالی۔ بوڑھا پلٹا۔ اس نے گھومنے والی کرسی کا رخ بدل لیا تھا۔ چند ساعت وہ خاموشی سے کرم علی کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ سرخ و سفید چہرے والا ایک توانا شخص تھا۔ اس کی تیز آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور چہرے پر کھلنڈرے پن کے آثار۔ پھر اس نے کرم علی کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آہ شاید تم نے چند ہی روز قبل اس کام کا آغاز کیا ہے؟" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"پستول بھی نہیں ہے تمہارے پاس۔ حالانکہ آج کل تو جیب تراش بھی پستول لئے پھرتے ہیں۔" وہ بدستور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"چاقو کا کمال دیکھوگے؟" کرم علی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"نہیں نہیں' ان فضولیات میں مت پڑو۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو اور اسے دھوکہ ہی سمجھو کہ اس وقت مجھے شدت سے کسی انسان کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔"

"کسی چور کی؟" کرم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پیشے کی کوئی قید نہیں تھی۔ بس کوئی بھی۔ یہ بتاؤ تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہو؟"

"کیا آپ مجھے ملازم رکھنا چاہتے ہیں مسٹر..........؟" کرم علی ہنس کر بولا۔

"تم مجھے احتشام گیلانی کہہ سکتے ہو۔ ویسے لوگ مجھے پروفیسر گیلانی کے نام سے جانتے ہیں۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔"

"خوب۔ خوب.......... تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہاں۔ اتنا پڑھا لکھا ہوں کہ کام چل جاتا ہے۔"

"سورت شکل سے بھی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ وہ دوسری کرسی موجود ہے۔"

"کھڑے ہو جاؤ۔" کرم علی اب اس کی زیادہ بکواس نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا بوڑھا پروفیسر اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "پڑھے لکھے آدمی ہو تو پڑھے لکھوں کی سی باتیں کرو۔ تم یہاں چوری کرنے آئے ہو۔ اگر چوری کرنے آئے ہو تو یہاں تک آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

"ہاں' اس کی بھی ایک وجہ ہے؟" کرم علی نے جواب دیا۔

"کیا وجہ بولو؟"

"وجہ یہ ہے کہ تم نہایت کنجوس آدمی معلوم ہوتے ہو تمہاری خواب گاہ میں کوئی تجوری نہیں ہے جس میں سے میں کچھ نکال سکتا۔ اس کے علاوہ تمہارے گھر میں بھی کچھ ایسی قیمتی چیزیں نہیں ہیں جنہیں کوئی خاص اہمیت دی جائے۔ میں نے صرف چند معمولی چیزیں تھیلے میں رکھ کر ایک جگہ رکھ دی ہیں تاکہ میں انہیں جاتے وقت لیتا جاؤں لیکن میرا کام ان سے نہیں چلے گا۔"

"اوہو۔ اوہو تو پھر تمہیں اس عمارت کے مکین کی تلاش ہوئی ہوگی۔"

"ہاں' اور میں تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔"

"خیر' اب کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے بتاؤ تم نے اپنی دولت کہاں چھپا رکھی ہے؟"

"دولت..........." پروفیسر ہنس پڑا۔ "میں نے چھپائی کہاں ہے۔ اس تجربہ گاہ میں چاروں طرف دیکھو' میری دولت بکھری ہوئی ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے ان پر خرچ کر دیا اور جو کچھ ہے میرے دوست آج کل گھر میں نہیں رکھا جاتا لیکن اس کے باوجود میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔" بوڑھا ڈرامائی انداز میں بول رہا تھا لیکن کرم علی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ ممکن ہے بوڑھا باتوں میں الجھا کے کچھ کرنے کا خواہش مند ہو۔ چنانچہ وہ پوری طرح مستعد تھا چاقو اس کے ہاتھ میں اس طرح دبا ہوا تھا کہ بوڑھے کی کوئی بھی غلط جنبش اسے حرکت میں لے آئے۔

"تمہیں اپنے پر اعتماد نہیں ہے۔" چند ساعت کے بعد بوڑھے پروفیسر نے اسے
پتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہے' اگر اعتماد نہ ہوتا تو میں تم تک کیسے پہنچ پاتا۔" کرم علی نے
را کر کہا۔

"تو پھر بیٹھ جاؤ۔ میں بوڑھا آدمی ہوں اور میرا ایک پاؤں بھی خراب ہے یعنی
تیزی سے جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ دیکھو پنڈلی کے نیچے کا حصہ مصنوعی ہے۔ کیا تم
ے آدمی سے کسی خطرناک حرکت کی امید رکھتے ہو؟" پروفیسر نے اپنا گاؤن پاؤں پر
سرکایا اور کرم علی نے ایک نگاہ اس کے پاؤں پر ڈالی۔ پاؤں واقعی مصنوعی تھا۔
ں کے علاوہ تم میری تلاشی لے سکتے ہو۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی
سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکوں۔" پروفیسر نے کہا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ تمہاری تجوری کہاں ہے؟"

"کہیں نہیں۔ اس گھر میں تجوری کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن میں تمہیں ایک لاکھ
پے نقد پیش کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے کہا نا' اس وقت مجھے بے چینی سے ایک ایسے شخص کی طلب محسوس
ہی تھی جس کے سامنے میں خود کو پیش کر سکوں۔ جو مجھے جانے اور جس کی نگاہوں
یری کاوشوں کے لئے تحسین کے جذبات ابھر آئیں۔ افسوس وہ میرے نوکر نہیں
کتے۔ کیونکہ ان میں سے ایک تو افیون کھانے کا عادی ہے اور اس وقت وہ چوتھے
ان پر گشت کر رہا ہوگا۔ دوسرا اتنی گہری نیند سوتا ہے کہ اسے رات کو جگانا ناممکن
۔"

"ایک لاکھ روپے کہاں ہیں؟"

"یہیں۔ اسی عمارت میں لیکن تم ساری رات کوشش کر لو۔ اگر انہیں تلاش
و تمہارے۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے وہ ایک لاکھ روپے کیوں دو گے؟"

"اس لئے کہ تم چور ہو اور یہاں چوری کرنے آئے تھے۔ دولت تمہاری طلب

ہے اور اپنی ایماء پر کسی کے سامنے پیش کرنے کی خواہش میرے سینے میں مچل رہی ہے۔ چنانچہ تم میری طلب پوری کرو میں تمہاری۔ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ بکواس مہنگی ضرور پڑ جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم وقت برباد کر کے اس کوشش میں مصروف ہو کہ میرے خلاف کچھ کر سکو۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زیادہ ذہین انسان نہیں ہو۔" بوڑھے نے مایوسی سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"ہاں میں زیادہ ذہین انسان نہیں ہوں اور اسی لئے اپنے کاموں میں جلد بازی بھی کر جاتا ہوں تم اٹھتے ہو یا نہیں۔ یا پھر چاقو تمہاری پشت میں اتار دوں۔" کرم علی نے چاقو لہراتے ہوئے کہا اور بوڑھے کے ہونٹوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ٹھیک ہے اگر تم اس میں بہتری سمجھتے ہو تو یہی کرو۔ یعنی چاقو میرے سینے میں پشت میں یا جہاں چاہو اتار دو لیکن اگر اس سے تمہیں کچھ مل جائے تو یہ بات مجھے بھی سمجھا دو' باقی رہا اس عمارت میں دولت کی تلاش کا معاملہ تو اس کے لئے میں تمہیں پہلے ہی چیلنج کر چکا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ دو۔ رسی اس کونے میں موجود ہے۔ تم اسے دیکھ سکتے ہو۔ مجھے باندھنے کے بعد تم اس عمارت کی تلاشی لے لو' اگر تمہیں کچھ مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ واپس آکر میری رسیاں کھول دینا اور میری باتوں پر عمل کرنا۔" بوڑھے نے کہا اور کرم علی سوچ میں پڑ گیا۔

بوڑھے کی باتیں بڑی ڈرامائی حیثیت رکھتی تھیں۔ بوڑھا اس طرح سے اس کی جانب سے مطمئن تھا جیسے وہ چور ہی نہ ہو بلکہ کوئی دوست ہو جو اس سے ملاقات کرنے کی غرض سے آیا ہو۔ پھر اس نے سوچا کیوں نہ بوڑھے سے تعاون ہی کیا جائے۔ اس عمارت میں جن دو افراد کی موجودگی کا امکان تھا اس کے بارے میں اول تو بوڑھے نے بتا دیا تھا کہ وہ دونوں ناکارہ ہیں۔ دوسرے اگر ان میں سے کوئی پہنچ بھی جاتا تو کرم علی کا کیا بگاڑ لیتا۔ وہ ان دونوں کو بہ آسانی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھا پروفیسر ٹھیک ہے مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن تمہاری باتوں میں سے ایک بھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔" کرم علی نے کہا اور پروفیسر بدستور مسکراتا رہا۔ "سب کچھ سمجھ میں آجائے گا میرے دوست' لیکن شرط یہ ہے کہ تم دماغ

کو ٹھنڈا کر کے تھوڑی دیر میرے ساتھ گفتگو کرو۔"

"میں تیار ہوں۔" کرم علی نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم ایک لاکھ روپے کے بارے میں جھوٹ نہیں بول رہے؟"

"میز کی دراز میں پستول نہیں ہے۔ تم اسے خود کھول کر دیکھ سکتے ہو۔ دراصل میں تمہاری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر نے میز کی دراز کھولی جو اس کے سامنے تھی کرم علی مستعد ہو گیا لیکن پروفیسر نے دراز سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور پھر اس نے انہیں میز پر چن دیا۔ "دور سے دیکھ سکتے ہو۔ پورے ایک لاکھ ہیں۔"

"ہاں۔ پورے ایک لاکھ ہیں۔" کرم علی گہری سانس لے کر بولا۔

"اب یہ تمہارے سامنے آچکے ہیں تو تم انہیں لے بھی سکتے ہو۔ میرا خیال ہے تم ہر طرح مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اس لئے میں تمہیں ان کے حصول سے نہ روک سکوں گا لیکن اگر میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔"

"لیکن مجھے سائنسی مشاغل کے بارے میں نہ تو معلومات ہیں نہ ان سے دلچسپی' پھر میں تمہاری کسی کاوش کو کیا سمجھ سکوں گا؟"

"جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ تم اس میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکو گے۔ مثلاً اگر تمہارا ماضی تصویری شکل میں تمہارے سامنے آجائے تو کیا تمہیں تعجب نہ ہو گا؟ ان لوگوں سے ملو جو تمہاری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکے ہیں تو کیا تمہیں حیرت نہ ہو گی؟ جواب دو۔"

"میں نہیں سمجھا پروفیسر۔" کرم علی تعجب سے بولا۔

"بیٹھو تو تمہیں سمجھاؤں۔ تھوڑی دیر کے لئے چور سے انسان بن جاؤ۔ صرف ایک عام انسان میں تمہارے اوپر کچھ اور اعتماد بھی کروں گا۔ لو یہ گڈیاں جیب میں رکھ لو۔ اب یہ تمہاری ہیں لیکن میرے ساتھ تعاون نہ کر کے تم ایک دلچسپ مشغلہ کھو بیٹھو گے۔" پروفیسر نے نوٹوں کی گڈیاں بڑی لاپرواہی سے سمیٹ کر کرم علی کی طرف بڑھا دیں۔ کرم علی نے اس موقع پر بھی خیال رکھا تھا کہ کہیں پروفیسر کوئی حرکت نہ کر بیٹھے لیکن لکڑی کی ٹانگ والا یہ بوڑھا آدمی کتنا ہی توانا سہی اس پر آسانی سے قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس نے گڈیاں جیبوں میں ٹھونس لیں اور پھر کسی قدر مطمئن لہجے میں

بولا۔ "ہاں پروفیسر اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو لیکن افسوس میں جس پیشے سے تعلق رکھتا ہوں اس میں اس قدر اعتماد جائز نہیں ہے کہ میں یہ چاقو بھی بند کر کے رکھ لوں۔ تمہیں احساس رہنا چاہئے کہ میں کون ہوں اور یہ چاقو بلاوجہ ہی نہیں لئے پھرتا۔"

"تمہارا کام ہوگیا۔ اس کے بعد تمہارے کسی عمل سے مجھے اختلاف نہیں ہے میں تو اپنا تجربہ مکمل کرنے کے بعد اس کی نمائش کے لئے بے چین ہوں۔"

"تم نے میرے ماضی کے بارے میں کیا کہا تھا؟"

"نہ صرف ماضی بلکہ حال اور اس کے بعد مستقبل......... جو گزر چکی ہے تم پر۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے پاؤ۔ جو گزار رہے ہو اسے دیکھو اور اس کے بعد جو گزرنے والی ہے۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟" کرم علی نے تعجب سے پوچھا۔

"پروفیسر گیلانی نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔"

"وہ کس طرح پروفیسر؟"

"پہلے یہ بتاؤ تمہاری بے اعتمادی ختم ہوئی یا جاری ہے؟"

"نہیں......... اب میں تمہارے اس تجربے کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہوں۔"

"ہوں۔" بوڑھے نے گردن ہلائی اس تجربے کی تکمیل بے شمار فوائد کی حامل ہے۔ میں وہ کر دکھاؤں گا جو آج تک ممکن نہیں سمجھا گیا۔" اس نے کرسی سرکائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے کے لئے وہ کوئی سہارا نہیں لیتا تھا لیکن بہرحال مصنوعی پاؤں کی وجہ سے چال غیر متوازن تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ کرم علی اس کے عقب میں مستعد تھا بوڑھے کی چال بہت دھیمی تھی اور وہ بڑی دقت سے چل رہا تھا۔ کرم علی نے اس کے ایک ایک انداز کا جائزہ لیا اور پھر پوری طرح مطمئن ہوگیا کہ یہ بے ضرر بوڑھا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور شاید اس کے ذہن میں کرم علی کے لئے ایسا کوئی خیال بھی نہیں ہے۔ بوڑھا اسی تجربے گاہ کے ایک حصے میں پہنچا اور ایک سفید دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ دروازہ دیواروں سے اس طرح ہم آہنگ تھا کہ بالکل قریب سے ہی نظر آسکتا تھا۔ کنارے پر دو بٹن لگے ہوئے تھے۔

ایک بٹن دبانے پر وہ کھل گیا اور اندر ایک چوکور کمرہ روشن نظر آیا۔

"آؤ۔ آؤ........." بوڑھے نے بے تکلفی سے کہا اور خود اندر داخل ہوا۔

ایک لمحے کے لئے کرم علی کو الجھن سی ہوئی تھی۔ اس کا کام ہوگیا تھا اب ان فضولیات میں پڑنے سے کیا فائدہ لیکن بادلِ ناخواستہ وہ اس کمرے میں داخل ہوگیا۔ اپنے عقب میں اس نے دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا اس کی دیواروں میں ڈائل اور بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ نیچے سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اس کی ایک دیوار پر نیچے کی سمت لگے بٹن دبائے اور کمرے کی دو دیواروں میں سے دو پلیٹیں نکل آئیں۔ یہ بیٹھنے کے لئے نشستیں تھیں لیکن دونوں نشستیں دور دور تھیں۔ یعنی ایک' ایک دیوار میں اور دوسری دوسری دیوار میں۔

"بیٹھو۔" بوڑھے نے اسے اشارہ کیا اور کرم علی اس نشست پر بیٹھ گیا لیکن اس کے ذہن میں الجھن دور نہیں ہوئی تھی۔ خود بوڑھا دوسری نشست پر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے یہاں کتنی دیر لگ جائے گی؟" کرم علی نے پوچھا۔

"زیادہ نہیں۔ یا پھر جتنی تم پسند کرو۔"

"ہاں' میں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتا۔" کرم علی نے کہا اور بوڑھے کے ہونٹوں مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کھیل شروع ہونے دو' پھر تم اسے چھوڑ کر جانے کا نام نہیں لو گے۔ میں دنیا کی یرت انگیز چیز تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ وہ چیز جس سے ابھی میرے علاوہ رف تم واقف ہو رہے ہو۔ کل جب یہ مشین منظرِ عام پر آئے گی تو دنیا میں تہلکہ مچ ائے گا۔ اس کے بعد تم خود پر فخر کرو گے کہ سب سے پہلے اس کا تجربہ تم پر ہوا تھا۔"

ڑھا اس دوران اپنے نزدیک لگے ہوئے بٹن آن کرتا جا رہا تھا۔ پھر ایک آپریشن ٹنڑ اس کے سامنے آگیا جس پر بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ "ہاں دوست میں ہیں کس نام سے مخاطب کروں؟"

"افسوس میں نام نہیں بتا سکتا۔" کرم علی بولا۔

"ٹھیک ہے تمہیں بس مخاطب کرنا تھا کسی بھی نام سے سہی تو میرے اجنبی مہمان اس وقت جس مشین میں بیٹھے ہوئے ہو وہ دنیا کی........."

"مشین میں..........." کرم علی چونک پڑا۔

"ہاں یہ مشین ہے جس میں تم اس وقت موجود ہو اور میں نے اسے بنایا ہے۔ تو میں بتا رہا تھا کہ اس مشین کی کارکردگی کیا ہے۔ دماغ میں لاکھوں خلیے ہوتے ہیں اور ان خلیوں میں ہماری یادداشت کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہ ذخیرہ پس منظر میں ضرور چلا جاتا ہے فنا نہیں ہوتا کیونکہ خلیوں کی تعداد بے پناہ ہوتی ہے۔ تو یہ ذخیرہ گاہ ان تمام یادداشتوں کو محفوظ رکھتی ہے جس کا تعلق ہماری ذات سے ہوتا ہے۔ شعور کا وہ حصہ جہاں سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ نئے خلیے نئی یادداشتیں پیدا کرتے ہیں اور اس کا عمل یہ ہے کہ ہم خود پر بیتی ہوئی وہ باتیں یاد رکھتے ہیں جنہیں زیادہ وقت نہ گزرا ہو لیکن یادداشت کے خانوں سے وہ باتیں محو نہیں ہوپاتیں جو کچھ وقت پہلے بیت چکی ہوں۔ مثلاً کوئی چہرہ جسے ہم بہت پہلے دیکھ چکے ہوتے ہیں ایک طویل عرصے کے بعد ہمارے سامنے آتا ہے تو ہمیں جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے اور ہم اسے پہچان لیتے ہیں کہ یہ کون ہے۔ اگر وہ زیادہ قریب کا نہ ہو تب بھی ہمارا ذہن سوچتا ہے کہ یہ شکل پہچانی ہوئی ہے اور پھر ہم شعور کے ان خانوں کو کریدتے ہیں۔ ان پر دباؤ ڈالتے ہیں جن میں وہ چہرہ محفوظ ہو۔ اس کے بعد ہمیں یاد آجاتا ہے کہ وہ کون تھا۔ اسی طرح کوئی واقعہ کوئی گزری ہوئی بات.........

غالباً تم سمجھ گئے ہوگے کہ ذہن کے خلیوں میں یادداشتیں کس طرح محفوظ رہتی ہیں۔ ہم اپنی یادداشتوں کو ترتیب دے دیتے ہیں مثلاً میں اس وقت سے ابتدا کروں گا جب تمہارے اندر شعور کی بیداری ہوئی اور تم نے اپنے بارے میں' اپنے ماحول کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں اس سے پہلے بھی جاسکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے وہ وقت جب تمہیں پہلی بار بھوک کا احساس ہوا اور تم نے بھوک سے مجبور ہو کر رونا شروع کیا لیکن اس وقت تمہارا شعور پختگی نہیں رکھتا تھا۔ رونے سے تمہارا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ صرف یہ کہ بھوک تمہیں رلا رہی تھی لیکن ایک وقت ایسا آیا جب تم نے بھوک کے بارے میں سوچا اور اس سوچ کا ہر احساس تمہارے خلیے میں پوشیدہ ہوگیا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھا پروفیسر تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ کرو اور مجھے جلدی سے

دو۔" کرم علی نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ پروفیسر کی بکواس اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔

"دیکھو۔ دیکھو ایسی باتیں مت کرو' تم تعاون کا وعدہ کرچکے ہو اور یہ بھی کہہ ہو کہ تم پڑھے لکھے ہو۔"

"ٹھیک ہے لیکن دماغی خلیوں کے بارے میں میں نے کچھ نہیں پڑھا۔" کرم علی جواب دیا۔

"ہاں یہ بات تمہاری درست ہے۔ اچھا تم اسی طرح بیٹھے رہو اور اپنے سامنے دیوار پر دیکھو۔ میں تمہارے چہرے پر روشنی ڈال رہا ہوں جو تمہیں ناگوار نہیں رے گی لیکن تم اپنے آپ کو سویا سویا محسوس کروگے۔ البتہ تمہارے سوچنے اور کی ساری قوتیں بیدار رہیں گی۔ تم درمیان میں مجھ سے کوئی سوال بھی کرسکتے جس منظر کو تم دیر تک دیکھنا چاہو مجھے بتا دینا۔ میں اسے جامد کردوں گا۔" پروفیسر کہا اور پھر اچانک کمرے کی دیوار سے روشنی کی ایک چادر نمودار ہوئی اور کرم اس میں جذب ہوگیا لیکن یہ روشنی اس کی آنکھوں کو نہ تو خیرہ کررہی تھی اور نہ ہی کسی اور تکلیف کا احساس ہوا تھا بلکہ ایک ہلکی ہلکی فرحت اس کی رگ و پے میں گئی تھی۔ پھر اسکے سامنے کی دیوار روشن ہوگئی۔ پروفیسر اپنے سامنے موجود یشن کاؤنٹر پر اپنی ایجاد کنٹرول کررہا تھا پھر اس کی آواز ابھری۔ "اب میں تمہارا رٹول رہا ہوں دوست۔ تمہیں آہستہ آہستہ وہ واقعات یاد آتے جائیں گے جو تم ر چکے ہیں اور شاید ہی دنیا کا کوئی فرد یہ جانتا ہو کہ اس کے تصور کی ابتدا کب ہوئی لیکن...... دیکھو۔ اس اسکرین پر دیکھو۔"

اور کرم علی نے گرج چمک کا ایک منظر دیکھا۔ ایک ننھا سا بچہ سیڑھیاں اتر رہا رات کا وقت تھا اور ماحول تاریک۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ "امی۔" اس نہ سے آواز نکلی۔ اور اسی وقت اوپر سے اس کی امی کی آواز ابھری.........

ے کمو......... کمو........." اور پھر ایک عورت سیڑیاں اترتی ہوئی نیچے آئی راسے گود میں بھرلیا۔ کرم علی کو اپنی ماں یاد تھی لیکن ماں کو اس نے اس شکل میں لا دیکھا تھا۔ انہی خدوخال کی یہ اجنبی تصویر تھی۔

"یہاں سے تمہارے شعور کی بیداری ہوئی۔" پروفیسر نے کہا۔

"تو............ تو یہ میں ہوں۔ یہ میں تھا............؟" کرم علی کے حلق سے گو
گھٹی آواز ابھری۔

"ہاں آگے دیکھو۔" کرم علی نے اپنے باپ کی جوانی دیکھی۔ وہ شیروانی پہنے ا
کی انگلی پکڑے اسکول لے جارہے تھے۔ آہ۔ یہ اس کا قصبہ ہی تو تھا۔ وہ پن چکی جو
کی آواز اسے بہت پسند تھی۔ اس کے نزدیک اینٹوں کا بھٹہ۔ دوسری جانب مکئی
کھیت۔

"بس بیٹے۔ اندر جاؤ۔ ہم واپس جائیں؟" اس کے باپ نے پوچھا۔

"ہاں میں چھٹی ہونے پر اکیلا آجاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"چھٹی ہونے سے پہلے اسکول سے مت بھاگنا بیٹے۔"

"نہیں بھاگوں گا۔"

"اور ہاف ٹائم میں بھٹوں کے کھیت میں مت گھسنا۔" اس کے باپ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"وعدہ کررہے ہو؟" اس کے باپ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اور مسلمان اپنا وعدہ کبھی نہیں توڑتے۔ اچھا خدا حافظ۔" اس کے باپ نے ک
اور اس کے بعد کلاس روم۔ پھر سفیدی لیکن کرم علی کی حالت اب غیر ہوتی جار
تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ تو وہ تھا جو اس کے ذہن میں سو چکا
لیکن وہ اسے بھول تو نہیں سکتا تھا۔

"بچپن کی مخصوص عمر............ تم چاہو تو شعور کی تہوں سے گزرتے رہو یا
آگے بڑھ جاؤ۔ مثلاً میں تمہیں ایک دور سے گزار دیتا ہوں۔" اسکرین پر لہریں
ابھریں اور ایک منظر اجاگر ہوگیا۔ ماں بستر مرگ پر تھی۔ پڑوس اور رشتے کی عورتیں
اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ وہ خود بھی ایک کونے میں کھڑا ہوا بسور رہا تھا اور ظہیر علی
ایک طرف افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"بہتر ہے ظہیر علی اسے شہر لے جاؤ اور کسی اچھے ہسپتال میں داخل کردو۔"

بزرگ نے کہا۔

"اچھا ہسپتال۔ شہر؟" ظہیر علی بولے۔

"ہاں حالت بگڑتی جارہی ہے۔"

"کیا شہروں میں رہنے والوں کو موت نہیں آتی؟"

"پھر وہی الٹی بات۔ ارے بھئی انسان کوشش تو کرتا ہے۔ موت اور زندگی تو
کے ہاتھ ہے۔"

"اللہ تو ہر جگہ موجود ہے۔"

"بے شک لیکن ہسپتال ہر جگہ موجود نہیں ہیں۔"

"میں کس طرح اسے شہر لے جاؤں، میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے ظہیر علی۔" بزرگ تعجب سے بولے۔

"آپ یقین کریں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" ظہیر علی کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی

"میاں تم پٹواری ہو۔ پٹواری تو بے تاج بادشاہ ہوتا ہے۔ جس کا کان پکڑا مال
ال وصول کرلیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے پاس رقم نہ ہو۔"

"افسوس آپ لوگ میرے خاندان سے واقف نہیں ہیں۔ ہماری خاندانی
ت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ آپ یقین کریں کہ میں نے ساری زندگی اپنی کمائی میں
م کا ایک پیسہ شامل نہیں کیا۔"

"اب یہ تمہارا معاملہ ہے ظہیر علی۔ ہمارا تو یہی مشورہ تھا کہ اپنی بیوی کو ہسپتال
جاتے۔" بزرگ شانے ہلا کر بولے لیکن ظہیر علی کے پاس خاندان کے شجرے کے
کچھ نہیں تھا اور یہ شجرہ کسی کام نہ آسکا۔ بیوی مرگئی۔

"تعجب کی بات ہے۔" پروفیسر کی آواز ابھری۔ "خاندانی آدمی ہو پھر تمہارا
پنے باپ سے اختلاف کیسے ہوگیا؟" اور کرم علی چونک پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس
آنکھوں کی کوریں بھیگ رہی ہیں وہ منظر جسے وہ کبھی کا بھلا چکا تھا آج پھر اس کی
نکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ پروفیسر کے سوال نے اس کے بدن میں چنگاریاں بھر
"اس لئے کہ میرے باپ کی سوچ احمقانہ تھی۔ اس کی شرافت اسے کچھ نہ

دے سکی۔" اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خیر تمہاری کہانی تو دلچسپ ہے تھوڑا سا منظر بدلنا چاہئے۔ اسکرین پر پھر لہریں نمودار ہوئیں۔ اور اب وہ شہر میں تھے۔ "یہ.......... یہ تمہارا قصبہ تو نہیں ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے بعد ہم شہر چلے آئے تھے۔"

"تمہارے باپ نے دوسری شادی تو نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"گویا بقیہ وقت اس نے تمہاری پرورش پر صرف کیا۔ کیا وہ زندہ ہے؟"

"نہیں۔" کرم علی نے جواب دیا لیکن اس کے بعد وہ پروفیسر کے سوالات پر توجہ نہیں دے سکا۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر اپنا ماضی دیکھ رہی تھیں۔ اسکول.......... اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ باپ بیمار رہنے لگا تھا لیکن اس کی تلقین اور نصیحت وہی تھی کہ "نیکیوں کے راستے اپناؤ برائی سے بچو۔"

"لیکن ابا جان۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ برائی خوب پھلتی ہے۔ لمبی لمبی کاروں میں گھومنے والے عموماً برے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اسمگلنگ کرتے ہیں۔ چور بازاری کرتے ہیں اور دولت مند بن جاتے ہیں۔"

"ہاں بیٹے ایسا ہوتا ہے لیکن اللہ ان کی رسی دراز کر دیتا ہے اور جب وہ رسی کھینچتا ہے تو اس کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہوتی۔ یاد رکھو برائی کا انجام ضرور برا ہوتا ہے اور ایک دن انسان کو پچھتانا پڑے گا اور پھر ہم.......... ارے ہمارا تو پورا خاندان نیک ناموں سے بھرا پڑا ہے ایک سے ایک فرشتہ صفت، عبادت گزار۔ اپنا شجرہ دیکھو۔ کیسے کیسے بزرگوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمیشہ اپنے شجرے پر نگاہ ڈالو۔ تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ میں نے اپنی زندگی تمہارے لئے وقف کر دی ہے بیٹے.......... اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور ایک دن ملک کے بڑے آدمی بن جاؤ.........."

اور وہ بڑا آدمی بننے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کا باپ اپنا مشن پورا نہ کر سکا اور ایک دن اس سے رخصت ہو گیا اور کرم علی نے ایک دن شجرہ پھاڑ دیا۔

"واہ۔ اسی دن سے شاید تمہاری مجرمانہ زندگی کا آغاز ہوا ہو گا؟" پروفیسر پھر

درمیان میں ٹپک پڑا۔ اس نے ایک سوئچ آف کر کے اسکرین تاریک کر دیا تھا۔

"ہاں میں نے اس شجرے کی غلامی چھوڑ دی میں ان نیکوکاروں کی فہرست سے نکل گیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرے باپ کی غلط سوچ نے ہمیں تباہی کے راستے پر ڈالا تھا۔ وہ ساری زندگی ہمارے لئے کچھ نہ کر سکا۔ پھر میں کیوں اس شجرے کو چاٹتا رہتا؟"

"گویا تمہارے خیال میں نجات کا راستہ صرف برائی ہے۔"

"برائی کیا چیز ہوتی ہے۔ اصل میں اس کا تعین کرنا سخت مشکل ہے۔ لوگوں نے اپنی ناپسندیدہ باتوں کو برائی کا نام دے کر صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ کچھ لوگ جسے برائی سمجھتے ہیں وہی برائی ایک دوسرے انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے اور جو چیز کسی کی زندگی سنوارے اسے برائی کس طرح کہا جا سکتا ہے؟" کرم علی نے پوچھا۔

"زندگی کے لئے چند راستے متعین کئے گئے ہیں اور ان اصولوں کو ساری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کی ضرورتوں کو ان رہنما اصولوں پر کیوں نہ تول لیں۔ اگر یہ ضرورتیں ان اصولوں سے بغاوت پر اکساتی ہیں تو پھر ہم ان ضرورتوں کو ہی ترک کر دیں۔"

"ہاں، ہاں۔ ان میں سے ایک ضرورت میری ماں کی زندگی کے لئے ہسپتال کی تھی۔ علاج کے لئے دولت تھی اور چونکہ یہ ضرورت رہنما اصولوں پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس لئے میری ماں مر گئی۔ کیونکہ میرا باپ اصول پرست تھا۔ وہ پٹواری ہونے کے باوجود کچھ نہیں کما سکا تھا۔"

"وہ سکون سے مر گیا لیکن بے اصولی سکون کی موت چھین لیتی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"مجھے موت سے نہیں سکون کی زندگی سے پیار ہے۔" کرم علی نے کہا۔

"تم اس بے عملی کی زندگی کو سکون کی زندگی کہتے ہو؟"

"ہاں میں خوش ہوں۔ عیش کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"لیکن اس رات کو کیوں بھول جاتے ہو جو تمہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے گی۔"

"وہ رات کبھی نہیں آئے گی پروفیسر۔ میں نے زندہ رہنے کے بے شمار گُر سیکھے ہیں۔ تم ان باتوں کو جانے دو کن الجھنوں میں پھنس گئے۔ تمہاری یہ ایجاد عقل و ہوش کو مفلوج کردیتی ہے۔ میرا ماضی صرف میرے ذہن کے ذریعے میرے سامنے آگیا۔ میں نے ان لوگوں کو جیتا جاگتا دیکھا جنہیں کبھی کا بھول چکا تھا۔ تم نے نہ جانے کون کون سی یادیں تازہ کردی ہیں لیکن تم درمیان میں کیوں رک گئے تم نے کچھ اور بھی تو کہا تھا۔"

"حال؟" پروفیسر گیلانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں' اپنی اس انوکھی ایجاد کے دوسرے پہلوؤں سے بھی تو روشناس کراؤ۔ یعنی میرا حال اور مستقبل کیا ہے۔"

"کیا یہ دنیا کی انوکھی ایجاد نہیں ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"بلاشبہ' لیکن کیا اس میں ہر شخص اپنا ماضی' اپنا حال اور مستقبل دیکھ سکتا ہے؟"

"سو فیصدی۔ کسی انسان کی تخصیص نہیں۔ میں تمہیں اس کی تھیوری بتا چکا ہوں۔ یہ ذہن کے ان سوئے ہوئے خلیوں کو جگاتی ہے جو یادداشت کا کوئی ذخیرہ سمیٹے ہوئے پُرسکون ہوتے ہیں۔ ان خوابیدہ خلیوں کی تحریک ان میں چھپے ہوئے رازوں کو منظرِ عام پر لے آتی ہے اور وہ اس مشین کے عمل سے تصویری شکل اختیار کرجاتے ہیں۔"

"میں سائنسی باتوں کو نہیں جانتا پروفیسر! لیکن تمہاری بتائی ہوئی باتوں سے ایک خیال ذہن میں ابھرتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہ حال کس طرح بتاتی ہے؟"

"خوب' خوب۔ کسی اجنبی انسان کا یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ تم واقعی ذہین انسان ہو۔"

"کیا میرا سوال درست ہے؟"

"بلاشبہ لیکن حال کے بارے میں نہیں۔ میرا خیال ہے دراصل تم مستقبل کی

ات کرنا چاہتے تھے۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہاں۔ مستقبل بھی۔" کرم علی نے کہا۔

"دراصل حال کے بارے میں بتانا تو سب سے زیادہ آسان ہے جن خوابیدہ خلیوں کو چھیڑ کر ماضی تلاش کیا جاتا ہے۔ اس عمل کا ایک معمولی حصہ حال سامنے آتا ہے۔ کیونکہ خلیوں کی یہ پلیٹ بالکل سامنے ہوتی ہے۔ مثلاً یوں دیکھو۔" پروفیسر نے ایک بٹن پھر آن کردیا اور روشنی کا سرور پھر کرم علی کے حواس پر چھانے لگا۔ اس نے خود کو موجودہ شکل میں دیکھا۔ اپنے مخصوص لباس میں وہ سیٹھ چمن کپاڈیا کی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے یہ چوری بخوبی یاد تھی۔ کیونکہ اس میں ایک اور کہانی پوشیدہ تھی۔ وہ کہانی جو دلکش اور سرور انگیز تھی۔

چمن کپاڈیا کی خواب گاہ کے درمیان سے رنگین روشنی چھن رہی تھی۔ طویل و عریض مسہری پر وہ تنہا نہیں تھا۔ موٹا تازہ بے ڈول انسان۔ مسہری کے دوسرے سرے پر ایک حسین وجود سلگ رہا تھا۔ سانولے رنگ کی ایک نوجوان عورت جو شبِ خوابی کے لباس میں سو رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ سیٹھ چمن کے خوفناک خراٹے ابھر رہے تھے۔ کمرے کا ماحول بے حد حسین تھا اور یہ حسن اس وقت اور بڑھ گیا جب بائیں سمت اسے ایک تجوری نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ تجوری کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس کے لباس میں چھپی ہوئی چابیاں نکل آئیں۔ ایک ایک کرکے اس نے ساری چابیاں تجوری پر آزمالیں لیکن کمبخت تجوری تھی کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ چاقو استعمال کیا جائے۔ سیٹھ چمن کو جگا کر اس سے چابیاں طلب کی جائیں چنانچہ وہ واپس پلٹا چاقو اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا اور اسی وقت شب خوابی کے لباس میں لپٹے ہوئے حسین و دلکش وجود میں تحریک ہوئی۔ اس کے جوان نقوش چیخ رہے تھے۔ دوسرے لمحے کرم علی ایک الماری کی آڑ میں ہوگیا۔ نوجوان عورت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ "چھپنے کی کوشش بے سود ہے۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔" اور وہ سناٹے میں رہ گیا لیکن اسے اندازہ تھا کہ سارے ملازم دور سرونٹ کوارٹرز میں ہیں اور کوئی آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے علاوہ اس عمارت میں اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ نڈر ہو کر باہر نکل

آیا۔ حسین عورت کی آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا۔ وہ کسی طرح اس موٹے اور بھدے سیٹھ سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے' بال بکھرے ہوئے تھے۔

"تم جب اندر داخل ہوئے تھے تب بھی میں جاگ رہی تھی۔" اس نے کہا۔

"خوب' میں محسوس نہیں کر سکا تھا۔" اس نے بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چوری کرنے آئے ہو؟" وہ بھی مسکرا کر بولی۔

"ہاں۔"

"تجوری نہیں کھول سکے' اور اب شاید چابیوں کی تلاش ہے؟"

"ٹھیک سمجھا تم نے۔" کرم علی بولا۔

"کافی نڈر معلوم ہوتے ہو۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"پیشے کے اعتبار سے۔" کرم علی نے جواب دیا۔

"عمر کے اعتبار سے بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"جوانی بے خوفی کا دوسرا نام ہے۔"

"ممکن ہے میں نے کبھی غور نہیں کیا۔"

"ہاں لوگ جوانی پر غور نہیں کرتے۔ وہ اچانک آتی ہے اور چپکے سے چلی جاتی ہے۔ لوگ اس پر غور نہیں کرتے اور جب انہیں احساس ہوتا ہے تو پھر لکیر پیٹتے رہ جاتے ہیں۔" عورت نے کہا اور کرم علی نے تعجب خیز نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اس نے سیٹھ چمن کو دیکھا جو بدستور خراٹے لے رہا تھا اور عورت ہنس پڑی۔

"کیوں ہنسی کی کیا بات ہے؟"

"تم اس سے خوف زدہ ہو؟" وہ بولی۔

"کیا یہ بہت گہری نیند سوتے ہیں؟"

"ہاں۔ جب یہ اپنا کوئی بلیک اسٹاک فروخت کر دیتے ہیں تو بہت گہری نیند سوتے ہیں۔ اب یہ صبح دس بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ خواہ تم ان کی گردن کاٹ کر لے

"خوب تجوری کی چابیاں کہاں ہیں؟"

"مل جائیں گی۔ مرے کیوں جا رہے ہو۔ آؤ بیٹھو۔" وہ مسہری پر سرک گئی۔
ان کی آنکھوں میں دعوت تھی اور کرم علی بے وقوف انسان نہیں تھا۔ "کیا تم مجھے ان میں لگا کر ملازموں کی آمد کا انتظار کر رہی ہو؟"

"ملازم اتنی دور ہیں کہ ان کی آمد کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا اور ان کے علاوہ اس طویل و عریض عمارت میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"ویسے یہ تعجب خیز بات ہے۔"

"نہیں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ سیٹھ چمن بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں جوانی کے آنے کی خبر نہیں ہوئی اور وہ حساب کتاب کے رجسٹر کھولے بیٹھے رہے پھر جب جوانی گزر گئی تو انہوں نے گردن اٹھائی اور لکیر پیٹنے کے لئے شادی کر لی۔ اب وہ صرف خراٹے لیتے ہیں اور میں جاگتی رہتی ہوں۔" عورت کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

"اوہ لیکن تم نے ان سے شادی کیوں کی؟"

"یہ طویل داستان ہے۔ صبح سے قبل ختم نہیں ہو گی۔"

"لیکن وہ بات ادھوری رہ گئی۔"

"کسی کے یہاں نہ ہونے کی؟"

"ہاں۔"

"سیٹھ صاحب بہرحال کاروباری آدمی ہیں۔ اچھے برے کی بڑی تمیز ہے ان میں۔ وہ خود جوان نہیں رہے لیکن جوانیوں کو کنٹرول کرنا جانتے ہیں کیونکہ سینکڑوں آدمیوں کے اسٹاف کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس عمارت میں کسی دوسرے انسان کا وجود انہوں نے خطرناک محسوس کیا اور لوگوں کو یہاں سے دور کر دیا۔"

"تمہاری وجہ سے؟"

"ہاں۔ وہ مجھے ہوا سمجھتے ہیں۔" عورت پھر ہنس پڑی۔

"بہرحال چابیاں۔" کرم علی نے کہا اور عورت ایکدم جھلا گئی۔ "کیا بکواس لگا

رکھی ہے تم نے چابیاں چابیاں کی۔ جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے کوئی چابی نہیں ہے۔ قتل کردو مجھے۔ لو پھیر دو چاقو میری گردن پر۔ تم انسان ہو یا جانور۔" وہ بپھر گئی۔ کرم علی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور عورت کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے چاقو بند کرکے جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ "چابیاں کہاں ہیں؟"

"مل جائیں گی چابیاں۔ بدحواس نہ ہو۔ مجھے چمن کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

پھر صبح کو ٹھیک پانچ بجے اسے تجوری کی چابیاں مل گئیں۔ عورت نے اس کی پوری رہنمائی کی تھی اور پھر چلتے وقت اس نے کرم علی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی چند روز تو سیٹھ کپاڈیا اس چوری کا ماتم کرے گا۔ پولیس آئے گی تفتیش ہوگی لیکن تمہارا پتہ کوئی بھی نہیں جان سکے گا۔ میں کہوں گی میں نے چور کو دیکھا تھا۔ ایک دبلا پتلا سوکھا سا مدقوق بوڑھا تھا اور جب سیٹھ کپاڈیا کی بیگم چور کی شناخت کی پوری پوری گواہی دیں گی تو اگر اتفاق سے تم گرفتار بھی ہوگئے تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کیونکہ میں تمہیں پہچاننے سے انکار کردوں گی۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں۔" کرم علی نے مسکرا کر اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے۔

"تو پھر ان ہنگاموں کے بعد تم کسی دن دوبارہ چوری کرنے آجانا۔" اس نے دعوت دی اور کرم علی نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ بیوقوف عورت' عورت کا جال مردوں کی گردن میں ہمیشہ پھانسی کا پھندا بن جاتا ہے۔ دوبارہ چوری کرنے کے لئے تیرا ہی گھر رہ گیا ہے ممکن ہے چمن کپاڈیا اس سلسلے میں بھی ذہین ہی ثابت ہو چنانچہ وہ وہاں سے چلا آیا۔

دیوار کے سفید پردے پر زندگی کے وہ واقعات بھی ابھرے جنہیں بیتے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ ان میں حسین اور پیشہ ور عورتوں کی بہتات تھی۔ کرم علی کے وہ سارے کرتوت تھے جو اس نے اس دوران انجام دیئے تھے۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوا اور بعض سے اس کے ذہن کی سرور انگیزیاں تازہ

ہ گئیں۔ حال کا یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ اس نے پروفیسر گیلانی کے ہاں چوری کرنے ا منصوبہ بنایا اور اس کے مکان تک اور پھر اس کے سامنے پہنچ گیا یہاں آنے کے بعد فید دیوار پھر سادہ ہوگئی اور کرم علی کا ذہن جاگ اٹھا۔

پروفیسر نے بٹن آف کردیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیلی ہوئی ی۔ "تو گویا تمہارا حال واقعی شاندار رہا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن رم علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ ایک احساس ایک خیال اس کے لئے ہانِ روح بن گیا تھا اور اس خیال کے تحت اس نے پروفیسر گیلانی کی جانب دیکھا اور ک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

کیا خیال ہے' کیا تمہارا یہ حال اسی طرح جاری رہے گا۔" پروفیسر نے پوچھا اور رم علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے ارے بیٹھو بیٹھو۔ کیا ہوگیا؟" پروفیسر نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں پروفیسر۔" کرم علی سرد لہجے میں بولا۔

"پوچھو۔"

"کیا میرا ماضی اور حال میرے لئے پھانسی کا پھندا نہیں بن سکتا؟"

"کیا مطلب؟" پروفیسر نے تعجب سے پوچھا۔

"مقصد یہ کہ تم میری شخصیت سے پوری طرح واقف ہوگئے ہو تم نے میرے ان کی جھلکیاں بھی دیکھ لی ہیں اور میرے زندگی گزارنے کا انداز بھی۔ کیا تم میرے نے کے بعد پولیس کو میرے بارے میں تفصیل نہیں بتاؤ گے اور کیا پولیس مجھ تک یں پہنچ سکتی؟"

"اوہ' اول تو میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا لیکن اگر میں تمہارے رے میں بتاؤں گا بھی تو کیا بتاؤں گا۔ تمہارے ذہن کی تصویریں اس دیوار پر فلم کی رح دوڑتی رہی ہیں لیکن یہ فلم میرے پاس محفوظ تو نہیں ہے۔ میں آخر کس بات کی اندہی کرسکوں گا؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"تم ایک ذہین انسان ہو پروفیسر۔ تمہارے سائنسی ذرائع نہ جانے کیا کیا گل لائیں۔ ممکن ہے تم نے میرے ذہن کا عکس کسی مخصوص ذریعہ سے کہیں منتقل کردیا

ہو اور میرے چلے جانے کے بعد تم حاصل شدہ فلم پولیس کو پیش کر دو۔" کرم علی نے
کہا اور پروفیسر اچھل پڑا۔ تعجب خیز نگاہوں سے کرم علی کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے
مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "نہیں میرے دوست۔ میں نے اب تک ایسا نہیں کیا لیکن
یقین کرو تم نے اس وقت ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ تم نے ایک نیا خیال پیش کیا ہے
میں نے اب تک اس بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن یہ تو ممکن ہے یہ آسانی سے ہو سکتا
ہے۔ خیالات کی ان تصویروں کو ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی فلم تیار کی جاسکتی ہے۔
اور اس طرح اس فلم کو بار بار چلا کر بہت سی پیچیدہ گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔ یہ مشین
بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بڑے بڑے مجرموں کے خلاف اس سے ثبوت حاصل
کئے جاسکتے ہیں۔ ان سے ان کا ماضی اگلوایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہسپتالوں میں
مریضوں کے حالات زندگی سے ان کے امراض کا پتہ چلایا جاسکتا ہے لیکن ان خیالات
کی فلم.......... واہ.......... میں تمہیں اس طرف توجہ دلانے پر مبارکباد پیش کرتا
ہوں۔ یقیناً تم نے میرے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا کیا ہے۔"

"تم پھر چالاکی سے کام لے رہے ہو پروفیسر.........." کرم علی نے طنزیہ لہجے
میں کہا۔

"کیوں۔ کیا مطلب؟"

"تم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے ذہن میں پہلے سے اس فلم کا خیال نہیں تھا
اور تم نے کوئی فلم نہیں بنائی۔"

"ظاہر نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ حقیقت ہے۔"

"بکواس کرتے ہو۔ تم اتنے بے وقوف نہیں نظر آتے بلکہ ایک لاکھ روپے ادا
کر کے تم نے یہی سوچا کہ اس سے تمہاری جان بھی بچ جائے گی تمہارا تجربہ بھی
ہو جائے گا اور رہا میں.......... تو میرے بارے میں تم اتنا کچھ جان گئے ہو کہ میں بچ
نہیں سکتا۔ تمہاری یہ فلم میرے خلاف زبردست ثبوت بن جائے گی اور تم بہ آسانی
میری نشاندہی کرو گے۔" کرم علی نے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تم پھر بہک رہے ہو نوجوان۔ اب تک ہم جس ماحول جس انداز میں گفتگو
کرتے رہے ہیں۔ کیا اس کا تقاضا یہی ہے کہ تم پھر اپنی اصلیت پر اتر آؤ۔ میں نے

ی ذات پر تجربہ کیا ہے اور ایک طرح سے تم میرے معاون بن گئے ہو بلکہ اس
خیال دلانے پر میں تمہارا شکر گزار بھی ہوں لیکن اس کے بعد اس قسم کی باتیں
ے تم میرے ذہن کو خراب کر رہے ہو اور بہرحال یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"پروفیسر میں جس پیشے سے ہوں اس میں میرا سابقہ اچھے لوگوں سے نہیں پڑتا۔
لوگوں سے نمٹنے کے لئے مجھے پوری مستعدی اور ذہانت سے کام کرنا پڑتا ہے۔
نے آج تک قتل و غارت گری نہیں کی اور ہمیشہ اس سے بچتا رہا ہوں لیکن چونکہ
میری زندگی کو خطرہ لاحق ہے اس لیے مجبوراً مجھے زندگی میں پہلی بار کسی کو قتل کرنا
گا۔ نہیں پروفیسر نہیں۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔
ں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا تو مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" کرم علی
ا تو نکال لیا اور پروفیسر سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"دیکھو نوجوان' برائیوں میں اس قدر آگے نہ بڑھ جاؤ کہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھو۔
رائے ہے کہ سنجیدگی سے بیٹھ کر میرے ساتھ گفتگو کرو اور ایک اچھے انسان کی
ے یہاں سے واپس جاؤ۔"

"پروفیسر یہ بات ممکن نہیں ہے۔ ورنہ میں تمہاری ہدایات پر عمل ضرور کرتا۔"

"لیکن بے وقوف انسان ابھی تو ہمارے سارے کام مکمل بھی نہیں ہوئے۔"

"کیا مطلب؟" کرم علی نے پوچھا۔

"کیا ابھی اس مشین کا تیسرا حصہ باقی نہیں رہ گیا؟"

"یعنی مستقبل؟" کرم علی دلچسپی سے بولا۔

"ہاں.......... مستقبل' جو انسان کے لئے سب سے زیادہ دلکش ہوتا ہے۔"
سر نے جواب دیا۔

"یہاں بھی مجھے اعتراض ہے پروفیسر' ماضی اور حال کے واقعات بقول تمہارے
ا کے لاشعور یا شعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور خلیوں کی تحریک انہیں کرید کر باہر
لتی ہے لیکن مستقبل تو ان دیکھا ہوتا ہے۔ اس کا ہمارے ذہن سے کیا تعلق؟"

"بہت ہی ذہانت کا سوال کیا ہے تم نے۔ بلاشبہ تم اپنے فن میں بھی یکتا ہو گے۔
ذہین آدمی جو عمل کرے وہ مکمل اور جامع ہوتا ہے۔ بے شک مستقبل کا تمہارے

ذہن سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ کام اس مشین کا ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

"نہیں پروفیسر۔ چونکہ اب معاملہ صرف اس مشین کا ہے اور میرے ذہن سے میرے مستقبل کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے اب میرے یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ دراصل یہ روشنی میرے اعصاب مضمحل کردیتی ہے اور اب میرے لئے کسی طور مناسب نہیں ہے کہ میں مستعد نہ رہوں۔ تمہاری یہ مشین میرے مستقبل کے بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"خیر تمہاری مرضی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ اس مشین کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ماضی اور حال کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ مستقبل کا فیصلہ خود کرتی ہے۔ گویا یہ اس کی اضافی کارکردگی ہے۔ یوں سمجھ لو یہ ان حالات کے تحت پیش گوئی کرتی ہے اور میرے خیال میں مشینی پیش گوئی غلط نہیں ہوتی۔"

"تو آپ کی یہ مشین میرے لئے کیا پیش گوئی کرتی ہے پروفیسر؟" کرم علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پروفیسر گردن ہلا کر سامنے رکھے آپریشن بورڈ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے کئی بٹن دبائے اور سامنے کی دیوار پر تصویری عمل جاری ہوگیا۔ کچھ مٹے مٹے سے نقوش ابھرے اور اس کے بعد ایک نقطہ نمایاں ہوگیا۔ "یہ تمہارے مستقبل کی تصویر ہے۔ یعنی بعد کے چند لمحات یا چند گھنٹوں کی پیش گوئی۔" پروفیسر کی آواز ابھری اور کرم علی اسکرین کی جانب دیکھنے لگا اور پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ پولیس افسران کے نرغے میں تھا۔ ایک ڈی ایس پی، ایک انسپکٹر اور چند کانسٹیبل موجود تھے اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جارہی تھیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پروفیسر گیلانی بھی ان کے درمیان موجود تھا اور........ اور کمرے کا منظر بھی یہی تھا۔ چاروں طرف مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ منظر دیکھا اور پروفیسر نے سامنے لگے بٹن آف کردیئے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "مستقبل قریب کی ایک جھلک تم نے

ہی۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ ضروری نہیں ہے کیونکہ مستقبل کا حال معلوم کے انسان پر بددلی طاری ہوجاتی ہے اور میں تمہیں بددل نہیں کرنا چاہتا۔"

"لیکن پروفیسر یہاں تمہاری مشین نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔" کرم علی سفاک میں بولا۔

"کیوں؟"

"اس مشین کو دوسرا منظر پیش کرنا چاہئے تھا۔ اس منظر میں، میں تمہیں ذبح کررہا تا اور پھر یہاں سے نکل رہا ہوتا کیونکہ اب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"مشین جھوٹی نہیں ہے۔ اس نے وہی منظر پیش کیا جو ابھی کچھ وقت کے بعد عمل آجائے گا اور اس کی تیاریاں مکمل ہیں۔"

"وہ کس طرح پروفیسر؟" کرم علی بدستور سفاک لہجے میں بولا۔ دل ہی دل میں پروفیسر کو قتل کرنے اور اس مشین کو تباہ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

"دیکھو اس طرح۔" پروفیسر نے کنٹرول بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور ایک ہلکی سی سراہٹ کی آواز ابھری اور پروفیسر کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ئی۔ "اب تمہارے اور میرے درمیان شیشے کی ایک موٹی دیوار حائل ہوچکی ہے۔ اس دیوار کو کسی شدید ترین ضرب سے بھی نہیں توڑ سکتے اور نہ وہ دروازہ کھول تے ہو جو تمہارے قریب ہے اور جس سے داخل ہوکر میں اور تم اندر آئے تھے۔ شش کرو اور مجھے بتاؤ کہ میری بات غلط تو نہیں ہے؟" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے ہا اور کرم علی بری طرح بدحواس ہوگیا۔ اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی ن دروازہ؟ اسے کھولنے کا تو کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے دانت پیستے ہوئے وفیسر پر لپکنے کی کوشش کی لیکن شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر اسے بری طرح چوٹ لگی ی۔

"دراصل مشین میں داخلے کا راستہ وہ ہے اور باہر نکلنے کا راستہ میری پشت پر ہے۔ یہ دیکھو۔" پروفیسر نے ایک بٹن دبایا اور اس کی پشت پر دروازہ کھل گیا۔ "اب ں اس راستے سے باہر جاؤں گا اور اپنے دوست ڈی ایس پی کو ٹیلی فون کروں گا کہ ن کے لئے ایک تحفہ موجود ہے اور اس کے بعد مشین کی پیش گوئی پوری ہوجائے

گی۔ اچھا اب بہت وقت ہو گیا ہے میں چلتا ہوں ان لوگوں کے آنے میں بھی کچھ وقت لگے گا اور پھر دوسری کارروائی۔ مجھے سونا بھی ہے۔" پروفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆
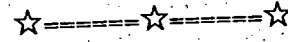
خان بابا کا قانون

بچپن کے دو دوستوں کی کہانی جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں جوان ہو گئے تھے۔
دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔
ایک دلیر تھا تو دوسرا ذہانت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

یہ کہانی آزاد ریاست جمال پور کے ایک اسکول سے شروع ہوئی تھی۔ خطرناک پہاڑوں اور خوفناک جنگلوں سے ملحق ریاست جمال پور، دلیر اور خونخوار انسانوں کا مسکن تھی۔ یہاں کے باشندوں کو بیرونی دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تہذیب کے گہواروں سے نفرت کرتے تھے جہاں کا انسان نام نہاد تہذیب کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنی اقدار اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے۔ تہذیب کے نام پر گھناؤنے جرائم ہوتے ہیں۔ تہذیب کے ٹھیکیداروں نے سماج کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ برق صرف ان لوگوں پر گرتی ہے جو بے سہارا ہوتے ہیں۔ قانون صرف ان کے لئے بنتے ہیں جو کمزور ہیں۔ طاقتور کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ ہر قانون طاقتور انسان کے زیرِ نگیں ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ریاست کا ہر خان بیرونی دنیا کی ہر امداد کو ٹھکراتا آیا تھا انہوں نے بیرونی دنیا کا کوئی رنگ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ہاں تمام ضروری باتیں انہوں نے اپنالی تھیں۔ وہ جدید دنیا کی طرح رہن سہن کے قائل تھے۔ ان کے ہاں تعلیم بھی ہوتی تھی۔ زراعت اور دوسری چیزوں کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ ہر کام ضرورت کے مطابق ہوتا تھا اور بستی کے باشندے خوش حال تھے۔ روٹی ان کی ضرورت تھی۔ لباس ان کی ضرورت تھی۔ باقی دوسری ضرورتوں کو انہوں نے محدود کرلیا تھا البتہ روٹی اور لباس کی ان کے یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔

سرخ وسفید، تندرست و توانا لوگوں کی اس بستی کا اپنا قانون تھا۔ یہاں چوری کی سزا دی جاتی، زنا کی سزا تھی، قتل کی سزا تھی۔ پولیس کا محکمہ بھی تھا جس کے فرائض مخصوص تھے اور اختیارات بھی۔ کسی شخص کو اپنے اختیارات سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور اگر کوئی شخص حدود سے تجاوز کرتا تو اس کے لئے مناسب سزا بھی موجود تھی۔

ہاں تو یہ کہانی اس دن سے شروع ہوئی جب بارہ سال کا تندرست وتوانا بچہ دلاور کول میں داخل ہوا۔ کشادہ پیشانی، فراخ سینہ، ذہانت سے بھرپور آنکھیں، مسکراتے نٹ، پڑھنے لکھنے میں بھی تیز تھا۔ ابراہیم نے اسے خاص نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"تمہارا کیا نام ہے دوست؟" اس نے چھٹی کے بعد دلاور سے پوچھا۔

"دلاور۔" دلاور نے اکڑ کر جواب دیا۔

"مجھے جانتے ہو؟" ابراہیم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیسے جان سکتا ہوں۔" دلاور نے شانے اچکائے۔

"تو جان لو۔ میرا نام ابراہیم ہے۔ میرے دوست فائدے میں رہتے ہیں اور دشمن صان میں۔" ابراہیم نے گردن اکڑا کر کہا۔

"میں کسی کی پناہ کا قائل نہیں ہوں۔ جہاں ہوتا ہوں وہاں میرا ہی نام ہوتا ہے۔ نانچہ تم اور تمہارے دوست اگر فائدے کے قائل ہیں تو کبھی دلاور کے سامنے گردن نہ ٹھائیں۔"

"اس کا فیصلہ خان بابا کے قانون کے مطابق ہونا چاہئے۔" ابراہیم نے اپنے موٹے زو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"تب پھر آجاؤ۔ مجھے خان بابا کا قانون معلوم ہے۔" دلاور نے اپنا بستہ رکھتے ہوئے ہا اور ابراہیم نے بھی مسکراتے ہوئے اپنا بستہ نیچے رکھ دیا۔ سونی جھیل کے کنارے کی م مٹی فیصلے کے لئے منتخب کی گئی اور لڑکوں نے ان دونوں کے گرد ایک کشادہ دائرہ بنالیا۔ تا دلچسپ کھیل بہت دن کے بعد دیکھنے کو ملا تھا۔

دونوں مقابل قمیضیں اتار کر ایک دوسرے کے سامنے آگئے اور دیکھنے والوں نے یکھا کہ دونوں شیر ہیں۔ کسی کے تیور دوسرے سے کم نہیں تھے، اور پھر دونوں ایک وسرے پر جھپٹ پڑے۔ دلاور نے لپک کر ابراہیم کی گردن پکڑلی اور بغل میں دبالی۔ براہیم نے اس کی کمر پکڑلی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو گرانے کی فکر میں تھے لیکن ابراہیم کی گردن بری طرح پھنس گئی تھی اور وہ کچھ بے بسی محسوس کررہا تھا تاہم دلاور بھی شکل میں تھا۔ ابراہیم کی گرفت اتنی سخت تھی اور وہ دلاور کو ایسے گرائے دے رہا تھا کہ دلاور کو اس کی گردن پر گرفت قائم رکھنا مشکل ہورہا تھا۔ یہاں تک کہ دلاور نے ابراہیم

کی گردن چھوڑ دی اور ابراہیم نے اس کی کمر۔ دونوں پھر سامنے آگئے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے پر تولنے لگے۔

ایک بار پھر وہ ایک دوسرے پر جھپٹے اور آپس میں گتھ گئے۔ لڑکے شور مچا مچا کر دونوں کی ہمت بڑھا رہے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے لئے ٹیڑھی کھیر تھے۔ تب اچانک لڑکوں نے سامنے دیکھا۔ بوڑھے استاد خان چلے آرہے تھے۔ دوسرے لمحے لڑکے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے لیکن یہاں آن کا سوال تھا۔ میدان خالی ہوگیا تھا۔ استاد خان کو اطلاع مل گئی تھی لیکن اگر ایک دوسرے پر گرفت ہلکی کرتا تو دوسرا اسے ضرور پٹخ دیتا۔ یہاں تک کہ استاد خان نزدیک پہنچ گئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہ بیٹو! چھوڑو ایک دوسرے کو۔" استاد خان غرائے پھر کس کی مجال تھی کہ ان کے حکم کی تعمیل نہ کرتا دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔

"کیوں لڑ رہے تھے تم دونوں۔" استاد خان نے دونوں کے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کسی کے ظرف نے گوارہ نہ کیا کہ ایک دوسرے کی شکایت کرکے استاد خان سے پٹوائے۔ یہ آپس کی بات تھی، وقار کا سوال تھا آپس ہی میں طے ہونی چاہئے تھی لیکن دلاور نے بولنے میں پہل کی۔

"کھیل رہے تھے استاد بابا۔"

"ہاں استاد بابا ہم دونوں کھیل رہے تھے۔"

"یہ لڑائی جھگڑے کا کھیل۔" خان بابا غرائے۔

"اب نہیں کھیلیں گے۔" ابراہیم نے کہا۔

"چلو گھر جاؤ۔ اٹھاؤ بستے۔" استاد بابا نے کہا اور دونوں نے بستے اٹھائے اور پھر وہ استاد بابا کے پیچھے چل پڑے۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" ابراہیم نے سرگوشی کی۔

"دولہا بابا میں اور تم؟"

"چڑھائی پر۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"تم نے دیکھا، تمہارے سارے طفیلی بھاگ گئے۔"

"بزدل تھے۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"تب آؤ۔ ہم دوستی کرلیں۔" دلاور بولا اور ابراہیم چونک کر رہ گیا۔ استاد بابا دور نکل گئے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور دوسرے دن اسکول کے لڑکوں نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ اسکول میں داخل ہوتے دیکھا۔ استاد بابا نہیں آئے تھے اس لئے سب ان کے گرد جمع ہوگئے۔

"کیا ہوا ابراہیم کل کس نے کس کو پچھاڑا؟"

"ارے استاد بابا نے ان دونوں کو پچھاڑ دیا ہوگا اب فیصلہ ہوجائے۔" کسی دوسرے نے کہا۔

"بکو مت کسی نے کسی کو نہیں پچھاڑا۔ ہاں بھاگنے والے بزدل سامنے آگئے۔ آج سے صرف دلاور میرا دوست ہے۔ دس بزدل دوستوں سے ایک بہادر دوست اچھا ہے۔"

اور اس طرح دوستی کی بنیاد پڑ گئی اب دلاور اور ابراہیم ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے تھے لیکن دونوں ہی تند خو اور سخت مزاج تھے۔ اکثر بچے سونی جھیل کے کنارے کھیلتے تھے لیکن یہ دلاور ہی کی پیش کش ہوتی تھی کہ پولیس اور ڈاکو کا کھیل کھیلا جائے اور اس کھیل میں اگر دلاور ڈاکو بنتا تو ابراہیم پولیس افسر۔ ڈاکے پڑتے مقابلہ ہوتا۔ دونوں میں سے کوئی کامیاب نہیں ہوتا تھا۔

"ایسے کھیل سے فائدہ دلاور۔ ڈاکو پکڑا ہی نہیں جاتا۔" ایک دن ابراہیم نے جھلا کر کہا۔

"پولیس والا کمزور ہے۔ ڈاکو کو کیسے پکڑ سکتا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ دراصل پولیس والا ڈاکو کا دوست ہے اس لئے رعایت کرتا ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"کھیل میں دوستی کیسی۔ تم اگر پکڑ سکتے ہو تو ڈاکو کو پکڑ لو ورنہ ہار مان لو۔" دلاور نے کہا اور ابراہیم کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ وہ دلاور کو گھورتا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے آج سے دوستی ختم۔ اب میں پولیس افسر ہوں اور تم ڈاکو۔ آؤ اب کھیلتے ہیں۔"

"آؤ۔" دلاور نے کہا اور پھر ایک خطرناک کشمکش شروع ہوگئی۔ دلاور نے ڈاکہ ڈالا اور ابراہیم اسے پکڑنے دوڑا لیکن دلاور نے جھیل میں چھلانگ لگادی اور نیچے ہی نیچے

تیرتا رہا۔ ابراہیم اسے کہاں چھوڑنے والا تھا وہ بھی جھیل میں غوطے لگانے لگا اور پھر جب وہ دلاور کو تلاش کرنے میں ناکام رہا تو جھیل سے نکل آیا۔

"شاید دلاور ڈوب گیا۔" اس نے دوسرے لڑکوں سے کہا۔

"نہیں۔ میں نے اسے جھیل سے نکل کر کنارے کے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔" ایک لڑکے نے کہا اور ابراہیم نے ایک بار پھر جھیل میں چھلانگ لگادی تھی۔ دوسرے لمحے وہ دوسرے کنارے پر تھا۔ دلاور درخت پر بیٹھا تھا لیکن بدقسمتی سے ابراہیم کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ وہ بے بسی سے دلاور کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے دلاور' میں درخت پر چڑھنا بھی سیکھوں گا۔ پھر میں تمہیں پکڑ کر دکھاؤں گا۔"

"سنو ابراہیم۔ تم بوڑھے بھی ہوگئے تو مجھے نہ پکڑ سکو گے۔" دلاور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ بڑے ہو کر تم ڈاکو بننا اور میں پولیس افسر۔ پھر ایک دن میں تمہیں گرفتار کرکے پھانسی کی سزا دوں گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو فکر مت کرو' ایسا ہی ہوگا اور فیصلہ ہوجائے گا۔"

اور کاتبِ تقدیر اس وقت شاید جھیل کے کنارے موجود تھا۔ اس نے ان دونوں بچوں کی خواہش اپنے رجسٹر میں درج کرلی۔ وقت نے چھلانگ لگائی اور بچپن کی کہانی پیچھے چھوڑ گیا۔ وقت کی نئی آنکھوں نے ایک قوی ہیکل جوان کو دیکھا جس کے چہرے پر جلال تھا۔ جس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپتی تھیں اس کے توانا جسم پر پولیس افسر کی وردی تھی اور وہ جمال پور کا ایک ذہین افسر تھا۔ وقت نے ایک دوسری شکل بھی دیکھی ایک اور توانا جسم سیاہ کپڑے سے منہ چھپائے۔ طاقتور سیاہ گھوڑے پر سوار' دونوں طرف پستول لٹکائے جمال پور کی ذیلی بستی گواہ میں داخل ہوا۔ روشنی نے تاریکی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ستاروں نے آسمان سے جھانکنا شروع کردیا تھا اور بستی کے چراغ شرمائی ہوئی نگاہوں سے آسمان کو دیکھنے لگے تھے۔ سیاہ گھوڑا بستی کے خان آزور کے عالی شان مکان کے سامنے رک گیا اور قوی ہیکل سوار گھوڑے کی پشت پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ ایک کھڑکی

میں پھنسائے اور پھر اپنے مضبوط جسم کو بلند کرتا گیا۔ دوسرے لمحے وہ کھڑکی سے اندر تھا۔ کھڑکی ایک کمرے میں کھلتی تھی وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور پھر دروازے کے کواڑ دھکیل کر وہ عمارت میں داخل ہوگیا۔ اس نے دونوں ریوالور ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔ بوڑھا خان لرز گیا۔ قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"تم کون ہو تم' کیا چاہتے ہو؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"تمہاری دولت خان آزور' اور اگر وہ نہ ملی تو تمہاری دونوں لڑکیوں کی زندگی۔" سیاہ پوش نے جواب دیا۔

"مگر تم کون ہو؟"

"دلاور۔" سیاہ پوش نے چہرے سے کپڑا ہٹاتے ہوئے کہا اور آزور خان کی بیوی ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہوگئی۔

"دلاور۔" خان آزور لرزتی آواز پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ان لڑکیوں کے لئے کیا ہے اور اب میں دوبارہ ان کے لئے کچھ نہ کرسکوں گا اگر تم مجھے معاف کردو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"اپنی آدھی دولت مجھے دے دو آزور خان۔ آدھی ان کے لئے رہنے دو ورنہ........" دلاور نے لڑکیوں کی طرف پستول تان لئے۔

"نہیں نہیں رک جاؤ۔ میں تیار ہوں۔" خان آزور نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "تم انتظار کرو' میں رقم لاتا ہوں۔"

"صرف دس منٹ۔" دلاور نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔ "اگر اس سے زیادہ وقت لگایا یا کوئی حرکت کی تو تم پستول چلنے کی دو آوازیں سنو گے اور واپس آکر دیکھو گے تو یہ دونوں لڑکیاں خاک و خون میں تڑپ رہی ہوں گی۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔ میری بچیوں کو نقصان نہ پہنچانا۔" خان آزور نے لرزتے ہوئے کہا اور بوڑھے قدموں سے باہر نکل گیا لیکن تجوری سے رقم نکالتے ہوئے اس کی نگاہ پستول پر پڑی۔ ذہن بھٹک گیا۔ محنت سے جمع کی ہوئی دولت کا لالچ آگیا اور اس نے نوٹوں کی گڈیوں کی آڑ میں پستول بھی چھپالیا پھر وہ واپس آگیا۔ دلاور اس کا انتظار کررہا تھا۔ بوڑھے آزور خان کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور آزور خان نے نوٹ اس کی

طرف بڑھا دیئے' دلاور نے ایک پستول ہولسٹر میں لگالیا اور لڑکیوں کی طرف سے بے پروا ہو کر نوٹ لینے آگے بڑھا اور اسی لمحے آزور خان کا پستول سامنے آگیا لیکن بوڑھا آزور خان دلاور سے زیادہ پھرتیلا نہیں تھا اس کے فائر کرنے سے قبل دلاور کے پستول سے گولی نکلی اور آزور خان کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ آزور خان کی دلدوز چیخ گونجی اور دلاور کا قہقہہ۔ اس نے آگے بڑھ کر خون آلود نوٹوں کو قبضے میں کیا اور آزور خان کی لڑکیوں کو بلکتا ہوا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا مشکی گھوڑا قلانچیں بھر رہا تھا۔

اسے یاد نہیں تھا کہ یہ اس کا کون سا کامیاب ڈاکہ ہے۔ پورا جمال پور دلاور کے خوف سے کانپتا تھا۔ ہر بستی میں اس کا نام تھا۔ جمال پور کے خان نے بہترین دماغ دلاور کی گرفتاری پر لگا رکھے تھے اور دوسری طرف ابراہیم' دلاور کی تاک میں تھا۔ بچپن کا چیلنج وہ بھی نہیں بھولا تھا۔ وہ اپنے طور پر کوشش میں مصروف تھا اور اس کے قدم آہستہ روی سے لیکن بڑی مضبوطی سے دلاور خان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اور آج کی رات وہ پوری تیاریوں سے دلاور خان کے راستے میں آیا تھا۔ پولیس کے بیس جوان اس کی سرکردگی میں وردی میں چھپے ہوئے تھے اور خود ابراہیم ایک بلند چٹان پر دلاور خان کا منتظر تھا کہ دلاور اس راستے سے گذرے گا اور آج وہ دلاور پر بھرپور ضرب لگانا چاہتا تھا۔ آسمان پر چاند نے سر ابھارا اور پہاڑیاں روشنی میں نہا گئیں۔ ابراہیم کی نگاہیں راستے پر لگی ہوئی تھیں اس کے دل میں عجیب سے احساسات تھے۔ قاتل اور ڈاکو دلاور سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی وہ اس کا سخت دشمن تھا اور ہر قیمت پر اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ پھر روشنی میں دور سے ایک سیاہ گھوڑا آتا نظر آیا اور ابراہیم چونک پڑا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے ایک مخصوص اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا اور تیار ہوگیا۔ اس کی طاقتور رائفل بدکردار ڈاکو کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے تیار ہوگئی اور پھر پہلی گولی اس وقت چلی جب دلاور بالکل نزدیک آگیا گولی گھوڑے کے پیٹ میں لگی تھی۔ گھوڑے نے زبردست ٹھوکر کھائی اور دلاور اس پر سے نیچے آرہا۔ اس نے پھرتی سے کھڑے ہو کر پستول نکالا' لیکن اسی وقت دوسری گولی اس کے پیروں کے بالکل قریب زمین سے کرچیاں اڑا گئی اور پھر چاروں طرف سے بہت سی گولیاں اس کے دائیں بائیں زمین پر لگیں۔ تب ابراہیم کی آواز ابھری۔

"ڈاکو دلاور۔ ہتھیار پھینک دو۔ تم ایکس رائفلوں کی زد میں ہو۔ میں تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں لیکن تم نے کوئی حرکت کی تو پھر تمہاری لاش لے جانے میں بھی مجھے نہ ہوگی۔"

دلاور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بے شک پوزیشن نازک تھی۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ گھوڑا تڑپ رہا تھا اور دم توڑنے والا تھا۔ اس وقت مقابلے کی کوشش خودکشی کے مترادف تھی۔ اس نے پستول پھینک کر ہاتھ اٹھا لئے۔

"دوسرا پستول بھی دلاور۔ میرا نام ابراہیم ہے۔" آواز پھر ابھری اور دلاور چونک پڑا۔ وہ چند لمحے سکتے میں مبتلا رہا پھر اس نے دوسرا پستول بھی نکال کر پھینک دیا۔ تب چاروں طرف سے پولیس والے نکل پڑے اور انہوں نے دلاور کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ابراہیم نے رائفل کندھے سے لٹکا کر پستول نکال لیا تھا پھر وہ ہتھکڑیوں کا جوڑا لے کر دلاور کی طرف بڑھا۔

"کیا خیال ہے دلاور کیا میں اپنا بچپن کا عہد پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوگیا؟" ابراہیم نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابراہیم۔ اگر بچپن کے عہد کی بات کرتے ہو' تو تم نے بے ایمانی سے کام لیا ہے۔" دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"مقابلہ صرف تمہارا اور ہمارا تھا۔ اس میں یہ بیس جوان کہاں شامل تھے؟"

"یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ میں ایک پولیس افسر ہوں اور تم مجرم۔ یہ سب پولیس کے جوان ہیں۔"

"اس وقت ہمارے کھیل میں اسکول کے لڑکوں کی باقی تعداد صرف تماشائی ہوتی تھی ابراہیم۔ اگر وہ سب مل کر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرتے تو تم اس وقت بھی کامیاب ہوسکتے تھے۔"

"بچپن اور جوانی کے کھیلوں میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے دلاور۔ اس وقت تم نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ وہ صرف کھیل ہوتا تھا اور یہ حقیقت ہے۔"

"بدعہدی کے لئے تم سینکڑوں بہانے تراش سکتے ہو ابراہیم لیکن میں نے عہد شکنی

نہیں کی ہے۔ آج بھی میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ تم تنہا مجھے گرفتار نہیں کرسکتے۔ سنو میں تمہاری قید سے نکل جانے کی کوشش کروں گا اور پھر تمہیں دعوت دوں گا کہ تم مجھے گرفتار کرلو۔"

"تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی میرے دوست۔" ابراہیم نے کہا اور دوسرے لمحے اس نے دلاور کے پاؤں پر پستول کا فائر کردیا۔ گولی نے پنڈلی کی ہڈی توڑ دی تھی لیکن دلاور کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی وہ زمین پر گرپڑا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اٹھا کر ایک گھوڑے پر ڈال دیا۔ دوسرے گھوڑے بھی پہاڑ کی آڑ سے لے آئے گئے اور کامیاب وکامران ابراہیم خطرناک ڈاکو کو گرفتار کرکے لے چلا۔ دلاور کی پنڈلی سے خون چل رہا تھا۔ تاہم وہ ہوش میں ہی تھا۔ ابراہیم کو پکارا اور ابراہیم اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اگر میں مر نہ گیا تو تمہیں اس بدعہدی کی سزا دوں گا ابراہیم۔" اس نے کہا اور پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔ ابراہیم نے گھوڑا روک کر اسے دیکھا اور پھر اس نے ایک پٹی دلاور کے پاؤں پر کس دی اور پھر گھوڑوں کی رفتار تیز ہوگئی۔

ابراہیم کو احساس تھا کہ دلاور کی پنڈلی کی ہڈی چُور چُور ہوگئی ہے لیکن اس نے جان بُوجھ کر ایسا کیا تھا اور اب بھی اسے دلاور سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ دوستی وغیرہ بچپن کی حماقت تھی اب دلاور ایک خطرناک ڈاکو تھا اور وہ ایک سفاک قاتل بھی تھا۔ اپنے کام کے سلسلے میں اگر کوئی دلاور کے آڑے آجاتا تو وہ بے دریغ اسے گولی سے اڑا دیتا تھا۔ چنانچہ اب تک انتالیس بدنصیب بے گناہ دلاور کے ہاتھوں ہلاک ہوچکے تھے۔ اس نے لاکھوں روپے لوٹے تھے اور بہت سے لوگوں کو کنگال کردیا تھا۔ اب اس کے ساتھ رحم کرنے والے پر بھی رحم نہیں کیاجاسکتا تھا۔ جمال پور کے خان کا یہی حکم تھا۔ ابراہیم یہ بھی جانتا تھا کہ دلاور بے حد چالاک ہے۔ بچپن سے وہ اس کے بارے میں بخوبی جانتا تھا۔ چنانچہ جب دلاور نے فرار ہونے کی بات کی تو ابراہیم نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اس کی ایک ٹانگ توڑ دی تاکہ وہ اس وقت تک فرار کے قابل نہ ہوسکے جب تک خان اسے موت کی سزا نہ دیدے اور اپنے اس اقدام پر اسے ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ دلاور کی پنڈلی سے کافی خون بہتا آیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اس خون کو روکنے کے لئے پہلے بھی بندوبست کرسکتا تھا لیکن اس بارے میں بھی اس نے کچھ

سوچا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دلاور جسمانی طور پر بھی اتنا کمزور ہوجائے کہ فرار کے بارے میں نہ سوچ سکے۔ اگر اس دوران وہ مر بھی جاتا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جمال پور کے خان کو دلاور کی لاش اتنی ہی پسند آئے گی جتنا وہ اسے زندہ گرفتار کرے گا مقصد ایک برے آدمی سے معاشرے کو نجات دلانا تھا۔

طویل سفر طے کرکے وہ بستی شیرباز پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے تمام سپاہی تھکن سے چُور تھے۔ دلاور ابھی تک بے ہوش تھا۔ ابھی جمال پور کا سفر طویل تھا گھوڑے بھی تھکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ چنانچہ ابراہیم نے کچھ وقت بستی شیرباز میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے گھوڑوں کے رخ شیرباز کی سرکاری سرائے کی طرف کردیئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پیازی پتھروں سے بنی ہوئی مضبوط عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔

سرائے کا ملازم سو رہا تھا۔ ابراہیم کی پولیس کی وردی دیکھ کر حواس کھو بیٹھا۔ اور جب اس نے نرمی کا سلوک پایا تو دیدہ و دل فرشِ راہ کردیئے۔ مستعدی سے ان کے آرام کا بندوبست کیا اور سپاہیوں نے گرم قہوہ پیا تو ان کی جان میں جان آئی اور پھر ابراہیم نے انہیں چار گھنٹے آرام کے لئے دیئے لیکن خود اس نے پیٹی نہیں اتاری تھی۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور اس کی نگاہیں ایک مسہری پر پڑے دلاور پر تھیں۔

دلاور جس کا چہرہ سفید پڑگیا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور نہ جانے کیوں اس وقت ابراہیم کو اس کے چہرے پر معصومیت بھی محسوس ہوئی۔

"ہونہہ۔" اس نے اپنے اس خیال پر لعنت بھیجی۔ "ایک خونخوار قاتل معصوم نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک سفاک بھیڑیا ہے ایک وحشی درندہ ہے۔ اس کا حشر بدترین ہونا چاہئے۔ ابراہیم کو اپنے ذہن میں آنے والے خیالات گندے معلوم ہوئے۔ ایسے انسان کے بارے میں رحمدلی سے سوچنا بھی گناہ ہے۔ اس نے دلاور کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں لیکن بند آنکھوں نے کچھ اور تصاویر پیش کردیں۔ سونی جھیل کے کنارے ایک دوسرے سے نبرد آزمائی' سب بچے بھاگ گئے اور پھر استاد خان سے دونوں نے ایک دوسرے کی جان بچائی اور کچھ دوسرے مناظر۔

یہ بھی فاسد خیالات تھے۔ ابراہیم نے گردن جھٹک دی۔ تب اس کی نگاہ دلاور پر

پڑی وہ گردن پٹخ رہا تھا اور پھر اس کی گردن ابراہیم کی طرف مڑ گئی۔

"ابراہیم۔" اس نے آواز دی۔

"ہوش آگیا تمہیں۔" ابراہیم نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کیا تمہارا خیال تھا کہ ایک بار آنکھیں بند کرنے کے بعد میں کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔" دلاور کے ہونٹوں پر پھر غصہ دلانے والی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ابھی نہیں لیکن بہت جلد ایسا ہی ہوگا فکر مت کرو۔" ابراہیم نے غصہ سے بل کھاتے ہوئے کہا۔

"وہ سب بعد کی باتیں ہیں اس وقت جو ہوگا دیکھا جائے گا آؤ بچپن کی کچھ باتیں ہو جائیں۔" دلاور نے کہا۔

"اوہ بچپن یاد دلا کر شاید تم میری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن تم اس میں ناکام رہو گے۔" ابراہیم نے کہا۔

"تم اتنے ذلیل ہوگئے ہو ابراہیم مجھے یہ احساس نہ تھا کیا بچپن میں بھی میں نے تمہاری ہمدردیاں تلاش کی تھیں۔ کیا میں نے کبھی تم سے مدد مانگی تھی۔ میں شیر ہوں۔ تمہیں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن افسوس' ایک گیدڑ سے میں نے دوستی کی تھی۔"

"مجھے اور غصہ دلاؤ دلاور لیکن اس کے باوجود میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ تمہارا فیصلہ خان ہی کرے گا۔" ابراہیم نے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے کہا۔ دلاور کی باتوں نے اس کے جسم میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔

"ابراہیم' پولیس افسر ہو کر تمہاری دلیری کہاں سو گئی بہت گھٹیا گفتگو کرنے لگے ہو' سنو میرے دوست! دلاور تو صرف تمہارے لئے ڈاکو بنا تھا۔ ہم نے عہد کیا تھا میں بھی اپنے عہد پر قائم رہا اور شاید تم بھی۔ یا پھر ممکن ہے تمہاری نگاہ میں عہد کچھ نہ ہو۔ حالات نے تمہیں پولیس افسر بنا دیا ہو۔ بہرحال حسبِ معمول تم پولیس افسر بن گئے لیکن میرے دوست معاف کرنا۔ بڑے ہو کر تیرا دل چھوٹا ہوگیا اگر تم بھی نر تھے تو مجھے تنہا گرفتار کرتے۔ دیکھو لو' میں نے کوئی گروہ نہیں بنایا۔ اگر میں بھی تمہاری طرح گیدڑ بن گیا ہوتا تو آج میرا بھی گروہ ہوتا اور پھر تمہارے ان بیس ساتھیوں کی لاشیں گھوڑوں پر پڑی ہوتیں اور جمال پور واپس جاتیں لیکن میں تمہیں قتل نہ کرتا اور تم سے آہستہ سے

کہتا۔ "ڈاکو آج بھی نہیں پکڑا گیا ابراہیم اور کبھی نہیں پکڑا جائے گا خواہ تم کچھ بن کر آجاؤ لیکن تم نے پورے گروہ کے ساتھ مجھے گرفتار کیا ہے۔ اگر تم اسے گرفتاری سمجھتے ہو تو سمجھ لو میں اسے اپنی شکست نہیں سمجھتا۔"

"نہ سمجھو' موت کے بعد بھی نہ سمجھنا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"موت کے بعد۔" دلاور نے آہستہ سے کہا اور پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کئی منٹ تک وہ خاموش رہا اس دوران ابراہیم اس کی شکل دیکھتا رہا تھا جب کئی منٹ تک دلاور نے کچھ نہ کہا تو وہ بولا۔

"کیا سو گئے دلاور؟"

"نہیں' لیکن کیا تم نے درخت پر چڑھنا سیکھ لیا ہے؟"

"کیا مطلب ہے؟" ابراہیم نے اس بے تکے سوال پر چونک کر پوچھا۔

"بچپن میں تم درخت پر نہیں چڑھ سکتے تھے یاد ہے میں جھیل سے نکل کر درخت پر چڑھ جاتا تھا اور تم بے بسی سے نیچے کھڑے رہتے تھے۔"

"اب میں نے درخت پر چڑھنا سیکھ لیا ہے۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"اوہ لیکن میں نے ایسے کچھ اور گُر سیکھ لئے ہیں جو تمہیں نہ آتے ہوں گے۔ تم اب بھی میرے سامنے اتنے ہی بے بس.......... بے بس.........."

اچانک دلاور کی آواز ڈوبنے لگی۔ اس نے اندھوں کی طرح فضا میں ہاتھ ہلائے اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابراہیم.......... اب.......... را.......... ہیم.......... میری آنکھیں تاریک ہوگئیں.......... مجھے کچھ نظر.......... آہ.......... آہ.........." وہ گردن پٹخنے لگا اور ابراہیم چونک کر کھڑا ہوگیا۔ بالآخر دلاور کی بینائی چلی گئی۔ زیادہ خون نکل جانے کا نتیجہ ظاہر ہو رہا تھا۔

"پا.......... پا.......... نی.........." دلاور کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔ ابراہیم تیز قدموں سے دلاور کے نزدیک پہنچ گیا۔ دلاور کے پورے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔ وہ بمشکل بول رہا تھا شاید وہ

دم توڑ رہا تھا۔ دوسرے لمحے ابراہیم باہر کی طرف بھاگا وہ اس کے لئے پانی لانا چاہتا تھا۔ سرائے کا بوڑھا خادم بھی آرام کرنے چلا گیا تھا۔ اس نے خود ہی پانی تلاش کیا۔ اس کے دل کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اس احساس کو جھٹک دیا۔ بہرحال وہ ایک خطرناک قاتل تھا لیکن مرتے ہوئے اس نے پانی مانگا تھا۔ بہرحال پانی پلانا تو گناہ نہ تھا۔ وہ دروازے میں داخل ہوا اور دوسرے لمحے جیسے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ دلاور کی چارپائی خالی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھے اچانک اس کی پشت کی طرف سے ایک زوردار ضرب اس کے سر پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی' ہاں بے ہوش ہوتے ہوئے ایک آواز اس کے کانوں میں ضرور آئی تھی۔

"میں نے ایسے کچھ اور گُر سیکھ لئے ہیں جو تمہیں نہ آتے ہوں گے۔"

اور اس آخری آواز کے ساتھ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ تکلیف کی شدت حواس اڑائے دے رہی تھی۔ آنکھوں سے روشنی چلی گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ جسم بے جان ہوا جا رہا تھا اور وہ شرابیوں کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ انتہائی کوشش کر کے حواس برقرار رکھ رہا تھا اور اس طرح نہ جانے کتنی دیر گذر گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کی تاریکی چھٹ گئی۔ سر کی چوٹ کی شدت میں کمی آ گئی۔ اس نے اپنی گردن بھیگی بھیگی محسوس کی اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا۔ گردن پر خون کی لکیر صاف محسوس ہوئی اور پھر اس کے ذہن میں دلاور کا خیال آیا۔

دوسرے لمحے اس کے جسم میں چنگاریاں بھر گئیں۔ بدمعاش دلاور زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ اس نے اپنی بے بسی کے وقت کا تعین کیا اور پھر تیزی سے اس طرف بڑھ گیا جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

اپنے گھوڑے کی رسی کھولتے ہوئے اس نے گھوڑوں کا شمار کیا اور اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ ایک گھوڑا غائب تھا دوسرے لمحے ہی اس نے گھوڑے کی زین کسی اور پھر اس پر سوار ہو کر چل پڑا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس کا دماغ غصے کی شدت سے دھواں ہو رہا تھا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ دلاور زخمی ہے اسے سب سے پہلے زخم کی فکر ہو گی۔ اس شکل میں وہ جمال پور کی طرف نہیں جا سکتا۔ بلکہ کوئی ایسی

جگہ تلاش کرے گا جہاں رک کر وہ اپنے زخم کی دیکھ بھال کر سکے۔ چنانچہ اس نے گھوڑا اسی رخ پر ڈال دیا جدھر سے وہ وہاں تک آئے تھے۔ گھوڑا دوڑتا رہا۔ ابراہیم نے اب خود پر قابو پا لیا تھا۔ اب اس کا ذہن پوری طرح بیدار تھا وہ پہاڑوں میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوا سفر کر رہا تھا۔ ایسی جگہوں کو وہ نظرانداز نہیں کر رہا تھا جہاں دلاور کے رکنے کے امکانات ہوں۔ روشنی کی کرنیں آسانی سے نیچے اترنے لگیں ماحول منور ہو گیا۔ ابراہیم کی نگاہیں چاروں طرف ایسے نشانات تلاش کر رہی تھیں جن سے اندازہ ہو جائے کہ وہ صحیح سمت سفر کر رہا ہے لیکن ابھی تک ایسے نقوش نہیں ملے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور سر کے زخم میں تکلیف ہو رہی تھی۔

ابراہیم نے پانی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ بائیں سمت پانی کی سفید چادر نظر آ رہی تھی۔ اس کے نزدیک جنگلی پھل کے درخت موجود تھے جسے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ابراہیم نے گھوڑے کا رخ اس سمت کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ جھیل کے نزدیک پہنچ گیا۔ ٹھنڈے اور شیریں پانی کی ایسی جھیلیں اس علاقے میں دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا۔ گھوڑے کو جھیل کے کنارے اُگی ہوئی گھاس پر چھوڑ کر اس نے چلوؤں سے پانی پیا اور پھر لباس اتار کر گردن سے خون اور سر کا زخم صاف کرنے لگا۔ زخم صاف کرنے کے بعد اس نے رومال نکال کر پانی میں بھگویا اور زخم پر باندھ لیا۔ اس سے اسے بہت سکون ملا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ تھوڑے فاصلے پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی طرف اٹھ گئی اور وہ چونک پڑا۔ پتھر پر سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ بھورے پتھر پر یہ سرخ نشان یقیناً خون کے تھے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑا اور پھر نشانات پر جھک گیا۔ کوئی شبہ ہی نہ رہا۔ پتھر کی دوسری طرف وہ پٹی پڑی ہوئی تھی جو ابراہیم نے دلاور کے پیر پر باندھی تھی یقیناً دلاور نے بھی یہاں بیٹھ کر اپنا زخم دھویا تھا اور پھر شاید دوسری پٹی باندھی ہو ممکن ہے اس نے یہ پٹی اپنے لباس سے حاصل کی ہو۔

دل ہی دل میں وہ دلاور کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے سر کا معمولی زخم اس کے حواس درست کئے دے رہا تھا جبکہ دلاور کی پنڈلی کی ہڈی چُور چُور تھی۔ بڑے دل گُردے کا کام تھا ایسے زخم کے بعد حواس قائم رکھنا۔ بہرحال دلاور کی دلیری کا وہ

ہمیشہ سے قائل تھا۔

اس نے جھیل کے کنارے کنارے دوسرے نشانات تلاش کئے اور کافی تگ و دو کے بعد اسے گھوڑے کے سُموں کے نشانات سے سمت کا اندازہ ہوگیا۔ اسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ اب تک وہ صحیح راستے پر ہے۔ بہرحال اس کے بعد اس نے کھانے کے لئے درختوں سے پھل توڑے اور ان کی کافی مقدار کپڑے میں باندھ لی۔ یہ پھل بہت کارآمد تھے ان میں پانی کی مقدار کافی تھی اس طرح وہ غذا اور پانی دونوں کا کام دے سکتے تھے۔

تمام کاموں سے فارغ ہوکر ابراہیم گھوڑے پر سوار ہوکر پھر چل پڑا۔ ایک بات کا اسے یقین تھا وہ یہ کہ دلاور چونکہ سخت زخمی ہے اس لئے تھوڑے وقت میں وہ زیادہ سفر نہیں کرسکتا تھا اس کا سفر یقیناً سُست رفتاری سے ہوگا اس لئے تھوڑی سی تگ ودو کے بعد اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ دلاور کی چالاکی پر وہ دانت پیسنے لگتا تھا اور کبھی اسے اس کی چالاکی پر ہنسی آجاتی تھی۔ ہمیشہ کا بدمعاش ہے۔ وہ سوچتا اور اس سوچ میں محبت کا ہلکا سا عنصر شامل ہوتا۔ جس پر وہ خود کو نفرین کرتا ایک بار تو اس نے منہ پر تھپڑ بھی لگائے تھے کیونکہ اسے دلاور کے زخم کی تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ اتنی جلدبازی سے کام نہ لیتا۔

لیکن ان لاشوں کی تصویریں اس کی نگاہوں میں دوڑ جاتیں جو دلاور کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ بے گناہوں کے اس قاتل کو جس قدر اذیت ہو مناسب ہے۔ اس طرح وہ اپنے اس جذبے کو ذہن سے نکال دیتا اور گھوڑے کی رفتار تیز ہوجاتی۔ آبادی والے علاقے بہت پیچھے رہ گئے تھے اب انتہائی دشوار گذار علاقے شروع ہوگئے تھے اس طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ راستے ناقابل استعمال تھے ہاں کبھی کبھی پولیس پارٹی کسی مفرور کو تلاش کرنے اس طرف نکلتی تھی لیکن ان پہاڑوں میں کسی ایک انسان کا تلاش کرلینا ناممکنات میں سے ہی تھا لیکن سرپھرے ابراہیم کو یقین تھا کہ وہ دلاور کو ڈھونڈ نکالے گا حالانکہ جھیل کے بعد سے اب تک ایسا کوئی نشان نہیں ملا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ دلاور اسی طرف گیا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ دلاور یقیناً کسی ایسے علاقے میں نکل جانے کی فکر میں ہوگا جہاں پوشیدہ ہوکر وہ اپنے زخم کی دیکھ بھال کرسکے۔

دوپہر گزری اور پھر شام ہوگئی اور سیاہ پہاڑوں کے درمیان کی شام' خدا کی پناہ

تاریکی تھی کہ زمین سے پھوٹ رہی تھی۔ عجیب بھیانک علاقہ تھا۔ چاروں طرف سیاہ پتھروں کے پہاڑ منہ اٹھائے کھڑے تھے ان کے درمیان حشرات الارض کی سرسراہٹ صاف سنی جاسکتی تھی۔

ابراہیم نے آگے کا سفر ملتوی کردیا۔ آئندہ سفر کے لئے دن کی روشنی مناسب تھی۔ رات کی تاریکی میں اسے خودکشی کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں بھی قیام کرنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی لیکن بہرحال آگے بڑھنے کی بجائے یہیں کسی مناسب جگہ قیام کرنا زیادہ سود مند تھا۔

اب یہ مسئلہ تھا کہ قیام کس جگہ کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ایک اونچی اور صاف ستھری چٹان منتخب کی۔ اس چٹان میں کوئی رخنہ نہیں تھا جس سے کسی سانپ کے نکل آنے کا اندیشہ ہو' لیکن اس کے باوجود کوئی سانپ چٹان پر چڑھ سکتا تھا اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ خاردار جھاڑیوں کو قرب وجوار سے جمع کرکے چٹان کے گرد ڈال کر آگ لگادے۔ یہ خشک جھاڑیاں آگ فوراً پکڑ سکتی تھیں۔ گو آگ جلانے کا سامان نہیں تھا لیکن سامان تو اس وقت بھی انسان کے پاس نہیں تھا جب اس نے آگ دریافت کی تھی۔ پتھروں کی رگڑ سے آگ جلانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

ابراہیم نے جلدی جلدی ٹوٹی ہوئی جھاڑیاں جمع کیں اور انہیں چٹان کے چاروں طرف ڈال دیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آگ اس وقت جلائے گا جب چاند نکل آئے گا۔ وہ جانتا تھا کہ حشرات الارض چاندنی میں ہی خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہ پھر چٹان پر چڑھ آیا۔ گھوڑے کو بھی اس نے چٹان پر چڑھا لیا تھا۔ ظاہر ہے اس بے زبان کی زندگی کی حفاظت بھی ضروری تھی۔ گھوڑا بھی ماحول سے متاثر تھا اور خوفزدہ سا خاموش کھڑا تھا۔

ابراہیم نے زین سرہانے رکھی اور لیٹ گیا لیٹتے ہی اس کی آنکھوں میں دلاور ابھر آیا۔ قوی ہیکل' تندرست وتوانا دلاور نہ جانے کمبخت کہاں مرگیا۔ حالات تو یہی بتاتے ہیں کہ انہی علاقوں میں آیا ہوگا لیکن اگر وہ چالاکی سے کام لے کر وہیں کہیں غار میں چھپ گیا ہے تو........ بڑی شرمندگی کی بات تھی گویا وہ ابراہیم کو احمق بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ ابراہیم جانتا تھا کہ وہ بے حد چالاک انسان ہے اگر اس نے یہ چالاکی کرہی ڈالی ہے تو خود ابراہیم موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ظاہر ہے ان بے آب وگیاہ پہاڑوں میں زندگی

نہیں ملتی۔ ہاں موت قدم قدم پر مل جاتی ہے۔ سانپوں کے جسموں کی سرسراہٹ ان کی خوفناک آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں کبھی کبھی اژدھے کی پھپکار بھی ان میں شامل ہو جاتی۔ بالکل اس طرح جیسے کسی مشین کی گراری چل رہی ہو۔

وہ ان خوفناک آوازوں کو سنتا رہا جو کئی بار چٹان کے نزدیک سے گذری تھیں۔ پھر اس نے سوچا کہ آگ جلا ہی دینی چاہئے۔ کہیں کوئی سانپ انسانی جسم کی بو سونگھ کر چٹان پر چڑھ ہی نہ آئے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک وہ اچھل پڑا۔ دور.......... کافی دور اس نے آگ کی روشنی دیکھی تھی۔ آگ ابھی ابھی بھڑکی تھی وہ ساکت رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی نام گونجا.......... دلاور.......... اور اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ یقیناً وہ دلاور ہے۔ تو اس کی اب تک کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ وہ صحیح راستے پر ہے۔ وہ مناسب طور پر دلاور کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے فوری طور پر آگ جلانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب جب کہ دلاور نظر آ گیا ہے' کیا کیا جائے۔ کیا اسی وقت دلاور کو جالیا جائے یا صبح ہونے کا انتظار کیا جائے لیکن یہ انتظار ابراہیم کے بس کی بات نہیں تھی۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر وہ روشنی نکلنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ دشمن بھی وہ جو اب اس کا وقار بن گیا تھا۔

کچھ بھی ہو' خودکشی ہی سہی۔ چاند نکلنے کا انتظار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ روشنی نکل آئی تو دلاور بھی ہوشیار ہو جائے گا اور دشمن کو ہوشیار ہونے کا موقع دینا حماقت ہے۔ اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر اس سمت کا تعین کیا۔ ان راستوں کا انتخاب کیا جن سے گذر کر دلاور تک پہنچا جاسکتا تھا اور پھر اس نے گھوڑے پر زین کس لی اور نیچے کود پڑا۔ گھوڑا بھی سہمے سہمے قدموں سے نیچے اتر آیا تھا بہرحال مالک کی مرضی کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ابراہیم گھوڑے پر سوار ہو گیا زمین کے ہر خطرے کو نظرانداز کر کے وہ چل پڑا۔ تاریکی میں وہ سیاہ لکیریں رینگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کہیں کہیں اسے ننھے قمقمے نظر آتے۔ یہ سانپوں کی پُراسرار آنکھیں تھیں جن سے روشنی خارج ہو رہی تھی۔

بڑا وحشت ناک ماحول تھا۔ یہاں سانپوں کا راج تھا۔ اس لئے دوسرے جانوروں کا گذر نہیں تھا۔ بس رینگتے ہوئے موت کے ہرکاروں سے بچنا تھا۔ گھوڑا بھی پوری طرح ہوشیار تھا کئی بار اس کے سم تیزی سے دوڑتے ہوئے سانپوں کی پشت پر پڑتے پڑتے بچ

جاتے۔ وہ اچھل اچھل جاتا۔ الف ہو جاتا لیکن اس کا سوار بھی پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ وہ نہایت پھرتی اور مستعدی سے یہ بھیانک سفر طے کر رہا تھا۔

لیکن طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد ابراہیم کی پریشانی کا ایک اور دور شروع ہوا۔ یہ ایک بلند جگہ تھی۔ یہاں سے وہ تھوڑے فاصلے پر روشن آگ بخوبی دیکھ سکتا تھا اس آگ کی چھاؤں میں اسے گھوڑا بھی نظر آ رہا تھا لیکن اس آگ تک پہنچنے کے لئے اسے ایک ڈھلان طے کرنا تھا' ایک خوفناک ڈھلان جس میں نہ جانے کیا کیا تھا۔ ابراہیم جانتا تھا کہ اوپر کی بہ نسبت ڈھلان کی تہہ زیادہ خوفناک ہے۔

ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ اس کام کو صبح پر چھوڑ دے۔ آگ روشن تھی۔ یقیناً دلاور بھی صبح سے پہلے یہاں سے روانہ ہونے کی کوشش نہیں کرے گا اور چاند کے ڈھلتے ہی اس ڈھلان کو پار کر لیا جائے تو دلاور پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے لیکن پھر اس خیال کو اس نے اپنی بزدلی سے تعبیر کیا اور اسے جھرجھری سی آ گئی۔ آخر دلاور نے بھی تو یہ ڈھلان طے کیا ہے اور دوسرے لمحے اس نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ مارا اور وفادار جانور نے مالک کے اشارے پر جان کی بازی لگادی۔ گھوڑا خوفناک ڈھلان میں اترنے لگا۔ اژدھوں کی گراریاں چلنے کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ گھوڑا قدم قدم پر اچھل رہا تھا اور ابراہیم کسی بھی لمحے اس پر سے گرنے کے لئے تیار تھا۔

تھوڑی دیر کی سخت جدوجہد کے بعد وہ ڈھلان میں پہنچ گیا۔ دفعتاً گھوڑا زور سے ہنہنایا اور اس نے اتنی لمبی چھلانگ لگائی کہ ابراہیم اس پر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ وہ گھوڑے سے گرا لیکن قسمت یاور تھی کہ وہ اس سیاہ ناگ پر نہ گرا جو اس وقت اس کے جسم کی زد میں تھا جب وہ گرا تو.......... سانپ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چوڑا پھن لہرا رہا تھا۔ موت ابراہیم کی آنکھوں میں ناچ گئی۔ اس نے ہولسٹر میں پستول تلاش کیا اور اس کے خشک ہونٹ اور خشک ہو گئے۔ پستول اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے چلتے وقت پستول ساتھ ہی نہیں لیا تھا۔

لیکن اس نازک موقع پر سمجھدار گھوڑے نے اس کی بھرپور مدد کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مالک سخت مشکل میں ہے چنانچہ اس نے تیزی سے دوڑتے ہوئے سانپ کی دُم پر سُم

مارا اور زخمی سانپ چوٹ کھا کر پلٹا لیکن گھوڑا چھلانگ مار کر دور نکل گیا تھا۔ ابراہیم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے پلٹ کر بھاگا۔ گھوڑا سانپ کو چکر دے کر اسی کی طرف آرہا تھا۔ ابراہیم نے جسم کو تولا اور دوسرے لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر تھا چنانچہ وہ سیدھا دوڑتا رہا اور پھر مناسب جگہ دیکھ کر اس نے رفتار سست کردی۔

"میں تمہاری اس وفاداری کو کبھی نہیں بھولوں گا میرے دوست۔" ابراہیم نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر اس نے گھوڑے کو چڑھائی پر ڈال دیا۔

خوفناک ڈھلان سانپوں سے پُر تھا۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور ان میں لہراتے ہوئے سانپ۔ ابراہیم کی پوری زندگی میں ایسے خوفناک مناظر نہیں آئے تھے لیکن اس کا دماغ گرم تھا اور اس میں ایک ہی لگن تھی، کسی طرح دلاور تک پہنچ جائے اور اسے گرفتار کرے۔ نہ جانے کس طرح اور کتنی دیر میں ڈھلان طے ہوسکا اور پھر وہ اس کے کنارے پہنچ گیا۔ گھوڑے نے چونکہ وہ راستہ چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے آگ اب بھی کافی دور تھی۔

لیکن ابراہم نے اپنی زندگی کا سب سے خوفناک سفر طے کرلیا تھا اس فاصلے کو وہ کب خاطر میں لاتا۔ گھوڑا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ اس دوران ابراہیم نے اس جگہ کا بخوبی اندازہ لگالیا تھا جہاں آگ جل رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ گھوڑے کی پشت سے آگ کے دائرے میں چھلانگ لگائے گا۔ یقیناً دلاور اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ اس سے مقابلہ کرسکے چنانچہ وہ گھوڑے کی رکابوں پر پاؤں رکھ کر تیار ہوگیا۔

آگ قریب آتی جارہی تھی اسے یقین تھا کہ اب دلاور نے اسے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔ گھوڑے کی ٹاپوں نے اسے ہوشیار کردیا ہوگا اور وہ نکل جانے کی فکر میں ہوگا لیکن اس سے قبل ہی ابراہیم اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

بلاشبہ اس نے آگ کے دائرے میں داخل ہونے کے لئے لمبی چھلانگ لگائی تھی اس کے قدم زمین سے ٹکرائے لیکن دائرہ خالی تھا۔ دلاور وہاں موجود نہیں تھا۔

"دلاور.......... دلاور.........." ابراہیم پاگلوں کے سے انداز میں چیخا۔ اس نے خونی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا گھوڑا بھی موجود نہیں تھا حالانکہ اس نے پہلے اس کی پرچھائیں دیکھی تھی۔ دلاور نکل گیا تھا۔ ہاں دلاور پھر نکل گیا تھا۔ ابراہیم جنونی انداز میں آگ کے دائرے سے باہر نکل آیا۔

اور اسی وقت چاند نے بڑی نزاکت سے اپنے چہرے کی اوڑھنی اٹھادی۔ اس کی شرمائی ہوئی کرنیں زمین پر اتر آئیں اور ماحول منور ہوگیا۔ ابراہیم کی جلتی ہوئی نگاہیں چاروں طرف دلاور کو تلاش کررہی تھیں پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس نے ایک اونچی چٹان کا رخ کیا تھا اور پھر گھوڑے کی ایک چھلانگ اسے چٹان پر لے گئی۔ بلند چٹان پر کھڑے ہوکر اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور اگر روشنی نہ ہوتی تو وہ اس ہیولے کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو گھوڑے کے علاوہ کسی اور کا نہیں تھا۔ وہ ایک بلند پہاڑی کا سفر طے کررہا تھا اور دلاور اس کی پشت پر سوار تھا۔

لیکن دلاور گھوڑے کی پشت پر سیدھا بیٹھا ہوا تھا اتنا زخمی ہونے کے باوجود وہ ہوش وحواس میں تھا ورنہ اسے گھوڑے کی پشت سے چپکا ہونا چاہئے تھا۔

"میرے دوست۔" ابراہیم نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں تجھے سخت مشقت اٹھانی پڑ رہی ہے لیکن اگر وہ نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آسکے گا۔ اس کے گھوڑے کا جذبہ تجھ سے زیادہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اس کے لئے اجنبی ہے۔ تُو بھی میرے لئے محنت کر۔" اس نے دونوں ٹانگیں مار کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑے نے جیسے اس کے جذبات پہچان لئے۔ اس کی باتوں کا مفہوم سمجھ لیا۔ وہ پہاڑوں پتھروں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس کی رفتار کافی تیز تھی اور ابراہیم کافی مضبوطی سے اس پر جما ہوا تھا۔

پہاڑی کی چڑھائی خوفناک تھی۔ دلاور نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکا تھا کیونکہ اس کا گھوڑا بھی اسی سست رفتاری سے چڑھائی چڑھ رہا تھا جس سست رفتاری سے ابراہیم کا گھوڑا۔

"کاش.......... کاش میرے پاس پستول ہوتا۔ تمام مشکل آسان ہوجاتی۔ دلاور۔ دلاور تُو قسمت کا بھی دھنی ہے ورنہ تُو اس آسانی سے یہ سفر نہ کرتا۔" وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔

دفعتاً اس نے دلاور کو رکتے دیکھا۔ وہ ایک چٹان کے نزدیک رک گیا تھا کیا وہ ہار تسلیم کررہا ہے۔ یا........ یا......... اور دوسرا خیال ابراہیم کے لئے سوہانِ روح تھا کیا دلاور مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا اس کے پاس پستول موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس ڈھلان پر

ابراہیم آسانی سے مارا جاسکتا ہے۔

ابراہیم نے بھی گھوڑے کی رفتار سست کرلی۔ وہ دلاور کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دلاور کو گھوڑے سے نیچے اترتے دیکھا۔ وہ چٹان کی آڑ میں اتر رہا تھا۔

"دلاور......... دلاور......... خود کو میرے حوالے کردو میں تمہیں تحت الثریٰ میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غضب ناک آواز سے چیخا اور اس کی آواز کی بازگشت پہاڑوں سے ٹکرائی۔

"ہم دونوں بچپن کا کھیل دہرا رہے ہیں ابراہیم۔ کوشش کیئے جاؤ لیکن ڈاکو پکڑا نہیں جائے گا۔ یہ پرانی روایت ہے۔"

"میں تمہارے جسم کے ٹکڑے کردوں گا۔" ابراہیم غرایا۔

"بشرطیکہ مجھ تک پہنچ سکو۔" دلاور نے قہقہہ لگایا اور ابراہیم کا منہ تعجب سے کھل گیا۔ اس قدر زخمی انسان بھی اتنے جاندار قہقہے لگا سکتا ہے۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا دلاور کے اقدام کا انتظار کرتا رہا۔ دلاور خاموش تھا وہ کیا سوچ رہا ہے ابراہیم غور کرنے لگا لیکن بظاہر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ابراہیم!" اچانک دلاور کی آواز ابھری۔ "کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے بدعہدی کی ہے۔ کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہیں اتنے سارے سپاہیوں کے ساتھ میرے اوپر حملہ آور نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تم اپنی غلطی تسلیم کرلو تو میں تمہیں معاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تم ایک سفاک قاتل ہو دلاور اور میں ایک پولیس آفیسر۔ میرا فرض ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے تمہیں گرفتار کرلوں۔" ابراہیم نے کہا۔

"کیا تمہیں بچپن کا عہد یاد نہیں ہے؟"

"یاد ہے لیکن انسانی زندگیوں کے خون کا بدلہ بھی ضروری ہے۔"

"میں صرف تمہاری خواہش پر ڈاکو بنا ہوں ابراہیم۔ اور ڈاکو بننے کے بعد انسانوں سے مذاق نہیں کیا جاتا۔"

"اور میں تمہاری سرکوبی کے لئے پولیس افسر بنا ہوں۔ انسانیت کے دشمن ان سانپوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جو ان پہاڑیوں میں رینگ رہے ہیں۔" ابراہیم نے

جواب دیا۔

"تمہاری دلیل معقول ہے۔" دلاور نے جواب دیا۔ "لیکن ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے؟"

"تم خود کو میرے حوالے کردو۔ میں تمہیں پھانسی پر چڑھا دوں گا۔"

"کیا یہ ایک دوست کی التجا ہے؟" دلاور نے پوچھا۔

"نہیں......... ایک پولیس افسر کا حکم۔"

"نہیں مانا جاسکتا۔" دلاور نے غراتے ہوئے کہا اور خاموشی پھیل گئی لیکن صرف چند ساعت کے لئے۔ دوسرے لمحے ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ایک بڑا پتھر لڑھکنے لگا۔ ابراہیم کو اب اس خوفناک صورتِ حال کا احساس ہوا جس کے لئے دلاور رکا تھا۔ بلاشبہ ابراہیم اس وقت سخت خطرناک پوزیشن میں تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پتھر کی لپیٹ میں آنے سے بچ گیا لیکن دلاور بلندی پر تھا۔ پتھر اس کے پاس بہترین ہتھیار تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر اچھال رہا تھا کئی پتھر گھوڑے کو لگ چکے تھے ابراہیم اتفاق سے ہی محفوظ رہا لیکن پتھروں نے اسے کافی پریشان کردیا تھا۔

وہ گھوڑے کو اتنی دور لے جانا چاہتا تھا کہ دلاور کے پھینکے ہوئے پتھروں کی پہنچ سے دور ہو جائے اور دلاور بھی شاید یہی چاہتا تھا۔ جب ابراہیم کافی دور نکل گیا تو دلاور نے پتھر بازی بند کردی اور پھر وہ اپنے گھوڑے پر آبیٹھا۔ گھوڑا پھر بلندیاں طے کرنے لگا تھا۔ ابراہیم کے ذہن میں شعلے اٹھ رہے تھے۔ دلاور کی چالاکی کا وہ بچپن سے قائل تھا۔ وہ مکمل طور سے دلاور کی چالاکی سمجھ گیا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ اس چالاکی کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بہرحال اسے اور مشقت کرنا پڑی اب وہ ایسے راستے سے بلندیاں طے کررہا تھا جہاں دلاور کے حملے کا خطرہ نہ ہو اور اس کے لئے اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پہاڑ کی بلندیاں قیامت کی تھیں۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ ابراہیم کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ وہ پلک جھپکنا بھول گیا تھا۔ سر کی چوٹ کا تو اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا اس کے ذہن پر صرف ایک دھن سوار تھی کسی طرح ایک بار وہ دلاور کے نزدیک پہنچ جائے اس کے بعد وہ جان کی بازی لگا دے گا۔

دلاور سے دوسری مڈبھیڑ نہ ہوئی اور جب وہ اوپر پہنچا تو صبح نمودار ہو چکی تھی۔ دن کی روشنی نے بلند پہاڑی کے مناظر پیش کر دیئے۔ چاروں طرف خوفناک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں بھی سانپ موجود تھے پیلے رنگ کے بھدے سانپ جو اونگھ رہے تھے۔ بائیں سمت یہ پہاڑی پھیلتی گئی تھی۔ دور ایک ڈھلان نے اسے دوسرے سرے سے ملادیا تھا لیکن دائیں سمت اس کا سرا تھوڑا دور ہی تھا۔

اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انسانی قدم ان دونوں سے پہلے بھی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ پہاڑی پر دو درختوں کے تنے موجود تھے اور ان کے تنے موٹی رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ رسیوں کا پُل پہاڑ کے دوسرے سرے پر ایسے ہی ستونوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس طرح پہاڑیوں کے درمیان خلا کا یہ راستہ مختصر کر دیا گیا تھا۔ موٹے رسّوں کی مضبوطی سے اندازہ ہوتا تھا کہ پُل کافی مضبوط ہے اور اس پر سے گھوڑے گزارنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس نے بائیں سمت ڈھلانوں پر نگاہ دوڑائی۔ دلاور کا یہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ بے وقوف نہیں تھا اس نے ڈھلانوں کا راستہ اختیار کرنے کی حماقت نہیں کی ہوگی اور اسی پُل سے یہ راستہ پار کیا ہوگا۔ چنانچہ ابراہیم نے بھی اپنا گھوڑا پُل کی طرف بڑھایا۔ اس نے پُل کے نیچے کی گہرائیوں کو دیکھا یہ گہرائیاں اتنی ہی تھیں جتنی طے کر کے وہ پہاڑ کی بلندی پر آیا تھا نیچے زمین نظر آرہی تھی۔

لیکن ابراہیم کسی بھی طور دلاور سے کمزور نہیں تھا وہ ان گہرائیوں سے خوفزدہ نہ ہوا۔ اس نے دور تک نگاہ دوڑائی اور پھر اس نے گھوڑے کو پُل کی طرف بڑھادیا۔ تھکن سے چُور گھوڑے نے گہرائیاں دیکھیں اور شاید اس کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ دو تین بار کے اشارے پر بھی وہ آگے نہ بڑھا تو ابراہیم نے جھلاہٹ میں اس کے دو تین ہاتھ مار دیئے۔ وفادار جانور نے مالک کا اصرار دیکھا تو قدم آگے بڑھا دیئے۔ موٹے رسّوں کو تختوں سے پاٹ کر تختے مضبوطی سے باندھ دیئے گئے تھے۔ گھوڑا فاصلہ طے کرنے لگا وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا اور اس کے انداز سے خوفزدگی کا اظہار ہو رہا تھا لیکن ابراہیم کا دل پتھر کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس پُل کو اسی طرح طے کرلے گا جس طرح دلاور نے کیا تھا۔

اس نے پُل کی لمبائی نظرانداز کر دی اور گھوڑے کے ایک ایک قدم کا جائزہ لینے

لگا۔ خدا خدا کر کے گھوڑا پُل کے درمیان پہنچ گیا لیکن اسی وقت پُل کی دوسری طرف سے ایک بھیانک آواز ابھری۔

”ابراہیم! اپنی شکست دیکھ لو۔ ڈاکو آج بھی نہیں پکڑا جائے گا ابراہیم! اپنی شکست کا منظر دیکھ لو اور اس کے بعد تم کچھ نہ دیکھ سکو گے۔“

اور ابراہیم کی نگاہیں پُل کے دوسری طرف اٹھ گئیں دلاور ایک تیز چھرے سے پل کے رسّے کاٹ رہا تھا۔

ابراہیم نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔

”بات بچپن کی نہیں رہ گئی ہے ابراہیم۔ اب ایک ڈاکو اور ایک پولیس افسر کا مقابلہ ہے۔ اگر تم اپنی شکست تسلیم کر کے واپس لوٹنا پسند کرو تو شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔“

”میں نے شکست بچپن میں بھی نہیں تسلیم کی تھی۔ آج بھی نہیں کروں گا دلاور۔“

ابراہیم نے جنونی انداز میں کہا اور پھر گھوڑے کو زور زور سے مارنے لگا۔ دوسری طرف دلاور بھی دانت بھینچے پُل کی رسّی کاٹ رہا تھا۔ اس سے قبل شاید وہ اس ستون کی آڑ میں چھپا ہوا تھا جس سے رسّے بندھے ہوئے تھے۔

دفعتاً ابراہیم کو ایک زور دار جھٹکا لگا اور گھوڑا الف ہو گیا۔ پُل ایک طرف لٹک گیا تھا۔ ایک رسّہ کٹ چکا تھا اور دوسرے لمحے ابراہیم گھوڑے سے کود گیا اور یہ بھی شاید تائید غیبی تھی کیونکہ گھوڑا اپنا وزن نہیں سنبھال سکا تھا۔ اس کے کئی کُھر ابراہیم کے جسم پر لگے اور اگر ابراہیم مضبوطی سے رسّہ نہ پکڑ لیتا تو گھوڑا اسے بھی ساتھ ہی نیچے لے گیا تھا۔

گھوڑا پہاڑ کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا اور دلاور کی آواز آئی۔

”کیا خیال ہے ابراہیم شکست مانتے ہو۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔“

لیکن ابراہیم پاگلوں کے سے انداز میں تختوں سے چمٹا ہوا آگے بڑھنے لگا اور دلاور تیز چھرے سے دوسرا رسّہ کاٹنے لگا۔

”اگر میں زخمی نہ ہوتا ابراہیم تو ابھی تمہیں موت کے گھاٹ نہ اتارتا اور تمہیں تمہاری کاوشوں کے لئے کچھ اور وقت دیتا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میری پنڈلی کی ہڈی چُور چُور ہے۔ میں زیادہ پھرتی سے کام نہیں کرسکتا۔ اس لئے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے میں تمہیں

خداحافظ نہیں کہہ سکتا۔" دلاور نے رسّی کا دوسرا سرا بھی کاٹ دیا اور پُل تختوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ نیچے گرنے لگا۔ ابراہیم نے پوری قوت سے رستہ پکڑا ہوا تھا اور وہ پہاڑوں کی اتھاہ گہرائیوں میں جارہا تھا۔ پھر اس نے انتہائی ہوشیاری سے خود کو پتھروں سے ٹکرانے سے بچایا تھا وہ بدستور رستے سے لٹکا ہوا تھا۔

ڈھیلے بندھے ہوئے تختے اوپر سے گر رہے تھے اور پُل ننگا ہوتا جارہا تھا۔ اگر ایک چٹان کی روک نہ ہوتی تو یہ تختے ہی ابراہیم کا کام تمام کردیتے لیکن چٹان سے ٹکرا کر تختے دور گر رہے تھے اور ان کے تہہ میں گرنے کی آوازیں بھی نہیں آرہی تھیں۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو ابراہیم نے بلندی کی طرف دیکھا۔ بے پناہ بلندی! رستے کے ذریعے اوپر چڑھنے کا تصور ہی حواس گم کئے دے رہا تھا لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا؟

ابراہیم نے اپنے حواس درست کئے اور آہستہ روی سے رستہ پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔

آخری لمحات میں اس کے ذہن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ بس مشینی انداز میں ہاتھ پاؤں کام کررہے تھے۔ اسے اس وقت ہوش آیا جب سر کنارے پر اُبھرا۔ اس نے پوری قوت صرف کرکے کنارے کا فاصلہ بھی طے کیا اور پھر وہ کنارے سے تھوڑی دور کھسک کر زمین پر لیٹ گیا۔

تھکن اور درد سے چُور چُور جسم دماغ اڑائے دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بے سُدھ ہوگیا۔ سورج کی تیز کرنوں نے اس کے جسم پر تپش زنی کرکے اسے جگا دیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ حواس بحال کرتا رہا جسم پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔ بالآخر وہ اٹھ گیا۔ وہ واپسی کے سفر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دلاور زندہ تھا اور اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بائیں سمت کے ڈھلان طے کرکے دوسری طرف جائے۔ وہ جانتا تھا کہ دلاور کے پاس گھوڑا موجود ہے اور اس دوران وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا ہوگا لیکن اب تو اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ دلاور کہیں بھی نکل جائے اسے تلاش کرکے قتل کرنا یا گرفتار کرنا بس یہی ایک کام تھا۔

چنانچہ وہ ڈھلانوں کی طرف چل پڑا جسمانی قوت ختم ہوچکی تھی اب صرف کچھ اندرونی جذبے تھے جن کے تحت اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ وہ ہوش وحواس سے عاری

تھا۔ بھوک پیاس تھکن تمام چیزیں فراموش ہوچکی تھیں۔ صرف جنون تھا جو اسے دھکیل رہا تھا اور جنون کا یہ سفر اس کا کافی معاون ثابت ہوا۔ اس کے جب حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ وہ ڈھلان طے کرکے دوسری طرف پہنچ چکا ہے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ دھوپ کی تیزی ختم ہوچکی تھی اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے پوری زندگی ہی سفر میں گزر گئی ہو لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو زندگی بھی باقی ہے اور سفر بھی۔ وہ پھر چل پڑا۔ دلاور یقیناً آگے بڑھ چکا ہوگا۔ اب اس کے قدموں کے نشان وہاں سے تلاش کرنے پڑیں گے جہاں پُل کے ستون بنے ہوئے ہیں۔

دور سے ستون صاف نظر آرہے تھے وہ ان ستونوں کی طرف چل پڑا۔ آہستہ آہستہ، تھکے ہوئے انداز میں لیکن اچانک اس کے جسم کی تمام قوتیں جاگ گئیں۔ اس نے دور سے ستون کی آڑ میں دلاور کا گھوڑا دیکھا، کیا وہ ابھی تک یہاں موجود ہے۔ یقیناً وہ موجود ہے، اسے اپنے زخم کی فکر صرف اس وقت تک نہیں تھی جب تک اسے احساس تھا کہ اس کا دشمن زندہ ہے اور اس کا تعاقب کر رہا ہے اور اب وہ مطمئن ہوگا کیوں نہ اسے دھوکے میں مار دیا جائے۔

اس نے رفتار سست کردی اور نہایت محتاط انداز میں ستون کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ غیر متوقع طور پر کامیابی نزدیک آگئی تھی۔ گھوڑا بھی موجود تھا اور دلاور بھی اس کے قریب ہی تھا۔ وہ دبے قدموں ستون کے پیچھے پہنچ گیا اور پھر اس نے دوسرے ستون کی طرف جھانکا۔ دلاور ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ زخمی ٹانگ خون آلود تھی۔ کیوں نہ اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دی جائے اس کے بعد وہ مکمل طور پر بیکار ہوجائے گا۔ ابراہیم نے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک بڑے پتھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے قوت صرف کرکے پتھر دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور دلاور کے سامنے پہنچ گیا۔ دلاور آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ابراہیم کے دانت بھنچ گئے اس نے پتھر دونوں ہاتھوں سے بلند کیا اور دلاور کے بالکل نزدیک پہنچ گیا لیکن اچانک اس کی داہنی پنڈلی میں ایک خوفناک ٹیس اٹھی اور وہ اچھل پڑا۔ پتھر کا وزن اس سے نہ سنبھل سکا اور پتھر گر گیا۔ تب اس نے دہشت ناک نگاہوں سے اس سانپ کو دیکھا جو پتھر کے نیچے دبا ہوا تڑپ

رہا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کی چیخ نہ رک سکی۔ پورے جسم پر انگارے دوڑ گئے تھے۔
اس کی چیخ نے دلاور کو جگا دیا۔ اس نے سرخ نگاہوں سے زمین پر بیٹھے ہوئے ابراہیم کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ڈاکو آج بھی نہیں پکڑا جائے گا ابراہیم۔ خواہ تم.......... خواہ تم.........." اس نے برق رفتاری سے چھرا اٹھایا اور اپنے پہلو میں بھونک دیا۔ سرخ لہو کی دھاریں دلاور کے پہلو سے پھوٹ نکلیں اور وہ خون آلود مسکراہٹ کے ساتھ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں بولا۔
"مجھے افسوس ہے ابراہیم.......... تمہاری حسرت پوری نہ ہو سکی۔" اس کے منہ سے خون کی پھوار نکل پڑی اور اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر منہ صاف کیا۔
"میرا نام دلاور ہے.......... ابراہیم.......... تم.......... تم.......... تمہیں آج بھی شکست ہوئی.......... بولو.......... ہوئی نا؟"
اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا لیکن ابراہیم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں وہ دم توڑ چکا تھا۔

"ابراہیم.......... ابراہیم۔" اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے لیکن اس کے ہاتھ ابراہیم کے مُردہ جسم تک نہ پہنچ سکے اور وہ بھی ابراہیم کے نزدیک ہی گر پڑا۔ ماحول اس خونی ڈرامے پر لرزہ براندام تھا۔ دور سے تنہا رہ جانے والے گھوڑے کی کھر کھر سنائی دے رہی تھی۔

☆======☆======☆